

ایک تھی نیناں

راحت وفا

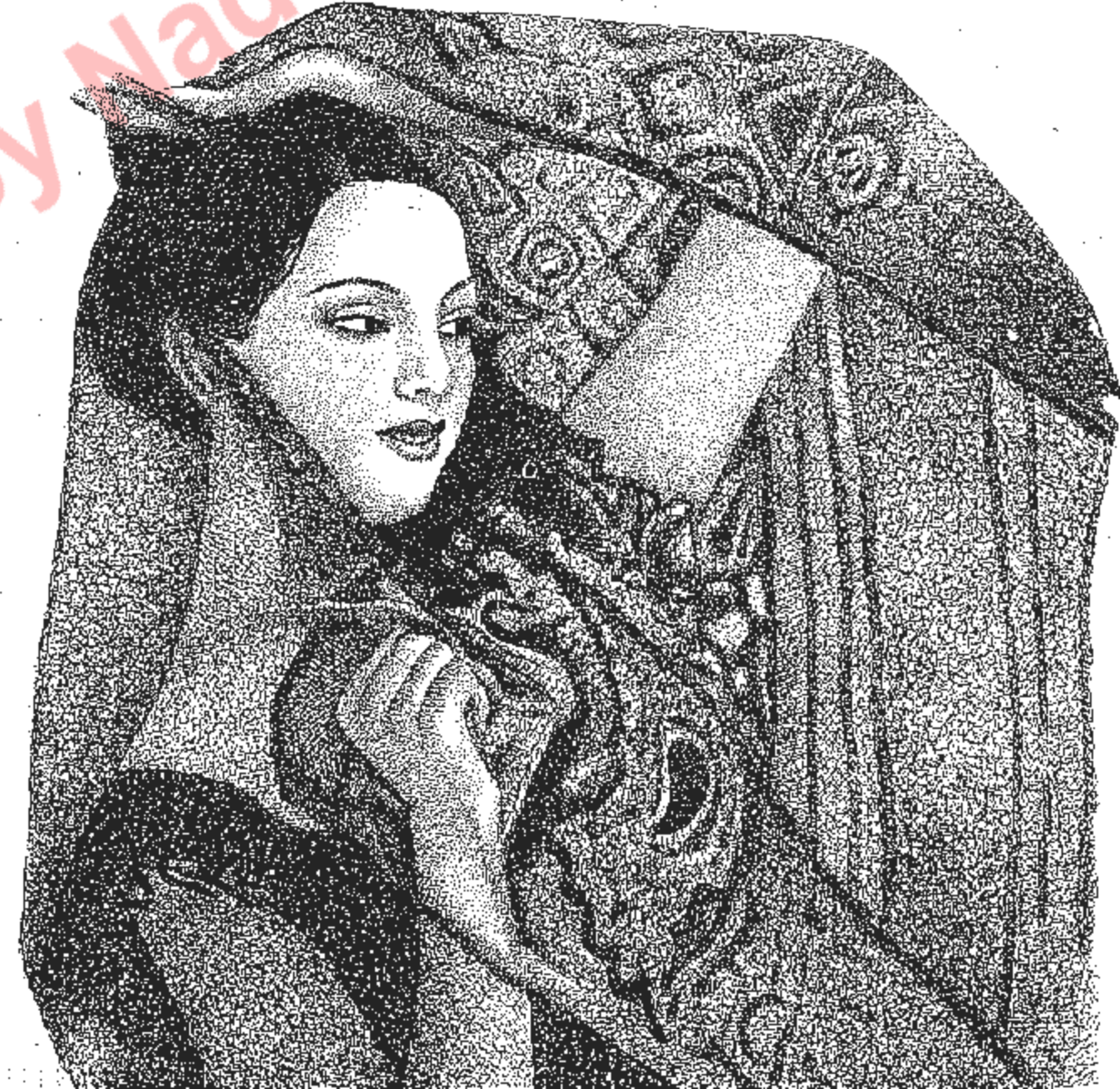
ایک تھی نیناں

راحت و فضا

کچھ کھٹی سی، کچھ میٹھی سی... کبھی شعلہ سی... کبھی شبہ سی...
تھوڑی بھولی سی... تھوڑی نادان سی... محبت، نفرت اور اعتبار کے تکون میں
سرگرداں... رشتوں کے ٹکراؤ اور الجھاؤ کی داستان... جس میں بھول اور
نادانی کی کسبک اور گناہیے لذت کی حقیقت کا اسرار پر قدم پر کچوکے لگاتا ہے۔

ایک نابغہ روزگار، پرتحس، نفسیاتی اور روانوی ناول جو آپ کو اپنے بحر میں جکڑے گا

قسط 1



”اوہ خدایا! مائی اماں کا وزن تو دیکھیں، آپ کی طرح اسماٹ نہیں ہیں۔“
 ”میں کہاں اسماٹ رہ گئی ہوں، پہلے تو بالکل رابی کی طرح تھی۔“ وہ حیرت سے بولیں۔
 ”لیکن رابی اتنی تو اب بہت کمزور ہو گئی ہیں۔“

”ہاں! بس اسے تو کسی کی نظر لگ گئی ہے، دادی کی ہمت ہے جو وہ اسے سنبھالے ہوئے ہیں۔ بس غلط فیصلہ روگ بن گیا۔“ عارفہ بہن کے خیال سے بہت آزرہ ہو گئیں۔
 ”کچھ روز کے لیے یہاں بلا لیں۔“

”نہیں مانتی، بس نیناں کی یارمان کی کچھ سنتی ہے۔“ وہ ٹماٹر کاٹتے ہوئے بولیں۔ اسی اثنا میں طاہرہ کی اپنے مہکن سے دعا کے لیے آواز آئی تو وہ دوڑی..... عارفہ کو اس کے بدحواس ہو کر بھاگنے پر ہنسی آگئی۔ طاہرہ کی آواز پر تو اس کی جان نکل جاتی تھی۔

☆☆☆

پرانے ڈھیر سارے کارڈز میں سے ایک ان کی نگاہوں کے سامنے کھلا تھا، اچھے وقت میں رابعہ نے لکھ کر مسکراتے ہوئے سرخ گلاب کے ساتھ دیا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ اس وقت رابعہ خود ایک کھلا کھلا، مہکا مہکا سا گلاب تھی۔ انہوں نے کارڈ بند کر کے واپس ڈھیر سارے گرد آلود کارڈز کے اوپر رکھ دیا اور الماری بند کر کے ایزی چیئر کی پشت سے سر نکا کر آنکھیں موند لیں۔

”پھر وہی اندھیرا..... سبحان بیٹا! پرانے مٹی کے ڈھیر پر کتنے زمانوں کے بعد شناخت کے پھول ڈالے ہیں تو چراغ بھی روشن کر دیتے۔“ بڑے ابا نے ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی پھیلاتے ہوئے کہا تو وہ شرمندہ سے ہو گئے۔

”شکریہ بڑے ابا۔“

”ہجر و وصال کے لمحات کی یاد تازہ کر رہے تھے۔“ وہ ان کے برابر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔
 ”ہجر ہی ہجر ہے۔“ سبحان ہولے سے بڑبڑائے۔

”ہوں! کیونکہ ہجر کو وصال میں بدلنے کے لیے اس دیے کی صورت ڈھلنا پڑتا ہے جس کے سینے میں احساسِ تفاخر پھڑپھڑاتا ہے جو باقی کو اپنے وجود کے لمس سے گرم کرنے کے لیے بانہیں پھیلا کر تھر تھراتے لیوں سے کہتا ہے۔“ سنو، باقی! تم مجھ میں سما کر روشنی دیتی ہو، تمہاری روشنی میرے وجود کا حصہ ہے میں ہی تمہارا سب کچھ ہوں۔“

”اور اگر باقی پلٹ کر دیے کو یہ کہہ دے کہ ”ارے نادان! یہ کس نے کہا تم سے؟ یہ خوش فہمی کس نے دی تمہیں؟ میں تو خود میں رہ کر روشنی دیتی ہوں۔“ یہ سن کر دیے کے پاس کیا بچے گا؟ اس کے پھیلے بازو سمٹ جائیں گے اور دھڑکتے ارمان پسلیوں کی تہ میں اترتے چلے جائیں گے، بالکل میری طرح۔“ سبحان بہت دور سے گویا بولے تھے۔ بڑے ابا ہمیشہ کی طرح چڑ گئے۔

”پھر زمانوں کے بعد اس کمرے کی تنہائی اور تاریکی میں کیا ڈھونڈتے ہو؟ یہ نہ کہہ سکے کہ میں ہی تو تمہارا گھر ہوں، تم میری آغوش میں سانس لیتی ہو۔“

”جب ایسا اس نے سوچا ہی نہیں تو میں کیسے اسے کہتا، وہ دوست تھی بس..... ویسے بھی بنا چھت کے بھی کوئی گھر ہوتا ہے، کیا دے سکتا تھا میں اسے..... وہ شہزادیوں کی طرح زندگی جینے کی حق دار تھی۔ نہ تیز ہوا سے بچا سکتا تھا اور نہ باقی کو زندہ رکھنے کے لیے تیل کی کمی پوری کر سکتا تھا۔ معمولی سا لکچر تھا میں، وقت کی گرد نے پروفیسر بنایا ہے۔“ وہ تند لہجے میں بولتے بولتے ایک دم پاتال میں اتر گئے۔

”ارے بیٹا! محبت تو جنگی بھر بھی روشنی دے تو چاروں طرف روشنی ہی روشنی پھیل جاتی ہے۔ کاش! تم رابعہ کے دل میں محبت کا احساس پیدا کرتے..... تو یوں شکستہ یادوں کے سرہانے ٹوٹے پھوٹے سے نہ بیٹھتے۔“ بڑے ابا کو ہمیشہ کی طرح ان کی خستہ حالی اور تنہائی پر کڑھنے کا موقع مل گیا۔

”میں شکستہ یادوں کے لیے نہیں، رابعہ کی خستہ حالی پر فکر مند ہوں۔ بڑے ابا! آپ نے تو اسے دیکھا ہے۔ اب وہ پیچانی نہیں جاتی۔ کاش! میں اس حالت میں اسے کبھی نہ دیکھتا۔“
 ”اب کیا فائدہ؟“

”وہ بالکل بدل گئی ہے۔“ وہ تاسف سے بولے تو بڑے ابا پہلی بار چونکے۔
 ”کیا معاملہ ہے؟“

”نہیں معلوم، بس اپنے گھر ہے، شکر ہے کہ دادی حیات ہیں ورنہ۔“
 ”اور اس کا اپنا گھر، بال بچے وغیرہ۔“

”ہوں! ایک بیٹی ہے، گھر جانے کی تو اس کی بات ہی پراسرار سی ہے۔“
 ”تو پوچھ لیتے؟“

”فی الحال مناسب نہیں تھا، پھر جاؤں گا۔“

”اللہ رحم کرے، اب اٹھو ہاتھ دھو کر کھانے کے لیے آ جاؤ، تمہیں پتا ہے نور دین اب بہت بوڑھا ہو چکا ہے، بار بار کھانا گرم کرنا اس کے بس میں نہیں رہا۔“ وہ یہ کہہ کر اٹھے اور آگے آگے چل دیے۔

☆☆☆

رابعہ میکر وینز کی آخری تیاری کے لیے نمک اور کچپ کڑا ہی میں ڈال رہی تھی۔ یوا اور نیناں کی آمد پر وہ بہت بہل جاتی تھی۔ نیناں کو میکر وینز پسند تھیں اس لیے وہ نت نئے انداز میں جب وہ ملنے آتی تو خود اپنے ہاتھوں سے تیار کرتی۔ گھر کے سب ملازم، خانساں خوش ہو جاتے کہ اس بہانے وہ کچھ دیر کو نارمل سی ہو جاتی ہے..... اس وقت بھی نیناں باپ سے اجازت لے کر یوا کے ہمراہ ملنے آئی تھی تو وہ خوش ہو گئی مگر یوا نے کچن میں طلال کی کبھی بات دہرائی تو بہت زخم خوردہ سی ہنسی اس کے لیوں پر چل گئی۔

”یوا! نیناں ٹھیک تو رہتی ہے وہاں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، سبحان کی تو اس میں جان ہے مگر تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔ اس کی خاطر سب بھول جاؤ، آ جاؤ اپنے گھر۔“ یوا نے بہت پیار سے کہا۔

”نہیں، وہ گھر نہیں ہے، وہ تو سبحان اختر کی سلطنت ہے۔ مجھے سبحان سے گھن آتی ہے، میں وہاں سانس نہیں لے سکتی۔“ وہ بولی۔

”اور نیناں، اس محصوم کا قصور کیا ہے؟“ بوانے پوچھا۔

”اسے میرے پاس رہنے دو، پلیز بوا میری نیناں مجھے دے جاؤ، میں اس کے سہارے جی لوں گی۔“ وہ میکرو نیز ڈش آؤٹ کر کے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”یہ ریحان کبھی نہیں ہونے دے گا، وہ نیناں سے بہت محبت کرتا ہے، محبت تو وہ تم سے بھی بے حد کرتا ہے مگر۔۔۔۔۔“

”مگر مجھے نفرت ہے اس سے۔“ وہ چلا اٹھی۔

”رابعہ بیٹا! میں تمہاری ماں نہیں ہوں، اس گھر کی پرانی خادمہ ہوں، صرف سمجھا سکتی ہوں کہ اس خرابی پر کچھ مٹی وقت نے ڈال دی ہے اور کچھ تم ڈال دو۔“ بوانے بہت دھیرے سے کہا۔

”کسی کی کوئی معافی نہیں۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا کہ بوا اور چچی خانے سے قدم باہر نکالے۔

”اپنی نیناں کے لیے بھی نہیں، نیناں کو تمہاری سخت ضرورت ہے۔“ بوانے برابر چلتے ہوئے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”نیناں کو میرے پاس رہنے دو۔“

”رابعہ! نیناں کو ریحان اختر کی زندگی میں تو یہاں کوئی نہیں لاسکتا۔“ وہ دونوں ٹی وی لائونج میں پہنچ چکی تھیں۔ نیناں اور زیتون بیگم کی بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔۔۔۔۔ رابعہ نے نیناں کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ بوا کے ہاتھ میں گرما گرم میکرو نیز کی پلیٹ دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔

”تھینک یو ماما!“

”نیناں! میں میرے پاس رہ جاؤ۔“ اس نے ایک دم کہا تو نیناں زرویی پڑ گئی۔

”پپا نے صرف ایک گھنٹے کی اجازت دی ہے، طلال بھائی آتے ہی ہوں گے۔“

”طلال کو میں کہہ دوں گی۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”نہ۔۔۔۔۔ نہیں، بوا بتائیں ماما کو وہ کتنے برے ہیں؟“ وہ خوف زدہ سی بوا سے بولی۔

”رابعہ بیٹا! پھر کسی دن ریحان سے پوچھ کر کچھ دنوں کے لیے نیناں کو بھجوا دوں گی۔“ بوانے جلدی سے بات سنبھالی۔

”نیناں کی خاطر خود کیوں نہیں جاتیں؟ کیا بات ہے جو رشتوں میں فاصل کھڑی کر رکھی ہے؟“ دادی نے براہ راست رابعہ کو مخاطب کیا۔

”امی ٹھیک کہہ رہی ہیں ماما۔“ نیناں نے فوراً زیتون بیگم کی تائید کی وہ انہیں صرف امی کہتی تھی۔

”سب ٹھیک ہیں، میں ہی غلط ہوں۔ میں غلط ہوں۔“ وہ مشتعل ہو کر وہاں سے چلی گئی۔ سب یکدم افسردہ ہو گئے۔ نیناں نے میکرو نیز کی پلیٹ واپس رکھ دی اور سہم کراچی کی گود میں سر رکھ دیا۔

اسی لمحے گیٹ پر گاڑی کا ہارن بجا تو وہ چونکی۔ یہ طلال کی آمد کا اعلان تھا۔

”طلال آگیا ہے شاید!“ بوانے اٹھتے ہوئے کہا۔

”بوا! میں ماما کو منا کر ابھی آتی ہوں۔“ نیناں جلدی سے رابعہ کے کمرے کی طرف بھاگی۔

”گلو۔۔۔۔۔ گلو!“ زیتون بیگم نے ملازم کو آواز دی۔

”جی!“ وہ جلدی سے آ کر بولا۔

”انٹرکام پر چوکیدار سے کہیں، نیناں بی بی ابھی آتی ہیں۔“ انہوں نے کہا تو گلو فوراً پیروی کے لیے چلا گیا۔۔۔۔۔ مگر چند لمحے بعد ہی واپس آ گیا۔

”طلال صاحب تو چلے گئے۔“

”ہیں۔۔۔۔۔ کیوں؟“ زیتون بیگم اور بوا ایک ساتھ بولیں۔

”وہ اس لیے نانی کہ مابدولت نے انہیں جانے کا حکم دیا اور وہ چلے گئے۔“ گلو کی جگہ رمان احمر نے ٹی وی لائونج میں داخل ہوتے ہوئے مزے سے بتایا اور ان کے گلے میں بازو ڈال کے بیٹھ گیا۔

”اور وہ چلا گیا؟“ زیتون بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

”ہوں! بس کچھ تلملا کر، مل کھا کر چلا گیا۔“ اس نے بھرپور اداکاری کی۔

”لیکن رمان! وہ نیناں کو اور بوا کو لینے آیا تھا۔“ زیتون بیگم نے اس کا کان کھینچتے ہوئے گویا اطلاع دی۔

”تو یہ نیکی رمان احمر کمالیں گے، ہم اور ہماری گاڑی کس دن کام آئے گی؟“

”مگر بیٹا! آپ نہیں سمجھتے، وہ جا کر ریحان کے کان بھرے گا اور وہ بہت ناراض ہوں گے میری بھی شامت آئے گی۔“ بوانے اسے صورت حال سمجھانے کی کوشش کی۔

”کیوں۔۔۔۔۔ کیوں غصے ہوں گے؟ نیناں اپنی ماں سے مل نہیں سکتی، میرا بس چلے تو ایک منٹ میں نیناں کو چین کر رابی خالہ کے حوالے کر دوں۔“ وہ بولا۔

”بس۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔ بس اپنی رابی خالہ کو سمجھاؤ کہ وہ اپنے گھر جا کر رہے بیٹی اور شوہر کے ساتھ۔“ زیتون بیگم نے لٹاڑا۔

”سمجھاتا ہوں مگر کچھ تو ایسا ہے کہ وہ نہیں جانا چاہتیں اور یہ طلال تو مجھے سخت برا لگتا ہے، یہ کون ہوتا ہے نیناں کو لانے لے جانے والا؟“ وہ شدید اشتعال میں آ گیا۔

”ارے لڑکے یہ تم کو کیا ہو گیا ہے، تم کون ہوتے ہو؟ دھونس جمانے والے ذرا یہ تو بتاؤ؟“ زیتون بیگم نے مصنوعی خفگی سے پوچھا۔

”نیناں کے خالہ زاد اور بھی بہت کچھ!“ وہ سرعت سے یہ کہہ کر رابعہ کے کمرے کی طرف بھاگا۔۔۔۔۔ کیونکہ اندازہ تھا زوردار انداز میں کان کے مروڑے جانے کا۔۔۔۔۔ وہ دونوں ہنس دیں۔

☆☆☆

”آپ نے کیوں بھیجا طلال بھائی کو؟“ نیناں پھٹ پڑی۔

”اچھا تو اب مینڈ کی کو بھی زکام ہونے لگا ہے۔“ وہ غرایا۔

”ماما۔۔۔۔۔ ماما یہ سمجھا لیں رمان بھائی کو۔“ وہ مسکراتے ہوئے رابعہ سے بولی۔

”یہ کیا رمان بھائی، طلال بھائی کی رٹ لگا رکھی ہے، بے وقوف صرف طلال کو بھائی رکھو ورنہ کنواری رہ جاؤ گی۔“ وہ اس کے خوب صورت تراشیدہ بالوں کی ایک لٹ انگلی پر لپیٹتے ہوئے بولا۔ تب تو رابعہ کی ہنسی

چھوٹ گئی۔

”آپ کون ہوتے ہیں یہ پوچھنے والے؟“ وہ سچ مچ شیر ہو گئی۔ اس میں بہادری چند منٹوں کے لیے آئی تھی۔

”نیناں! یہ تمہارے کزن ہیں۔“ ریحان اختر نے بتایا۔
”تو انہیں کہیں کہ یہ حد میں رہیں۔“ وہ یہ کہہ کر جانے لگی تو طلال بولا۔
”تم میری حد میں شامل ہو۔“

”ہونہ۔“ وہ گھوم کر فقط کندھا ہی جھٹک سکی۔

”جاؤ جا کر آرام کرو۔“ ریحان اختر نے مزید بات بڑھنے سے پہلے کہا۔ وہ چلی گئی تو وہ طلال سے مخاطب ہوئے۔

”کیا ضرورت ہے اس بات کا احساس دلانے کی جو ابھی اسے ہے ہی نہیں۔ رمان اچھا لڑکا ہے اس کا ذکر اس طرح نہ کیا کرو۔“

”آپ اب ہر صورت مامی کو گھر لائیں، وہ آجائیں گی تو یہ آنا جانا بند ہوگا۔“ طلال نے گھن گرج سے کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔ تب ریحان اختر کو رابعہ کی یاد نے مضطرب کر دیا۔ مٹھیاں بھنچ گئیں، چہرے پر تناؤ سا آ گیا، جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ انہیں ٹوٹ کر یاد آ رہی تھی، زور سے مکامیز پر مار کر اضطراب نکالا۔

”رابعہ! تمہیں محبت کرنا نہیں آتا تو مجھے محبت سکھانے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ زندگی گزارنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک تمہیں سیکھنا ہوگا، تمہیں نہیں آتا ہوگا۔ ریحان اختر کو تمہارے جسم کی تمنا ہی نہیں ہے، عشق ہو تم میرا، تمہاری روح سے عشق ہے اس لیے تمہیں اتنی چھوٹ دے رکھی ہے ورنہ چھین لاتا سب سے..... کیوں مذاق بنا رکھا ہے تم نے خود کو، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ریحان اختر ضد کا نام ہے خود سری کا نام ہے، اگر تم گناہ گار ہو تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا..... تم میری بیوی ہو، میری بیٹی کی ماں ہو، اس کے علاوہ کوئی عمل دخل نہیں ہے تمہارا..... میری نیناں کو ڈسٹرب مت کرو۔“

”ریحان! وہ جو کہتی ہے وہ مان کیوں نہیں لیتے، وہ معاف کر دے گی۔“ بوانے آواز سن کر کہا تو وہ ہوش کی دنیا میں آ گئے۔ دودھ کا گلاس لے کر وہ آئی تھیں۔

”کس بات کی معافی.....؟ کیا قصور ہے میرا؟“ وہ پھر سے گئے۔

”جو رابعہ جان چکی ہے خود سوچو کس لیے وہ گھر سے دور ہو گئی ہے؟“

”وہ پاگل ہو گئی ہے، اس کے پاگل پن کی وجہ معلوم ہے مجھے۔“

”کیا مطلب؟“

”پہلا پیار عورت کبھی نہیں بھولتی۔“ وہ یہ کہہ کر جھٹکے سے اٹھے اور اندر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ بوا کی سماعت جیسے زلزلے کی زد میں آ گئی۔ انہیں طلال کا جملہ یاد آ گیا۔ وہ حد درجہ دکھی ہو گئیں۔ دودھ کا گلاس وہیں چھوڑ کر سیدھی نیناں کے کمرے میں چلی گئیں۔ وہ بیڈ پر جت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی، وہ اس کے سر ہانے بیٹھ کر بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں تو اسے سکون سا ملا فوراً پٹلیں گرائیں مگر بوا کی نیند اڑ گئی..... ریحان اختر نے تو زبان کا بھرم بھی گنوا دیا تھا۔

”ہرگز نہیں چاہئیں مجھے طلال بھائی جیسے بھائی۔“ وہ رو دی۔

”جاؤ جاؤ، ابھی وہ سامنے آ گیا تو من من کرنے لگو گی، ڈر پوک۔“ وہ پھر چڑا کر صوفے پر دراز ہو گیا۔ وہ چلائی۔

”میں ڈر پوک نہیں ہوں، میں کیوں ڈروں؟“

”گڈ! یہی تو میں چاہتا ہوں کہ تم بہادر بنو۔“

”بہادر میں ہوں۔“ وہ کچھ دیر کو رضیہ سلطان بن کر بولی۔

”ہا..... ہا..... ہا! ابھی وہ موچھل سامنے آ جائے تو رابی خالہ کے پیچھے چھپ جاؤ گی۔“

”کون موچھل؟“ غیر دانستہ طور پر منہ سے نکلا۔

”وہی مسٹر طلال صاحب جو مونچھوں پر ہی اتراتے ہیں۔“ وہ شان بے نیازی سے بولا۔

”اچھا، رمان بس کرو میری نیناں کو مت ستاؤ۔“ رابعہ نے پہلی بار اسے ڈانٹا۔

”نیناں، رے نیناں تم ہی برے ہو، تم سے برا نہ ہی کوئی۔“ اس نے لہک لہک کر گانا شروع کر دیا۔ نیناں جل کر وہاں سے باہر چلی گئی۔

”رمان! میری نیناں بہت اچھی ہے۔“ رابعہ نے ممتا سے مغلوب آواز میں کہا۔

وہ سنجیدہ ہو گیا۔

”جی رابی خالہ! بہت اچھی ہے، بہار کا موسم، چودھویں رات کا چاند، گلاب کا پھول، موہیے کی مہک اور جھیل کا کنول۔“ وہ اپنی ترنگ میں آنکھیں بند کر کے بولتا چلا گیا۔ رابعہ کے چہرے پر کچھ سوچ کر خوشی ناچنے لگی اور دل اطمینان سے بھر گیا۔

☆☆☆

کوئی ہزاروں مرتبہ ریحان اختر نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے..... اب تک نیناں اور بوا گھر نہیں پہنچی تھیں دھیرے دھیرے غصہ بڑھ رہا تھا۔ طلال کے اندر بھی لاوا پک رہا تھا مگر وہ چپ تھا جو نہی گیٹ پر گاڑی رکی اور چوکیدار کے گیٹ کھولنے کی آواز آئی تو وہ مطمئن ہوئے مگر طلال نے اسی وقت غصہ نکالا۔

”اب اچھی طرح خبر لیں اور رمان احمر سے دور رہنے کی ہدایت کریں۔“

ریحان اختر نے کافی حد تک وہی کچھ نیناں کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

”طلال کو واپس کیوں بھیجا؟ اور اتنی دیر کہاں لگی؟“

”رمان بھائی نے آئس کریم کھلائی اس لیے کچھ دیر ہو گئی۔“ اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ طلال کو بچھونے ڈنک مار دیا۔

”میں نے کافی پینے کے لیے پرسوں کہا تو صاف انکار کر دیا اور اس کے ساتھ آئس کریم کھانے کو راضی ہو گئیں۔“

رمان احمر کی آفس سے چھٹی تھی۔ عارفہ نے گھر جانا تھا۔ وہ تیار ہو کر باہر آیا تو عارفہ بھی بالکل تیار تھیں۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی چند منٹ کا اسٹارٹ دے کر گیٹ کھولا تو دعا آگئی۔ وہ فوراً اٹھا پیٹ کر بولا۔

”اوہ..... پہلے ہی ملی نے راستہ کاٹ ڈالا۔“

”یہ مجھے کہا ہے؟“ وہ معصومیت سے بولی۔

”جی ہاں اور اب آپ تشریف لے جائیں ہم نانی کی طرف جارہے ہیں۔“ اس نے صاف صاف کہہ دیا۔

”ارے، کیوں بے چاری سے الجھ رہے ہو، دعا نے بھی ہمارے ساتھ جانا ہے۔“ اسی وقت عارفہ آگئیں۔

”کیا..... کیوں؟“ وہ چلایا۔

”کیوں، یہ پوچھنے کی ضرورت؟“ عارفہ نے اسے لتاڑا۔

”امی! طاہرہ پچھو کو تنگی ہوتی ہے، برکت پھوپا تو گاؤں گئے ہوئے ہیں۔“ اس نے اسے روکنے کی آخری کوشش کی۔

”مجھے اماں نے اجازت دی ہے۔“

”کیا مصیبت ہے بھئی؟“ برا سامنہ بنا کر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ گاڑی گیٹ سے باہر نکال کے اس نے خود گیٹ لاک کیا اور واپس پلٹا تو جھنجھلا گیا، دعا اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ عارفہ پیچھے تھیں۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے بڑے پیچھے بیٹھیں اور چھوٹے آگے؟“

”رمان! میں نے چپٹ لگائی ہے اب، چپ چاپ گاڑی چلاؤ۔“ عارفہ نے ڈپٹا تو اس نے ماں کے حکم کے مطابق گاڑی مین روڈ کی طرف موڑ لی۔ پیچھے سے عارفہ بار بار شیشے میں اس کے تیور دیکھتی رہیں۔ دوسری طرف دعا کی بہت بڑے مجرم کی طرح مٹی سبھی بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر دکھ تھا لبوں پر شرمندگی کی سی چپ۔

”دعا!“

”جی مامی؟“ وہ بولی۔

”کیا بات ہے اس قدر چپ کیوں ہو؟“

”کچھ نہیں، بس کچھ سوچ رہی تھی۔“ اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

”اچھا تو دعا قلم کی کھوپڑی میں سوچنے والا دماغ بھی ہے؟“ رمان نے انتہائی معصومیت سے پوچھا۔

”رمان احمر صاحب! آپ سے زیادہ سمجھدار ہوں۔“ وہ تند سے لہجے میں بولی۔

”ظاہر ہے اسی لیے بڑے اونچے درجے کی منصوبہ بندی کر رہی ہو مگر یہ شہباز پھنسنے والا نہیں۔“ وہ بہت شرارت سے اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے اترایا۔

”رمان! انسان ہو ورنہ کچھ بچ پٹ جاؤ گے۔“ پیچھے سے عارفہ نے کہا۔

”امی! یہ کچھ ہے یہ آپ کے رمان پر ڈورے ڈال رہی ہے۔“ وہ کب باز آنے والا تھا۔ عارفہ کو ہنسی آگئی، دعا جھینپ سی گئی۔

”نہیں، ہماری دعا جانتی ہے کہ یہ کام اللہ کے اختیار میں ہے اور پھر بڑے کس لیے ہوتے ہیں۔“ عارفہ نے دانستہ دعا کے ذہن کو کلیئر کرنے کے لیے سلیقے سے کہا۔

”امی! آپ پچھو سے کہیں کہ یہ بی اے کر کے گھر میں بیٹھی ہے تو اس کا بیاہ کر دیں، بلا وجہ عمر نکلی جا رہی ہے۔“ رمان نے شرارت آمیز ٹکڑا لگایا تو وہ بہت خفا سی ہو کر باہر دیکھنے لگی۔ تب رمان نے اس کا سر دہاتھ تھام کر سرگوشی کی۔

”یہی تو خوب صورت رشتوں کا نانا ہے جو بنا کسی شرط کے جیا جاتا ہے۔“ دعا نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا۔ بول وہ کچھ اس لیے نہ سکی کہ ”تیور پلس“ آچکا تھا۔ وہ الجھنا نہیں چاہتی تھی جو نہی گیٹ کھلا گاڑی اندر داخل ہوئی تو وہ سب سے پہلے دروازہ کھول کر باہر نکلی اور عارفہ مامی کی طرف جا کر کھڑی ہو گئی۔ عارفہ نے مسکرا کر نظروں نظروں میں اسے مسکرانے کا اشارہ کیا مگر رمان کب باز آنے والا تھا۔ گاڑی لاک کر کے باہر نکلتے ہی حملہ آور ہوا۔

”جتنی چاہے کوشش کرو، میری امی تم پر لٹو ہونے والی نہیں، ان کا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے۔“ شانِ تقاخر سے اس نے سینہ پھلایا تو دعا کو پتنگے سے لگ گئے۔

”انسان کو اپنی صورت ہمیشہ اچھی لگتی ہے۔“

”ہاں، اب اپنا قد دیکھو، کیا تم سے قلعی کرانی ہے۔“ وہ یہ سرگوشی کر کے تقریباً اندر کی طرف بھاگا۔ عارفہ کو ہنسی آگئی۔ وہ پیر بیٹھتے ہوئے ان کے ساتھ چل دی۔ وہ ہمیشہ اس کے لمبے قد پر چوٹ کرتا تھا۔ پانچ فٹ نو انچ کے قد پر سب اس کی تعریف کرتے تھے مگر وہ تنگ کرتا تھا۔

☆☆☆

رتیون بیگم باہر لان میں بیٹھی ڈرائیور اور گلو کو کچھ سامان لانے کی ہدایات کر رہی تھیں کہ لینڈ کروزر گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ انہوں نے ڈرائیور اور گلو کو جانے کا اشارہ دیا۔ ریحان اختر اسی طرف آگئے۔

”السلام علیکم۔“

”والسلام علیکم بیٹا!“

”دھوپ انجوائے کر رہی ہیں؟“ ریحان اختر نے کین کی خوب صورت موافقہ کر سی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”بس صبح کی دھوپ اچھی لگتی ہے اور سناؤ آج کیسے رستہ بھول گئے؟“

”ایسے تو نہ کہیں دادی جان، ہماری رابعہ بیگم کا میکا ہے ہم کیسے بھول سکتے ہیں؟“ وہ بولے۔

”اچھی بات ہے، رابعہ کو تم ہی سمجھا سکتے ہو، مناسکتے ہو۔“

”رابعہ چاہتی کیا ہے؟“

”یہی تو نہیں بتاتی، خود اعتماد میں لے کر پوچھو، کمالا کے رہ گئی ہے۔“

”ہے کہاں؟“

”اپنے کمرے میں، جاؤ جا کر مل لو۔“

”میں لینے آیا ہوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

”صد شکر! جاؤ بات کرو۔“ زیتون بیگم کے دل کی بات انہوں نے کہہ دی وہ اندر کی طرف چل دیے۔

رابعہ کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ انہوں نے دستک دی کوئی جواب نہیں آیا، دوسری دستک دے کر وہ اندر داخل ہو گئے۔ وہ وارڈروب کھولے کپڑے دیکھ رہی تھی۔

”رابعہ!“ انہوں نے پکارا تو وہ پلٹی۔

”کیا بات ہے؟“ کھر درے لہجے میں پوچھا گیا۔

”کہیں جارہی ہو کیا؟“

”تم سے مطلب!“ الماری بند کر کے جواب دیا۔

”چلو نہیں جا رہیں تو میرے ساتھ چلنے کی تیاری کرو۔“

”یہ حکم دینے آئے ہو؟“

”جو بھی سمجھو..... مگر میں لینے آیا ہوں۔“ وہ برابر کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں تم سے متنفر ہوں۔“

”نفرت کا اظہار میرے قریب رہتے ہوئے بھی کر سکتی ہو۔“ عجیب سا انداز تھا ان کا۔

”مجھے کہیں نہیں جانا، تم میری بیٹی مجھے دے دو بس۔“

”یعنی میں، مرجاؤں؟“

”مارنے والے خود کم ہی مرتے ہیں۔“

”نہ میں نیناں کو دوں گا اور نہ تم یہاں رہ سکتی ہو۔“ وہ ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولے۔

”خدا کے لیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں، اس گھر سے صرف خون کی بو آتی ہے، تم سے کراہیت ہوتی ہے۔“ وہ نفرت سے بولی۔

”مجھے کراہیت کی وجہ معلوم ہے۔ مت کھلو اور میری زبان۔“ وہ بھوکے شیر کی طرح دھاڑے۔

”کھول لو زبان، ہاتھ بھی اٹھاؤ، نوچ ڈالو میرے بال، لہو لہان کر دو مجھے..... پھر بھی وہ حقیقت نہیں بدلے گی جو میں جان چکی ہوں، وہ بھول نہیں سکتی۔“ وہ حد درجہ سیخ پا ہو گئی۔

”مت بھولو، میں کچھ بھولنے کو نہیں کہہ رہا کیونکہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ ہنس کر بولے۔

”تو پھر جاؤ، کیوں آئے ہو؟ میری نیناں مجھے دے دو۔“

”نیناں..... نیناں کیا رٹ لگا رکھی ہے، وہ بیٹی ہے میری کوئی شے نہیں کہ تمہیں بانٹ دوں، میں اس کی صورت کو بھی ترسا دوں گا۔“ وہ گریبے۔

”ریحان اختر! کاش مجھے تمہاری فطرت معلوم ہو جاتی، میں کبھی تمہیں پسند نہیں کرتی۔“ اس نے بے بسی سے اعتراف کیا۔

”پسند تو تم پر و فیسر سبحان کو کرتی تھیں اور کرتی ہو، اس نے اب تک شادی بھی نہیں کی۔“ وہ نظریں ملاتے ہوئے بولے۔

”شٹ اپ! تم بہت گھٹیا سوچ کے مالک ہو۔“

”چلو، مجبوری ہے، تمہیں گھٹیا سوچ والے ریحان اختر کی زوجیت میں ہی رہنا ہے۔“

”جاؤ، ریحان اختر جاؤ۔“ وہ یک دم چلانے لگی۔ ”بھی رمان احمر اندر آ گیا۔“

”راہی خالہ! ریحان انکل!“ وہ حیرت زدہ سا بولا۔

”رمان! پلیز لیوی الون۔“ رابعہ نے کہا۔

”ہاں، آپ جاؤ مجھے اپنی بیوی سے بات کرنی ہے۔“ ریحان اختر نے کہا۔

”مگر راہی خالہ کیوں ڈسٹرب ہیں؟“ رمان نے براہ راست ریحان اختر کو مخاطب کیا۔

”پاگل ہو گئی ہیں آپ کی راہی خالہ۔“ ریحان اختر نے ٹھٹھا اڑایا۔

”فارگا ڈسک! انکل کچھ تو ان کی طبیعت کا خیال کریں۔“ رمان کچھ خفگی سے بولا۔

”رمان بچے! آپ باہر جاؤ، یہ ہمارا ذاتی مسئلہ ہے۔“ اب کی بار ریحان اختر نے کچھ بدتمیزی کا مظاہرہ کیا تو رمان غصے سے باہر نکل گیا۔

”ریحان اختر مت تماشا بناؤ۔“ رابعہ نے کہا۔

”تو پھر چلو۔“

”فی الحال میں نہیں جاسکتی۔“

”ٹھیک ہے، بتاؤ کب آؤں؟“ وہ کچھ سوچ کر نرمی سے بولے۔

”جب میری مرضی ہوگی تب۔“

”رابعہ! آج شام، زیادہ سے زیادہ کل شام تک تمہیں اپنے گھر آنا ہے۔“ وہ یہ فیصلہ سنا کر اس کے بہت قریب آئے اور کھینچ کر اپنے بازوؤں میں بھر کے کچھ دیر اسے بہت تنگ کیا اور پھر باہر نکل گئے۔ وہ تھکلا کر رہ گئی۔

☆☆☆

گرے گرم شلوار سوٹ میں سیاہ چادر کندھوں پر ڈالے گھر سے بہت دور تک سوچتے سوچتے وہ نکل آئے۔ ڈھلتی شام کے سائے روک روک کر مخاطب ہو رہے تھے۔

”رک جاؤ، سبحان ہاشمی! آگے کچھ نہیں ہے آگے جو بھی جا رہے ہیں ان کی منزلیں ہیں وہاں مگر تمہاری تو کوئی منزل نہیں ہے، کیوں خود کو اپنے ہی سہارے گھسیٹے جا رہے ہو؟ انہوں نے جیسے وہ آواز سن لی واپسی کا ارادہ کیا جہاں بڑے ابا اور نور دین بابا کے علاوہ کوئی منتظر نہیں تھا۔ ان کی خاطر لوٹ آئے۔

”یہ زندگی سراب ہے اس کے رہنے یا ختم ہونے کا کبھی پتا نہیں چلتا۔ ابھی زندہ ہو اس کی ضرورتوں کو پورا کرو۔“ بڑے ابا نے ان کے آنے پر بہت سنجیدگی سے کہا۔

”سرمنہ! شام نے سر پر بھیرا کر لیا ہے، کپٹیوں پر سرمی بادل قابض ہو چکے ہیں۔ آپ ضرورتوں کی بات

”کرتے ہیں۔“ صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے جواب دیا۔
 ”سبحان! زندگی کو یوں مت بیزار کرو، اس بار میری مرضی چلے گی۔ وہ اب تک تمہارا راستہ دیکھ رہی ہے۔“

”حالا نکہ آپ سعدیہ کو بہت سمجھ دار سمجھتے ہیں۔“ اس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
 ”سمجھ دار تو وہ ہے، بس چھٹانک بھر دل نے اس کو نا سمجھ بنا رکھا ہے۔“ انہوں نے اپنے دوست عزیز الرحمن کی بیٹی سعدیہ کی وکالت کی۔

”تو چھٹانک بھر دل اپنے اس بھتیجے کے دل میں بھی ہونے کا یقین کر لیں۔“ بہت دھیرے سے کہا۔
 ”تمہارا معاملہ بالکل مختلف ہے لیکن سعدیہ معصوم تو بہت چاہتی ہے تمہیں، اچھے اچھے رشتے ٹھکرائے ہیں اس نے۔“

”بڑے بابا! سعدیہ کو بھی کبھی فلسفہ سنایا کریں، چاہتیں نہ سڑکوں پر بکھری ہوتی ہیں اور نہ کھیتوں میں لہلہاتی ہیں۔“ سعدیہ کو میں سب کہہ چکا ہوں۔“ وہ بیزار سے ہو گئے۔
 ”اچھا یہ بتاؤ، تم رابعہ کے منتظر ہو کیا؟“

”نہیں، میں اس کے لیے صرف فکر مند ہوں۔“
 ”کیا مطلب؟“
 ”کاش! میں اس کے غم دور کر دوں اسے پھر سے ہنستا مسکراتا گلاب بنادوں۔“ وہ جذباتی ہو گئے۔
 ”اور اپنے لیے کیا سوچا ہے؟“

”کیا سوچوں؟“
 ”تو تم شادی نہیں کرو گے؟“
 ”وقت پر جو کام نہ ہو، اسے وقت قضا ہونے پر نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔
 ”نور دین بابا! کھانا تیار ہونے کی اطلاع دینے آئے تو وہ ان سے بولے۔“

”کاش! اللہ پاک دل کے اندر جانے کا باہر سے کوئی رستہ بنا دیتے تاکہ اندر جا کر ہر خانہ دل کی صفائی کر کے نئی چیزیں سجا دیتے۔“ نور دین بابا نے ان کی بات نہیں سمجھی۔
 ☆☆☆

پرائی الہم دیکھتے ہوئے ایک تصویر پر اس کی نظریں ٹپک گئیں۔
 ”بواجی! یہ ویسے پھپھو کی یونیورسٹی کی تصویر لگتی ہے۔“

”ہاں، آخری تصویر یہی ہے ہمارے پاس۔“ بوانے بتایا۔
 ”اور پھر ان کی شادی ہو گئی ہوگی؟“

”ہوں!“ بوانے سرسری سا انداز اختیار کیا۔
 ”ان کی شادی کی بھی تو الہم ہوگی؟“ اس نے استفسار کیا۔
 ”شاید ہوگی۔۔۔۔۔ مگر ہم نے نہیں دیکھی۔“

”طلال بھائی کے پاپا بھی میں نے نہیں دیکھے۔“ یہ سوال اس سے زیادہ کیلا تھا۔ بوانے الہم بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔

”طلال سو سال کا تھا جب ویسے اور اس کے شوہر کار کے حادثے میں مر گئے تھے۔ پولیس نے ویسے کے شناختی کارڈ کے پتے پر طلال کو یہاں پہنچایا تھا تب تمہارے دادا، دادی زندہ تھے۔۔۔ بلکہ طلال کا نام ہی انہوں نے رکھا تھا۔“ بوانے چیدہ چیدہ معلومات اسے دیں مگر وہ ان مختصر معلومات سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔
 ”بواجی آپ شروع سے یہاں ہیں؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں شاید ہمیشہ سے، آپ کی دادی کے ساتھ اس گھر میں قدم رکھے تھے۔“ وہ رنجیدہ سی ہو گئیں۔
 ”اور آپ کے گھر والے، بچے وغیرہ؟“

”تم، طلال میرے بچے ہی تو ہو، تمہارے پاپا ہیں اور کوئی نہیں۔“ وہ جانے کیوں بچھ سی گئیں۔ نیناں نے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔ انہوں نے اس کی پیشانی چومی اور نماز پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔
 ”تم آرام کرو، مغرب کی نماز کا وقت تنگ ہوتا ہے۔“

”مگر ابھی تو عشا کی نماز میں وقت ہے، مغرب کی آپ نے میرے ساتھ پڑھی ہے۔“ نیناں نے تعجب سے کہا وہ کچھ الجھ سی گئیں، باہر چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی طلال آ گیا۔ بنا دستک کے اسے اچھا نہیں لگا۔
 ”نیناں! تیار ہو جاؤ ماموں کا فون آیا ہے کہ ہوٹل سبرینا پہنچو، وہاں انہوں نے دعائی کی پارٹی کو ڈنر دیا ہے۔“

”میرا موڈ نہیں ہے، یہ پیور بزنس میٹنگ ہے، ڈنر نہیں۔“ وہ یہ کہہ کر اپنی نصابی کتابیں میز پر ترتیب سے رکھنے لگی۔
 ”ہم الگ سے بیٹھیں گے، انجوائے کریں گے۔“ اس نے سیاہ ہائی نیک اور بلیک جینز میں ملیوس نیناں کو سر تا پیر دیکھتے ہوئے کہا۔

”سوری! آپ جائیں، انجوائے کریں۔“
 ”تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟ اس کمپنی ملازم کے ساتھ آؤں کریم کھانے چل دیں اور اتنے بڑے ہوٹل کے شان دار ڈنر کے لیے انکار۔“ اس نے ایک کلانی پکڑ کر زور سے دبوچتے ہوئے کہا۔

”طلال بھائی! چھوڑیں میرا ہاتھ۔۔۔۔۔ چھوڑیں۔“ وہ خوف سے پیلی پڑ گئی، آواز گھٹکی سی گئی۔۔۔۔۔ مگر وہ لطف لینے کو بولا۔

”نیناں! تم چڑیا ہو، ایک زوردار آواز پر پھڑ پھڑانے لگتی ہو۔“
 ”آپ بہت برے ہیں جاؤ یہاں سے۔“ وہ روتے روتے بولی۔

”جب تک جانے کی ہامی نہیں بھرو گی، میں یہاں سے جانے والا نہیں۔“ وہ آرام سے کرسی پر بیٹھ گیا۔
 ”میں نے کہا نا کہ میں نہیں جاؤں گی۔“ یک دم اس کے تن مردہ میں جان پڑ گئی۔ طلال کو ہمیشہ حیرت ہوتی تھی کہ وہ کیسے تبدیل ہو جاتی ہے؟

”چیخو، چلاؤ مگر ڈنر کے لیے جانا ہے۔ ایک منٹ میں تیار ہو جاؤ۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”طلال بھائی! آپ مجھے کیوں ستاتے ہیں؟“ وہ بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو لیے سر اپا سوال بنی کھڑی تھی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں داری کی دید کا سماں تھا جواب دینے کا خیال ہی نہیں رہا۔ بس ایک ٹک دیکھے چلا گیا۔

”بولیں، آپ کا میں نے کیا بگاڑا ہے؟“ وہ بے بسی سے پھر بولی۔

”بتا دوں؟“ وہ مخمور لہجے میں بولا۔

”ہونہ۔“ معصوم سا جواب سن کر وہ کرسی سے اٹھا اور اس کے بالکل سامنے آکھڑا ہوا۔

”تمہاری جیسی آنکھوں والے ساحل پر جب آتے ہیں تو لہریں شور مچاتی ہیں کہ لو آج سمندر ڈوب گیا۔ سمجھ لو تلال جیسا سمندر ان آنکھوں میں ڈوب گیا ہے۔“ وہ سر تا پا شراب کا خمیر بن چکا تھا۔..... نیناں پٹ پٹ پٹلیں جھپک رہی تھی مگر وہ پہلی بار اس کے قدموں میں بیٹھا گردن اٹھائے اسے تک رہا تھا۔ وہ بوکھلا کر چار قدم پیچھے ہو گئی تو وہ اٹھا۔

”کبھی خود کو دیکھا ہے تم نے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ اس کے پسینے چھوٹ گئے۔

”آپ، آپ تلال بھائی! پلیز یہاں سے جائیں۔“ ہکلاتے ہوئے کہا۔

”ہزار بار کہا ہے تلال کہا کرو، صرف تلال۔“ اسے شدید غصہ آ گیا تو وہ ڈر کے مارے بھاگتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ تلال نے گھوم کر ڈرائنگ ٹیبل کے پیشے میں خود کو دیکھا، وجاہت میں تو وہ بھی بہت آگے تھا، سرخ و سپید رنگ بھوری بھوری پُرکشش آنکھیں، گھنی بھوری مونچھیں، خوب صورت ہونٹ، دراز قامت کشادہ چھائی، مردانہ وجاہت کا حسین نمونہ تھا وہ خود بھی..... بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے خود پر پیارا آنے لگا مگر پھر نیناں سے کہے ہر لفظ نے دل میں چٹکیاں سی بھریں..... وہ مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔

☆☆☆

عارفہ کو زیتون بیگم نے رات کے لیے روک لیا..... کیونکہ بہن کے اور زمان کے آنے سے رابعہ کا موڈ بہتر تھا۔ اس نے خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا سب کے درمیان بیٹھی رہی۔ عارفہ نے بہت اچھی طرح سمجھایا، ریحان کو ہر طرح سے اچھا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ وہ سب کچھ چپ چاپ سنتی رہی بس بار بار نیناں کی یاد پر پلکیں بھیگی سی جاتیں۔ اس پر بھی عارفہ نے ہنس کر تسلی دی۔ ”پگلی! نیناں باپ کے پاس ہے آخر اسے پرانے گھر بھی بھیجنا ہے۔“ رابعہ سے پہلے رمان نے جواب دیا۔

”امی ہمارا گھر پرایا تو نہیں ہے۔“ عارفہ اور زیتون بیگم نے ایک ساتھ اسے گھورا۔ رابعہ مسکرا دی جبکہ دعا کے چہرے پر پھیکا سا رنگ آ کر گزر گیا۔ رمان، دعا کو گھر چھوڑنے ہی جا رہا تھا کیونکہ طاہرہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے دعا کو بلوایا تھا۔

”جاؤ، باتیں نہ بناؤ۔“ عارفہ نے دعا کی وجہ سے اسے ڈانٹا۔

”رانی خالہ، واپسی پر نیناں کو لے آؤں؟“ رمان نے رابی کے دل کی بات کہہ دی تو رابعہ نے جلدی سے ثبات میں گردن ہلا دی۔

”نہیں، یہ مناسب نہیں بلکہ مناسب وقت نہیں ہے۔“ زیتون بیگم نے کہا۔

”دادی دل چاہ رہا ہے۔“ رابعہ مچلی مگر عارفہ نے بھی نفی میں ووٹ دیا۔

”دادی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“

”ارے امی، کیا ٹھیک ہے کیا غلط اس وقت صرف رابی خالہ کی بات مانی جائے گی۔“ رمان نے صاف لفظوں میں اپنا عندیہ دے دیا۔ اس بات پر دعاسب سے زیادہ ڈس موڈ تھی۔

”رمان احمر! مجھے چھوڑنا ہے یا نہیں؟“

”میں نے تمہیں کب پکڑ کے رکھا ہے۔“ وہ فطری شوخی سے باز نہ آیا۔

”رمان اب جاؤ طاہرہ انتظار کر رہی ہوگی۔“ عارفہ نے تیز آواز میں کہا تب وہ آگے آگے چلا پیچھے دعا چل دی۔ رمان کو اندازہ تھا کہ دعا کا موڈ کس وجہ سے آف ہوا ہے پھر بھی وہ شرارت سے باز نہیں رہ سکا۔

”میں بتا سکتا ہوں تم اس وقت کیا سوچ رہی ہو؟“

”کیا؟“

”کہ نیناں سامنے آجائے اور تم اسے کچا چبا جاؤ۔“

”کیوں.....؟ اس کی جگہ رمان احمر کو نہ چبا جاؤں؟“ وہ حد درجہ غصیلے انداز میں بولی۔

”پھر بھی تمہارے پیٹ میں سے میری آوازیں آئیں گی..... نیناں..... نیناں۔“ وہ اور بھی شریر ہو گیا۔

”تو میں آوازوں کا گلابادوں گی۔“

”اس کا مطلب تم خود کو مار ڈالو گی، میرے لیے تم خود کو ختم کرو گی..... واؤ واٹ آگریٹ۔“ وہ ہنسنے لگا۔ اس کے غصے میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“ وہ زور سے چلائی۔ یہ سن کر اس نے گاڑی کی اسپینڈ سو سے بھی اوپر کر کے کہا۔

”تو پھر دعا کی دیوی چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا کر دکھاؤ۔“

”میں چھلانگ لگا دوں گی، تم مذاق مت سمجھو۔“ اس نے مضبوط قوت ارادی کے ساتھ جواب دیا۔

”اوہ! بھئی باتیں نہیں، عمل..... عمل دعائی بی۔“ اس نے ہوا دی۔ بس پھر کیا تھا، سامنے سے آنے والی گاڑی کی جانب اس نے توجہ کی اور ساتھ ہی دروازہ کھلا تیز ہوا کا جھونکا اندر آیا اور اس نے دیکھا سیٹ خالی تھی۔ وہ کافی پیچھے گری پڑی تھی۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ گاڑی تیزی سے ریورس کی۔ سنسان تاریک سڑک پر کسی ڈھیر کے مانند وہ پڑی تھی۔ اس نے بدحواس ہو کر اسے سیدھا کیا۔

”دعا..... دعا..... اے دعا!“ زور سے چلا چلا کر ہلایا۔ تب درد بھری کرہناک آواز اس کے لبوں سے نکلی۔ اس کے ہاتھ خون سے بھر گئے۔ وہ بہت زیادہ زخمی ہوئی تھی۔ ماتھے سے گھٹنوں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ حد درجہ پریشان ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا مگر دور دور تک کوئی مددگار نہیں تھا۔ بڑی ہمت کر کے اسے بازوؤں میں بھر کے گاڑی کی کچھلی سیٹ پر لٹایا اور جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اسپتال جلد سے جلد پہنچنا ضروری تھا۔

ایمر جنسی میں دعا کا ٹریڈنٹ جاری تھا۔ باقی سب اس سمیت پریشان، فکر مند سے کھڑے دعائیں مانگ رہے تھے۔ طاہرہ بیٹی کے لیے زار و قطار رو رہی تھیں۔ رمان ندامت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ سب کو اس نے ایکسڈنٹ کی خبر دی تھی مگر عارفہ کو حیرت تھی کہ یہ کیسا ایکسڈنٹ ہے کہ رمان اور گاڑی دونوں محفوظ ہیں، زخمی صرف دعا ہوئی ہے۔ وہ اس کے قریب آگئیں۔

”رمان! کیا ہوا ہے؟“ دھیرے سے پوچھا۔
”امی پلیز! یہ سوال دعا سے پوچھیے گا۔“
”کیوں؟“

”اس لیے کہ میرے پاس اس کا جواب نہیں۔“
”یہ کیا بات ہوئی، تمہارے پاس جواب نہیں۔“ عارفہ کو غصہ آگیا۔
”اس لیے کہ بے وقوفی اس نے خود کی ہے۔“ وہ چڑ گیا۔
”کیا مطلب؟“

”پلیز امی! اس سے ٹھیک ہونے پر پوچھ لیجیے گا۔“ اس نے منت کی۔ سب اسی طرف دیکھ رہے تھے اس لیے عارفہ خاموش ہو گئیں۔ البتہ رابعہ کچھ کچھ ہم شناس تھیں وہ اسے ساتھ لے کر باہر پلاٹ میں آگئیں۔
”رمان! جانتے ہو اس عمر کا عشق کتنا خود سر ہوتا ہے۔ اس میں شیطان دیوتا دکھائی دیتا ہے، انسان حیوان نظر آتا ہے۔“ ایک جگہ رک کر سبز گھاس پر بیٹھتے ہوئے وہ بولیں۔

”رانی خالہ! ایسی کوئی کیفیت نہیں ہے میری۔“
”دعا کی تو ہے، وہ تمہارے سائے سے بھی پیار کرتی ہے۔ وہ مجھ سے ملنے آئی تھی مگر بے دھیانی میں بار بار نام تمہارا لیتی رہی۔“

”رانی خالہ! احمق کو سمجھانا مشکل ہے۔۔۔۔۔ حالانکہ وہ جانتی ہے کہ میں۔۔۔۔۔“ وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گیا تب رابعہ نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔
”تم نیناں کو پسند کرتے ہو۔“

”شاید۔“ نظریں جھکا کر وہ اتنا ہی کہہ سکا۔
”شاید نہیں، یقیناً۔۔۔۔۔ محبت کرتے وقت اعتماد کی ضرورت تو سب سے پہلے پڑتی ہے۔“ رابعہ آج کسی اور دنیا سے بول رہی تھیں رمان کو خاصی حیرت سی تھی۔
”مجھے پورا اعتماد ہے اپنی محبت پر۔“

”اور نیناں ہر مرد کو ریحان اختر سمجھتی ہے، یہ بھی جانتے ہونا؟“ رابعہ کا لہجہ بہت کڑوا ہو گیا۔
”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”رمان! نیناں پنجرے میں قید ہے، ریحان اور طلال سے خوف زدہ ہوں میں۔“
”رانی خالہ! آپ وہاں رہ کر نیناں کو بچا سکتی ہیں، آپ کو اس کے پاس ہونا چاہیے۔“ رمان نے موقع غنیمت دیکھ کر سمجھایا۔

”مجھے ریحان سے نفرت ہو چکی ہے۔“

”نیناں کے لیے سوچیں۔“

”اور دعا کے لیے؟“ ایک دم رابعہ کو دعا یاد آگئی۔

”میں اس پاگل لڑکی کو سمجھاؤں گا۔ بس وہ ٹھیک ہو جائے۔“

”ویسے ہوا کیا تھا؟“ رابعہ کو یاد آیا۔

”یہ تو دعا نے بتانا ہے۔“ وہ پھر ٹال گیا۔

”مجھ سے بھی بھول ہو گئی تھی، بتانے میں دیر ہو گئی تھی شاید۔“ وہ کسی اور طرف سوچ کے جنگل میں بھٹک گئیں۔ انھیں اور اندر اسپتال کے ایمر جنسی یونٹ کی طرف چلنے لگیں۔ رمان بھی ان کے پیچھے کچھ سوچتا ہوا آگیا۔

☆☆☆

دعا کو چوبیس گھنٹے کے بعد ایمر جنسی وارڈ سے روم میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس کے سر پر چوٹ آئی تھی، پورے جسم پر رگڑیں پڑی تھیں۔ وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھی۔ طاہرہ رو رہی تھیں، عارفہ شرمساری انہیں تسلی دے رہی تھیں۔ آج رابعہ اور زیتون بیگم نہیں آئی تھیں کیونکہ رابعہ کو موسم کی تبدیلی کے باعث بخار ہو گیا تھا۔ رمان آفس بھی نہیں گیا اور اسپتال بھی نہیں۔۔۔۔۔ عارفہ کو اس کی فکر بھی لاحق تھی۔ کچھ سوچ کر وہ کمرے سے باہر نکلیں اور موبائل سے اس کو فون کیا۔۔۔۔۔ مگر اس نے اٹینڈ نہیں کیا۔ وہ بار بار ملاتی رہیں لیکن ناکامی ہوئی کچھ پریشان سی واپس اندر آئیں تو طاہرہ نے کہا۔

”رمان کہاں ہے؟“

”وہ نہیں معلوم۔“ وہ ہچکچائیں۔

”عارفہ بھابی! حیرت کی بات ہے کہ ایکسڈنٹ میں صرف دعا ہی متاثر ہوئی۔“ طاہرہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”دیکھو طاہرہ! رمان سے میں بھی یہ سوال پوچھنا چاہتی ہوں مگر دعا کے سامنے۔۔۔۔۔ میں اس کے ہوش میں آنے کی منتظر ہوں۔“ عارفہ نے پوری سنجیدگی سے کہا اور خاموش ہو گئیں۔
”میری بچی کو اللہ نے نئی زندگی دی ہے۔“ طاہرہ پر پھر رقت طاری ہو گئی۔

”شکر ہے پروردگار کا، دعا میری بھی بیٹی ہے، طاہرہ مجھے معاف کر دو، میں دعا کو ساتھ لے کر گئی تھی۔“ عارفہ نے بہت شرمندگی سے سر جھکایا تو طاہرہ نے جلدی سے ان کے ہاتھ تھام لیے، برکت اللہ بھی ندامت سے بولے۔

”بھابی! کوئی غلطی نہیں ہے کسی کی بس چوٹ لگنی ہو تو لگ کر رہتی ہے۔“

”تاہم، غفلت تو میری ہے۔“

”بس! اب اللہ کا شکر ادا کریں، بچی خطرے سے باہر ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ کسی بھی وقت ہوش میں آجائے گی۔“ طاہرہ نے خوش ہو کر بتایا۔

آؤں۔“ عارفہ نے کہا۔
”کیسے جائیں گی؟“ طاہرہ نے پوچھا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

”ہم دونوں چلے جاتے ہیں، آپ یہاں دعا کے پاس ٹھہریں۔“ برکت اللہ نے اپنے طاہرہ کے حوالے سے کہا جو مناسب فیصلہ لگا۔ موٹر سائیکل پر وہ دونوں جاسکتے تھے۔ طاہرہ نے چادر کندھوں پر پھیلائی اور برکت اللہ کے ہمراہ چلی گئیں۔ عارفہ کرسی کی پشت سے سر نکال کے بیٹھ گئیں۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ دعا کے لب پھڑپھڑائے۔

”.....رمان۔“

”دعا! دعا بیٹی!“ عارفہ تیزی سے اس پر جھک گئیں۔

”مامی! مامی!.....رمان۔“ وہ کافی صاف بولی۔

”مامی صدقے، رمان تو باہر ہے۔“

”مامی! وہ، میں نے کیا ہے، رمان کیوں نہیں ہے؟“ وہ چڑچڑی سی ہو کر بولی۔

”دعا! یہ سب کیسے ہوا؟“ عارفہ کو جلدی سے انکوائری کرنے کا خیال آیا۔

”رمان کو بلا..... بلا میں۔“ بڑی دقت کے ساتھ کہا۔ عارفہ ملول سی ہو کر بولیں۔

”رمان تو شاید ندامت کے باعث کہیں چھپا بیٹھا ہے۔“

”ک..... کیوں نہیں ہے؟“

”یہ سب رمان نے کیا ہے؟“

”مامی! میں نے اس..... اس کے لیے کیا ہے؟“ وہ کافی سنبھل چکی تھی۔ عارفہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پوچھنا تھا مگر وہ دوبارہ آنکھیں موند چکی تھی۔ انہوں نے طویل سرد آہ بھر کے پھر سے فون ملایا مگر فون بند تھا۔ وہ اور زیادہ پریشان ہو گئیں۔ پریشانی میں دادی سے بات کرنی چاہی تو انہوں نے بتایا کہ وہ یہاں سویا ہوا ہے۔ عارفہ کو کچھ تسلی ہوئی اور کچھ پریشانی کہ رمان اتنا بے حس تو نہیں ہے پھر کیا معاملہ ہے؟ وہ تو چڑیا کے بچے کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ یہ بات وہ کافی دیر سوچتی رہیں..... مگر کوئی سراہا تھا نہیں آیا۔

☆☆☆

ڈرائیور نے ریحان صاحب کا بیگ اٹھایا اور گاڑی لگنے کی اطلاع دی۔ ریحان نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بوا سے نیناں کے بارے میں پوچھا۔

”نیناں سو رہی ہے۔“ بوا نے مختصر جواب دیا۔

”اب تک سو رہی ہے، اس نے کالج نہیں جانا کیا؟“ ریحان سے پہلے طلال نے ٹانگ اڑائی۔

”وہ جاگ کب رہی ہے، اسے تو ہم نے سلا رکھا ہے۔“ بوا نے جو نہی کہا تو ریحان اختر کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی زبان پر کائنات کیوں نکل آتے ہیں؟“

”میاں! پھول نہ رہیں تو کائنات ہی دکھائی دیتے ہیں۔“ بوا بولیں۔

”ماموں! آپ نے بوا سے آپ جناب کر کے سر پر چڑھا رکھا ہے۔“ طلال نے انتہائی بدتمیزی سے کہا۔
”ہم نے انہیں ملازم سمجھا مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ رابعہ اور نیناں کو سپورٹ کرتی ہیں۔“ ریحان اختر نے طلال کو بتاتے ہوئے بوا کو مخاطب کیا۔

”ریحان میاں! ہماری حیثیت کیا ہے یہ تو اب ہمیں بھی یاد نہیں رہی لیکن یہ بھی کم نہیں کہ عافیت کی خاطر کان اور زبان بند کر رکھے ہیں۔“

”بوا! نیناں کو رابعہ کے نقش قدم پر چلنے سے روکیں، رابعہ کی بے جا ضد اور ہٹ دھرمی کو تو میں بھگت رہا ہوں مگر نیناں میری بیٹی ہے۔“ ریحان اختر کی زبان سے بیٹی کے لیے رس ٹپکنے لگا تھا۔ بوا طنز یہ ہنسی کے ساتھ بولیں۔

”جانتی ہوں بیٹیاں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ رابعہ کو سمجھنے کی کوشش کرو، وہ پہلے تو ایسی نہیں تھی، تم سے محبت کرتی تھی اور نیناں کیوں تم سے دور بھاگتی ہے اس پر غور کرو۔“

”مردوں کے ساتھ رہنا عورت کی ضرورت ہے، ان کے جھمیلوں میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ شدید مشتعل ہو کر اٹھے۔

”بوا جا کر نیناں کو جگاؤ، مجھے اسے کالج چھوڑنا ہے۔“ طلال نے دوبارہ وہی بات کی جس پر اتنی بحث ہوئی۔ بوا اس کی فطرت سے واقف تھیں..... چڑ کر بولیں۔

”طلال بیٹا! نیناں آپ کے ساتھ کالج نہیں جانا چاہتی۔“

”کیوں؟“ ریحان اختر گر بجے۔

”بس گھبراتی ہے، خوف زدہ ہی ہو جاتی ہے۔“ بوا نے کہا اور ناشتے کے برتن سمیٹنے لگیں۔

”میں جن بھوت ہوں؟“ طلال کو غصہ آ گیا۔

”آپ خود جا کر بات کرو، مجھے دیر ہو رہی ہے میننگ ہے۔“ ریحان اختر نے ایک بار پھر رسٹ واپس پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئے۔ طلال نے فاخرانہ انداز میں بوا کو دیکھا اور شاہانہ چال چلتے ہوئے چلا گیا۔ اس کا رخ نیناں کے کمرے کی طرف تھا، بوا کو اندازہ تھا کہ نیناں پریشان ہو جائے گی اور طلال اسے ہراساں کرے گا۔ یہ سوچ کر وہ خود بھی پیچھے ہی چلی آئیں۔

طلال نے خلاف معمول دروازے پر دستک دی تھی کہ بوا پہنچ گئیں۔

”طلال! مجھے پوچھ لینے دو، وہ تم سے بہت گھبراتی ہے۔“ بوا کی بات پر اس نے کان نہیں دھرے اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ نیناں کمرے میں نہیں تھی۔ اس کے کمرے کے دائیں ہاتھ چھوٹا سا میسر تھا وہ وہاں نصابی کتابیں لیے بیٹھی تھی۔

”نیناں! وہ وہیں سر پر پہنچ گیا۔“

”یہ کیا بدتمیزی ہے؟“

”کون سی بدتمیزی؟“ بوا کو دیکھ کر اس میں ہمت آ گئی تو اسی کے انداز میں پوچھا۔

”امی! میری غلطی ہے لیکن دعا کو خود بھی کچھ سمجھنا چاہیے۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔
 ”تو سمجھانے کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ آپ اسے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگانے کا کہہ دیں۔“ زیتون بیگم نے بھی رمان کو سرزنش کی۔

”یہ کہا تھا، وہ ایسا نہ کرتی۔“
 ”تو بہ ہے، کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ عارفہ کو حیرت ہوئی۔
 ”پاگل ہو گیا ہوں، پتھر ماریں سب مجھے۔“
 ”چلو اب چھوڑو اس قصے کو اللہ نے رحم کر دیا۔“ زیتون بیگم نے عارفہ کو مزید تکرار سے روکا۔
 ”اس احمق لڑکی نے بنا سوچے سمجھے بات مان لی، آخر کیوں؟“ عارفہ کی سوئی وہیں انکی ہوئی تھی۔
 ”یہ کبھی عمر ایسی ہی قیامت خیز ہوتی ہے، رمان کے لیے مناسب فیصلہ کرو۔“ زیتون بیگم جہاں دیدہ خاتون تھیں۔ رمان نے پلکیں جھکا لیں۔ عارفہ سوچ میں پڑ گئیں۔
 ”میں نیناں کو لینے جا رہا ہوں، رابی خالہ نے کہا ہے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”اور اب وہاں کی ٹھان لی۔“ عارفہ نے پوچھا۔
 ”رابی خالہ کو بخار ہے، وہ نیناں کو مس کر رہی ہیں۔ میں نے ریمان انکل سے فون پر ریکوریسٹ کی ہے۔“
 ”خدا کے لیے! اس سے نہ کوئی شرارت کر بیٹھنا۔“ عارفہ نے کہا تو وہ معصومیت سے ماں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”اب بھلا بھینس کے سامنے بھی کوئی بین بجا سکتا ہے۔“
 ”شریر! اسے بالکل تنگ مت کرنا، چڑیا جیسا دل ہے اس کا۔“ زیتون بیگم نے ہنستے ہوئے تاکید کی۔
 ”بچے جھاڑ کے لڑتی ہے آپ کو چڑیا جیسے دل والی لگتی ہے۔“
 ”رمان! رابی کی خاطر نیناں کو مت ستایا کرو۔“

”ایک تو ہر آدمی حضرت ناصح بنا ہوا ہے، نیناں نہ ہوئی چھوٹی موٹی ہو گئی، اسے بہادر بننے دیں ورنہ وہ موچیل اسے چٹ کر جائے گا۔“
 ”آف میرے اللہ! عارفہ نے ہاتھ باندھ دیے تب وہ ہنستا ہوا باہر چلا گیا مگر عارفہ اور زیتون بیگم کو سوچ بچار کا محاذ دے گیا۔

”رمان کی نظروں کا اشارہ سمجھو۔“ زیتون بیگم نے کہا۔
 ”دادی! سمجھ سے باہر ہے..... سنجیدہ ہو تو کچھ سوچوں۔“ عارفہ تذبذب کا شکار تھیں۔ دعا والے واقعے نے انہیں مزید ہلا کے رکھ دیا تھا۔ دعا میں کوئی خرابی نہیں تھی انہیں اس کی طرف سے سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ دعا، رمان کو پسند کرتی ہے جبکہ نیناں میں ہر طرح کی صفت موجود تھی، وہ سگی بہن کی بیٹی تھی، سب سے بڑھ کر یہ رمان کا جھکاؤ اس کی طرف تھا۔ بس تشویش کی بات اتنی تھی کہ جس گھر میں رابی خوش نہیں رہی تھی ایک طرح سے نفسیاتی مریض بن گئی تھی، وہاں سے رشتہ جوڑنا کیا مناسب ہوگا؟ وہ بھی طلال کی موجودگی میں..... ریمان اختر کی نظر میں جو طلال کی حیثیت ہو سکتی ہے وہ رمان کی ہرگز نہیں ہو سکتی۔

”کالج کیوں نہیں جاتا؟“
 ”کالج جانا ہے مگر آپ کے ساتھ نہیں جاتا۔“
 ”اچھا، تو میں تمہیں کھا جاؤں گا یا اغوا کر کے لے جاؤں گا؟“ وہ خاصی بدتمیزی سے بولا۔
 ”طلال بھائی! ایسی باتیں مت کریں۔“ وہ کپکپا اٹھی مگر آواز میں مضبوطی چٹانوں جیسی تھی۔
 ”چڑیا! تم تو شیر بنی جا رہی ہو، اچھی بات ہے۔“ وہ ہنسا۔ وہ خوف زدہ سی ہو کر کمرے میں آ گئی۔
 ”طلال بھائی! پلکیز آپ جائیں۔“
 ”طلال! آج تو کالج کا وقت گزر گیا ہے۔“ بوانے مداخلت کی۔

”نہیں گزرا اور آپ جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔“ وہ براہ راست بوا سے مخاطب ہوا، وہ چلی گئیں۔
 ”کیوں ڈرتی ہو مجھ سے، میں تو تمہیں اپنی زندگی سمجھتا ہوں۔“ وہ بہت مدہم سے لہجے میں بولا اور محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”پلکیز! مت کریں فضول باتیں۔“ وہ یک دم چلائی۔
 ”یہ ایک دم تمہیں کیا ہو جاتا ہے؟ مامی جیسی بن جاتی ہو۔“
 ”میری ماما پاگل نہیں ہیں۔“
 ”حرکتیں تو ان کی ایسی ہی ہیں۔“

”طلال بھائی!“ وہ پوری قوت سے چلائی اور بیڈ کی سائنڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھا کر اسے مارنے کی کوشش کی تو وہ دنگ رہ گیا..... جھپٹ کر اس کی طرف بڑھا اور اس کی کلائی تھام کر بولا۔
 ”چڑیا! تم بہت نازک ہو، کالج کی گڑیا جیسی..... کلائی میں بل آ جاتا تو؟“ دھیرے سے کلائی چھوڑ کر دور ہو گیا۔

”آپ کو اس سے کیا؟“ وہ رو پڑی۔
 ”نیناں! مجھے ہی تو سب کچھ ہے۔“ وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔
 ”بوا..... بوا!“ وہ آوازیں دیتے ہوئے کمرے سے بھاگ نکلی۔ پیچھے سے وہ پکارتا ہی رہ گیا مگر اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔

☆☆☆
 ”ہاں..... ہاں میں نے کہا تھا دعا کو مگر وہ محض مذاق تھا اور کچھ نہیں!“ عارفہ کے سوالات سے تنگ آ کر وہ چلا اٹھا۔
 ”عارفہ تخیل سے!“ زیتون بیگم نے تنبیہ کی۔

”آپ خود سوچیں دادی جان، دعا کو کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا؟ ایسا مذاق بھی کرتے ہیں کیا؟“ عارفہ نے زیتون بیگم سے ہی تائید چاہی۔
 ”وہ دودھ پیتی بچی نہیں ہے، نہ کرتی ایسا کام۔“
 ”اس کو کہتے ہیں الٹا چور کو تو ال کو ڈانٹے۔“ عارفہ سر پیٹ کر رہ گئیں۔

”کیا سوچنے لگیں؟“
 ”کچھ نہیں، فی الحال آپ رابی کو گھر بھیجیں، نیناں تو منجھار میں پھنسی ہے۔“ عارفہ نے دل کی بات کی۔
 ”مجھے بھی اندازہ ہے کہ رمان، نیناں میں دلچسپی لیتا ہے..... لیکن رابی کی اضطرابی کیفیت نے پریشان کر رکھا ہے۔“ زیتون بیگم نے اپنے دل کی بات کہی۔

”کہتی کیا ہے؟“
 ”جانے ریحان نے کیا، کیا ہے کہ شدید نفرت کا اظہار کرتی ہے، کتنی بار ریحان آچکا ہے۔ اب کیا کیا جائے.....؟“

”آپ وجہ جاننے کی کوشش کریں۔“
 ”نہیں بتاتی۔ بس اندر ہی اندر گھل رہی ہے۔“

”آپ ریحان سے پوچھ لیں۔“ عارفہ نے مشورہ دیا۔
 ”وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کے درمیان بس کوئی تنازعہ چل رہا ہے، وہ لے جانے آتا ہے۔“ زیتون بیگم نے بتایا۔

”لیکن وجہ کوئی ہے ضرور، اس کو تلاش کریں، حالت دیکھیں رابی کی..... رمان بہت طیش میں آتا ہے، رابی سے اس کو بہت انسیت ہے۔“

”اس بار ریحان آئے گا تو میں بات کرتی ہوں۔“ زیتون بیگم نے فیصلہ کن جواب دیا۔ اندر سے گلو نے فون آنے کی اطلاع دی تو وہ اندر چلی گئیں۔ عارفہ نے رابعہ کے کمرے کا رخ کیا۔

☆☆☆

”رابعہ! میں نے صبح بتایا تھا کہ رات کریم خان کے بیٹے کی سالگرہ میں جانا ہے اور تم اس حلیے میں بیٹھی ہو۔“ ریحان اختر نے کمرے میں داخل ہو کر رابعہ کے کمرے میں آکر کہا۔

”ریحان! اتنے دنوں میں بھی یہ نہیں سمجھ سکے کہ میں اس گھر میں ہوں، تمہارے کمرے میں نہیں۔“ رابعہ نے بڑی متانت سے جواب دیا۔

”میرے پاس بیکار باتیں سننے کا وقت نہیں، اٹھ کر دس منٹ میں تیار ہو جاؤ۔“ ریحان اختر نے تحکم سے کہا۔

”مجھے تمہارے ساتھ کھڑے ہونا پسند نہیں، تم ساتھ چلنے کی بات کرتے ہو۔“ اس کے طنزیہ لہجے کی کاٹ پر وہ تلملائے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھا کر گرے۔

”کریم خان میرا کلائنٹ ہے، وہاں ہم تینوں کو جانا ہے، سنا تم نے۔“
 ”نہیں، میں اور نیناں کچھ نہیں لگتے تمہارے، جاؤ جا کر بتاؤ سب کو کہ تم قاتل ہو بیوی کے اعتماد اور اعتبار کے..... منافق ہو۔“ یہ کہہ کر زوردار پھٹ کر باوجود وہ ہنسنے لگی۔ نیناں دوڑ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔

”ٹھیک ہے مرو..... مگر نیناں جائے گی اور طلال جائے گا۔“ وہ بہت زہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے..... دروازے سے چسکی نیناں دوڑ کر آنسو بہاتی رابعہ سے لپٹ گئی۔ ماں کے آنسو دیکھ کر

اس کی اپنی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
 ”نیناں! تم نہیں جاؤ گی کہیں میری نظروں سے دور۔“ اس کو بازوؤں میں چھپاتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی اور نیناں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ماں کی کوکھ میں کہیں جا چھپے..... تھر تھر کانپتی وہ اس کی پسلیوں میں گھسی جا رہی تھی۔

”مما! پاپا بہت گندے ہو گئے ہیں۔“
 ”مت فکر کرو، ہم یہاں نہیں رہیں گے..... ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“ وہ اسے تسلیاں دے رہی تھی۔

”مما، پاپا کو کیا ہوا ہے؟“
 ”مت نام لو، گھٹیا شخص کا کاش اصلیت پہلے میں جان لیتی۔“ وہ چلائی۔

”نیناں..... نیناں!“ طلال کی آواز پر وہ چھلانگ مار کے رابعہ کے بستر سے اتری اور کمرے سے باہر نکلنے لگی مگر وہ کمرے میں روشنی دیکھ کر اندر ہی آ گیا۔ وہ ہونٹ چبانے لگی۔ بھول گئی کہ کچھ دیر پہلے پاپا نے فون پر کسی تقریب میں جانے کا کہا تھا۔ رابعہ کے کمرے میں آکر وہ سب بھول گئی تھی..... سچ یا دلوں نے گھیر لیا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ اس کی سوالیہ نظروں کا مطلب بھانپ کر وہ بولی۔
 ”ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ ماموں ریڈی ہیں، میں بالکل تیار ہوں۔“
 ”مجھے کہیں نہیں جانا۔“

”کیا؟ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی پاگل ہو جاتی ہو۔“
 ”شٹ اپ! پھر میری ماما کے لیے یہ لفظ استعمال کیا۔“ وہ زور سے چیخی۔

”اچھا، اچھا چلو جلدی سے تیار ہو کر باہر آؤ، انہیں تمہارا ذرا سا خیال نہیں اور تم اس کمرے میں گھسی رہتی ہو۔“ وہ یہ کہہ کر تیزی سے چلا گیا۔ وہ باہر غصے سے آئی مگر لاؤنج میں پاپا کے پاس رمان کو دیکھ کر ضبط کر گئی۔ طلال کے چہرے پر تناؤ سا آ گیا۔

”نیناں! آپ کی ماما کو بخار ہے جا کر مل لو، کل ان کے ساتھ واپس آنا۔“ ریحان اختر نے کہا تو وہ خوش ہو گئی۔

”تھینک یو پاپا۔“
 ”ماموں! یہ کیا بات ہوئی؟“

”میں نے رمان سے وعدہ کیا تھا۔“ ریحان اختر یہ کہہ کر باہر نکلے اور ساتھ طلال کو بھی آنے کا اشارہ کیا..... مگر طلال سے ضبط نہ ہو سکا۔

”اے مسٹر! آج آخری بار نیناں کو لے جا رہے ہو، ذہن میں رکھنا۔“
 ”اوکے! اب نیناں کو واپس نہیں بھیجیں گے۔“ رمان نے شرارت سے کہا۔
 ”اوقات میں رہو۔“

”آپ بھول رہے ہو کہ انکل کیا کہہ کر گئے ہیں۔“ رمان نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ باہر سے

گاڑی کا ہارن سن کر طلال پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا اور بوا خوش ہو کر چائے بنا لائیں۔
 ”ارے ہونٹ لڑکی تم جاؤ جلدی سے تیار ہو کر آؤ۔“ چائے کا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے نیناں کو کہا تو وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”مجھے نہیں جانا آپ کے ساتھ۔“
 ”ہیں..... ہیں، مجھے موچھل نہ سمجھنا، میں تو اٹھا کر لے جاؤں گا۔“ رمان نے اکڑ کر کہا۔
 ”سب مرد ایک جیسے ہیں، مجھے نہیں جانا بوا۔“ وہ بوا سے چپک گئی۔
 ”میں فی الحال عارضی بنیاد پر لے جا رہا ہوں مستقل نہیں بن کر رہے۔“ رمان نے اور ٹکڑا لگایا، بوا کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

”ارے رمان بیٹا! کیوں میری نیناں کو ستا رہے ہو، اسے جلدی سے اس کی ماما کے پاس لے جاؤ۔“ بوا نے وکالت کی تو وہ جانے کے لیے راضی ہو گئی۔ جلدی سے اپنے کمرے میں گئی اور دس منٹ میں تیار ہو کر آگئی۔ سی گرین کرتے کے ساتھ بلیک جینز اس پر سج رہی تھیں۔ آنکھوں میں اسے جذب کرتے ہوئے وہ آگے آگے چل دیا۔

☆☆☆

اسپتال سے گھر آنے کے بعد ہر وقت چپکنے والی دعا محض ایک دعا بن کے رہ گئی تھی۔ زخم بھرنے میں وقت لگنا تھا۔ دوائیں مسلسل استعمال کرنی تھیں۔ عارفہ نے اصرار کر کے اسے اپنے گھر اور اپنے کمرے میں رکھا تھا۔ اس کی ہر ممکن دلجوئی کرتیں۔ یحییٰ، جوس، گرم دودھ، اودھن، فروٹ اور وہ سب جو اسے پسند تھا۔ طاہرہ کو موٹاپے کے باعث جوڑوں کا درد رہتا تھا اس لیے وہ بخوشی راضی ہو گئی تھیں کہ دعا عارفہ کے پاس رہے۔ دن بھر تو دونوں ہی اس کے پاس رہتیں لیکن شام کو برکت اللہ کے کام سے واپس آنے پر طاہرہ چلی جاتیں۔ دعا کو گھر آئے تیسرا دن تھا مگر رمان نے پلٹ کر بھی نہیں پوچھا تھا۔ وہ کمرے کی چھت گھورتے گھورتے صرف اسی کے بارے میں سوچتی رہتی۔ اتفاق سے صبح آفس جانے سے پہلے وہ کسی چیز کی تلاش میں عارفہ کے کمرے میں آیا تو ٹھٹکا۔ دراصل وہ اس سے خود کنارہ کیے ہوئے تھا مگر آکر رکنا پڑا اور بات بھی کرنی پڑی۔
 ”سوری دعا!“ احساس شرمندگی سے فقط اتنا کہا، وہ چپ رہی۔
 ”مجھے معاف کر دو، میں نے تمہیں بہت بڑے امتحان میں ڈالا۔“ وہ اس کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھنے

ہوئے بولا۔

”یہ بتاؤ امتحان کا نتیجہ کیا نکلا؟“ اچانک بالکل غیر متوقع سوال پر وہ چونکا۔

”کہا تو ہے شرمندہ ہوں۔“ اس نے ٹالا۔

”رمان! کیا اور بھی امتحان باقی ہے۔“ بڑے شکست خوردہ لہجے میں پوچھا گیا۔

”امتحان تو قبر کی تاریک گہرائی میں بھی دینا پڑتا ہے۔“ ٹالنے والا انداز..... وہ اداس ہو گئی۔

”یعنی میرا مزید امتحان ہوگا۔“

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“ اسے پوچھنا پڑا۔

”رمان! اگر تم جان مانگتے تو میں وہ بھی دے دیتی۔“

”کیوں، پاگل ہوں میں، پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال لیتا۔“ اس نے ہنسی میں بات اڑائی۔

”رمان! اب تو یقین کر لو۔“ وہ تقریباً رو دی۔

”دیکھو دعا! میں ایسی باتوں کی یقین دہانی نہ کرتا ہوں نہ کراتا ہوں۔ ہم بہت مختار بھی مگر ہم کسی نہ کسی کے محتاج ہوتے ہیں اور محتاج اس لیے ہوتے ہیں کہ ہم ان کے مشتاق ہوتے ہیں۔ یہ مداخلت کا سلسلہ نہیں ہوتا بلکہ مماثلت کا رشتہ ہوتا ہے۔“ اس نے کافی تفصیل سے کچھ سمجھایا تو وہ زرد پڑ گئی۔
 ”میں کیا سمجھوں؟“

”فی الحال کچھ نہ سمجھو، آرام کرو پھر بات کریں گے۔“ وہ یکسر اسے افسردگی کی فضا سے نکالنے کی خاطر مسکرا کر بولا۔

”مجھے معلوم ہے رمان، میں نیناں نہیں ہوں۔“

”ہاں، ٹھیک کہا تم نے، تم نیناں نہیں ہو، تم دعا ہو صرف دعا۔“ اس نے کمال سمجھ داری سے اس کو سمجھایا اور امی کی الماری کھول کر کچھ الٹ پلٹ کرنے لگا۔

”رمان!“ اس نے پکارا۔

”ہوں..... بولو۔“ وہ اپنے کام میں مگن بولا۔

”دعا، نیناں نہیں بن سکتی، تم مجھے دعا ہی سمجھو۔“ وہ کچھ سے کچھ کہہ گئی۔ رمان کو ہنسی آگئی۔

”دعا! تمہارے دماغ پر نیناں کیوں طاری ہے؟“

”نیناں تمہارے دماغ پر طاری ہے۔“ اس نے سوال کو ہی جواب بنا دیا۔

”اتنا مت سوچو، الجھتی جاؤ گی۔“ وہ توقف کے بعد بولا۔

”تو بتا دو نا! وہ چڑسی گئی۔“

”کیا مصیبت ہے، اسی لیے میں تمہیں گھاس نہیں ڈالتا۔“ وہ مصنوعی غصے سے سخت لہجے میں بولا۔

”ہاں..... ہاں مت ڈالو، میں نے کب کچھ کہا ہے۔“

”خدا یا! دعا فاطمہ، ایک بات یاد رکھنا محبت اور ہوتی ہے عقیدت اور ہوتی ہے۔ محبت کے پھول دلوں میں کھلتے ہیں انہیں گملوں میں نہیں ڈھونڈتے۔“ وہ یہ کہہ کر واپس چلا گیا اور وہ دکھی من کے ساتھ اس کے لیے سوچتی رہ گئی۔

☆☆☆

گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے لیفٹ سائڈ کا انڈیکیٹر دے کر وہ بنا اسے دیکھ بولا۔ ”اگر پریشان یا اداس ہو تو واپس چھوڑ سکتا ہوں۔“

”آپ کو کیوں لگ رہا ہے کہ میں اداس ہوں؟“ وہ پزل سی تھی۔

”اپنی حالت دیکھو، یہ ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں؟“ اس نے برابر بیٹھی نیناں کا سیدھا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ غیر متوقع حرکت پر وہ گھور کر بولی۔

باہر موسم دیکھیں، لکسا ہے ایسی بارش ہونے والی ہے۔“ بے تکی سی بات کر کے ہاتھ چھڑا کر وہ خود میں سمٹ سی گئی۔ وہ باہر غور سے دیکھ کر ہنسنے لگا۔

”بارش کوئی ہیبت ناک چیز ہے یا ہم پیدل جا رہے ہیں۔“

”مجھے بارش اچھی نہیں لگتی۔“ وہ ہٹکائی۔

”حالانکہ بارش کے موسم میں عجیب سی کشش ہوتی ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی وہ شدت سے اچھا لگتا ہے جو۔“ وہ ہونٹوں میں بات دبا کر بولا۔

”جو کون؟“ وہ مزید سیٹ پر سمٹ سی گئی۔

”جو گاڑی کی سیٹ اور دروازے کے درمیان پھنسنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ وہ جھلا کر بولا تو وہ چونکی۔

”اچھا آپ آرام سے گاڑی چلائیں۔“ ایک دم ہی اس میں کوئی ہمت کے ساتھ بولا۔

”یار نیناں! یہ تمہاری آواز تھی یا کبھی کبھی کوئی جن دن تمہارے اندر آ جاتا ہے؟“ اس نے انتہائی سادگی سے پوچھا۔

”کمال ہے، بہت بولتے ہیں آپ۔“

”ہاں! کمال تو ہے، کسی ادھ مغز سے ٹکریں مارنا، ہمارا ہی کمال ہے۔“ وہ بھولپن سے دیکھنے لگا تو وہ الجھ سی گئی۔

”میں ادھ مغز ہوں؟“

”سو فیصد، دیکھو نا، تمہاری جگہ دعا فاطمہ ہوتی یا کوئی اور لڑکی ہوتی تو کھسکتے ہوئے میرے قریب آ جاتی۔“

وہ شرارت سے بولا۔

”کیا... آپ ایسے ہیں؟ ایسا سوچتے ہیں؟“ وہ پریشان ہو کر سچ سچ دروازے سے چپک گئی۔

”نہیں، میں بالکل ایسا نہیں ہوں، تو بہ تو بہ کیا سوچنے لگی ہو؟ دراصل میری پرسنلٹی ہی ایسی ہے ہر لڑکی ایسا سوچنے لگتی ہے۔“ وہ اپنے خوب صورت بالوں میں بڑے اسٹائل سے ہاتھ کی انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

”آپ بالکل غلط سوچ رہے ہیں، میں ایسا کچھ نہیں سوچتی، مجھے ویسے بھی مرد اچھے نہیں لگتے۔“ وہ اپنی ترنگ میں کہہ گئی تو اس کے پاؤں کا دباؤ ایک دم بریک پر آ گیا۔ گاڑی ایک آواز کرتی جھٹکے سے رک گئی، وہ اچھل کر ڈش بورڈ سے ٹکرائی۔

”کیا کہہ رہی تھیں نیناں جی؟“ اس کی طرف دیکھتے ہوئے معصوم صورت بنا کر پوچھا۔

”کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں، پلیز مجھے میری ماما کے پاس لے چلیں۔“

”اوکے! لیکن کیا سب مرد برے لگتے ہیں۔“ اس کی حالت پر رحم کھاتے ہوئے دوبارہ گاڑی کو اسپید دیتے ہوئے بولا۔

”ہاں شاید۔“

”پہلے یقین کر لو پھر بتا دینا۔“

”میرے پاپا، طلال بھائی، بس سب برے ہیں۔“ وہ بولتی چلی گئی۔

”نہیں یار! یہ ہمارا خیال ہوتا ہے، کتنے اچھے تو ہیں تمہارے پاپا۔“

”آپ نہیں جانتے اس لیے، میری ماما پھر ایسی کیوں ہیں؟“

”ہاں، یہ غور طلب بات ہے لیکن تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارے پاپا کی لومیرج ہے۔“ گھر کے قریب پہنچنے پر اس نے آخری جملہ کہا۔ چونکہ دار نے گیٹ کھول دیا تھا گاڑی اندر داخل ہوئی۔ وہ یہ جملہ ذہن میں لے کر گاڑی سے باہر نکلی اور ماں سے ملنے کی خوشی میں بھاگتے ہوئے اندر چلی گئی۔ رمان کچھ دیر وہیں کھڑا رہ کر اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔

”نیناں! تم بھی خوب صورت سا اسرار اور حسین سا اصرار ہو۔“ یہ سوچ کر لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

وہ ماں سے ایسے لپٹی ہوئی تھی جیسے برسوں کی چھڑی ہو۔ عارفہ اور زیتون بیگم کو ہنستی مسکراتی رابعہ اس وقت بہت اچھی لگی۔۔۔۔۔ نیناں کے چہرے سے اپنا چہرہ لگائے وہ بہت خوش تھی۔

”نیناں! تم ماما سے ملنے روز آیا کرو، کتنی خوش ہے رابعہ۔“ عارفہ نے نیناں کو مخاطب کیا۔

”بڑی خالہ! پاپا اور طلال بھائی نہیں آنے دیتے۔“ وہ عارفہ کو جواب دینے کے لیے ذرا سا اٹھی۔

”واہ اریحان..... اور یہ طلال کو کیا مصیبت ہے؟“ عارفہ نے طلال کا ذکر خاصی سختی سے کیا۔

”وہ ریحان اختر کالا ڈالا بھانجا ہے۔“ رابعہ کو ایک دم غصہ آ گیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر نیناں پر تم سے ملنے جلنے کی سختی کیوں کرتا ہے؟“ عارفہ کو تسلیم کرنے اور لہجہ کو نارمل رکھنے میں خاصی محنت کرنا پڑی۔

”وہ کوئی علیحدہ سے ٹھوڑی ڈنڈا اٹھاتا ہے، ریحان جیسا چاہتا ہے ویسا ہی کرتا ہے۔“ زیتون بیگم ہمیشہ صلح پسندی کا پہلو سامنے رکھتی تھیں۔

”دادی! میری تو سمجھ سے باہر ہیں ریحان اور رابعہ۔“ عارفہ نے اکتا کر کہا۔

”ریحان قابل ذکر ہے کیوں.....؟ مت اس کا نام لیا کریں۔“ رابعہ تقریباً چلا اٹھیں۔

”رابی! بچوں جیسی باتیں کرتی ہو، پڑھی لکھی سمجھدار ہو، نیناں کے بارے میں سوچو، بچی بکھر کر رہ گئی ہے۔“ زیتون بیگم نے خاصے دلدار سے سمجھایا۔

”بس ہو گئی غلطی، مگر وہ انسان سے مجھے اب کوئی دلچسپی نہیں، میں زندہ صرف اپنی بیٹی کے لیے ہوں۔“

وہ محبت سے نیناں کو بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے بولیں۔

”ماما! آپ کی اور پاپا کی لومیرج تھی؟“ اچانک نیناں نے آنکھیں اٹھا کر اس سے وہ سوال کر ڈالا۔

جورمان نے اس کے دماغ میں ڈالا تھا۔ عارفہ اور زیتون بیگم نے گڑ بڑا کر ایک... دوسرے کو دیکھا لیکن رابعہ کے لبوں پر تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی، آنکھوں سے اضطراب دکھائی دینے لگا۔

”ہاں! میں نے یہ جرم کیا ہے۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو..... ہم نے کی تھی یہ شادی۔“ زیتون بیگم کو اچھا نہیں لگا کہ نیناں سے اس قسم کی بات کی جائے۔

”دادی! آپ کے یہ بہنے سے ستادی معتبر ہو سکتی ہے پر ریحان اسر نہیں۔ وہ آنکھوں میں آنی سی لو تھیلی سے صاف کر کے بولیں۔“

”عارفہ! تم بہن کو سمجھاؤ، میں ذرا خانساں کو دیکھوں جانے کیا کیا پکایا ہے؟“ زیتون بیگم یہ کہہ کر اٹھیں مگر عارفہ کے کچھ کہنے سننے سے پہلے رمان وہیں آ گیا۔ اسے ہیڈ آفس سے بہاول نگر کا وزٹ کرنے کا آرڈر ملا تھا۔

”امی! اٹھیں ہمیں گھر چلنا ہے، کچھ پیکنگ وغیرہ دیکھنی ہے۔“

”بغیر کھانا کھائے کوئی کہیں نہیں جا رہا، باتوں میں پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔“ زیتون بیگم یہ کہہ کر باہر نکل گئیں۔

”بڑی خالہ آپ نہ جائیں۔“ نیناں نے فرمائش کی۔

”خالہ صدمے، یہ رمان انتہائی بے پروا ہے نہ ناشتا کرے گا اور نہ ڈھنگ سے پیکنگ کرے گا۔“ عارفہ

نے بہت پیار سے جواب دیا۔

”رابی خالہ آپ کل چلی جائیں گی۔“ رمان نے پوچھا۔

”ہاں ہم چلے جائیں گے ورنہ.....“ نیناں جلدی سے بولتے ہوئے رک گئی۔

”ورنہ وہ موچپل آ کر نیناں کو ہڑپ کر جائے گا۔“ رمان نے باقاعدہ نقل اتاری۔

”کسی کی مجال کہ میری نیناں کو میلی آنکھ سے بھی دیکھے۔“ رابعہ کو جوش آ گیا۔

”جس طرح آپ کی نیناں منمناتی ہے اس پر تو کوئی بھی مرد اسے ہڑپ کر سکتا ہے۔“ رمان نے چڑانے کے لیے کہا تو نیناں کو غصہ آ گیا۔

”اور اسی لیے مجھے مردوں سے نفرت ہے۔“ نیناں کے وجود سے ہی گویا شعلے نکلنے لگے۔

”ایسے نہیں کہتے نیناں۔“ عارفہ نے خاصی سنجیدہ سی نرمی اختیار کی۔

”جس نے ریحان جیسا باپ دیکھا ہے وہ یہی کہہ سکتی ہے۔“ رابعہ نے کہا۔

”کچھ دیر کے لیے مان بھی لیں کہ ریحان میں خرابیاں ہیں تو وہ چھپا کیوں رکھی ہیں، بتاؤ۔“ عارفہ کو ہمیشہ رابعہ کے اس طرح کے بیانات پر اشتعال آ جاتا تھا۔ وہ ذاتی تجربے کے ناظر میں اتنا ہی جانتی تھیں کہ ریحان ہر لحاظ سے اچھے ہیں۔

”ہونہہ! وہ میرے اندر ہی دفن رہیں تو بہتر ہیں۔“ رابعہ نے بہت حقارت سے جواب دیا۔

”چھوڑیں امی، آپ نے تو رابی خالہ کو پریشان کر دیا ہے۔“ رمان نے جلدی سے موقع کی نزاکت کو سمجھ کر بات ٹالنے کی کوشش کی۔

”بہر کیف! نیناں کی خاطر اپنے گھر جاؤ، معاملات سلجھانے کی کوشش کرو۔“ عارفہ نے بڑی بہن ہونے کے ناتے سمجھایا..... رابعہ خاموش رہی۔

”رابی خالہ! میں ٹور سے واپس آتے ہی آپ کو ملنے آؤں گا۔“ رمان نے بہت پیار سے رابعہ کے کندھوں پر مضبوط ہاتھوں کا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ رابعہ کے لبوں پر پھکی سی مسکراہٹ لمحے بھر کو آئی اور غائب

ہو گئی۔

”چلو جی چلو خانہ (کھانا) تیار ہے، میری بیوی مرحومہ (مرحومہ) کہتی تھی کہ خانے کو انتظار نہیں خراتے (کراتے) یگلو نے اپنے مخصوص انداز میں اچانک سے انٹری دی۔ وہ جگہ بے جگہ رخ کا استعمال کرتا تھا اور ہر موقع پر بیوی مرحومہ کی کہی بات ضرور دہراتا تھا۔

”اچھا جی! اگلو بابا! آپ کی بیوی استانی تھیں یا وکیل؟“ رمان نے ہمیشہ کی طرح چھیڑا۔

”وہ جیتی (کہتی) تھی کہ ہر انسان استاد ہوتا ہے۔“ مزید موقع ملا تو یہ کہا۔

”بس بس ہمیں رخ کی زبان نہیں سیکھنی۔“ عارفہ نے ہنستے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے اور گلو شرمندگی سے خود بھی ہنستا ہوا چلا گیا۔

”چلو اٹھو رابعہ، نیناں کھانا کھائیں۔“ عارفہ نے ان دونوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

دن بھر کی مسلسل مصروفیت میں روزانہ ہی وہ بری طرح تھک جاتی تھیں مگر آج زیادہ برا حال تھا تھکن سے چور تھیں تو بستر پر لیٹتے ہی ایک کریناک سی آہ لبوں سے نکلی..... اور محسوس ہوا کہ ہڈیاں چٹخیں اور جیسے سماعت بھر میں جان بوڑھی کمزور پسلیوں کے ٹپکتے کھڑکھڑاتے دروازوں کو توڑ کر نکل جائے گی..... ورد نے آنکھوں کے رستے اپنے ہونے کا احساس پیدا کیا تو بے اختیار ہی انہیں اپنے ماں باپ یاد آ گئے۔

”اللہ کے مہمانو! دیکھ سکو تو آ کر دیکھو، بڑھاپے میں تمہاری سکھاں پر تنہائی کس طرح گزرتی ہے..... اپنے آنگن سے جس کو خوشبو کے موسم میں تم نے نکالا تھا اب نا تو اس ہو کر درد کو برداشت کرتی ہے۔ یہ بڑھاپے کی فصل اکیلے کا ثنا کتنا مشکل ہے، جوڑ جوڑ تھک گیا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔“ آنکھوں سے بہتے آنسوؤں میں رحمت کا چہرہ پکپکایا تو بہت سے دردناک زمانے یاد آ گئے۔

پہلی بار ہوش میں دادی کے مرنے کی اطلاع پر گاؤں گئی تھی، خان جی کی جیب میں ڈرائیور کے ساتھ، بہار بیگم صاحبہ کی ہدایت کے ساتھ جنازے کے فوراً بعد واپس آ جانا، شام سے پہلے پہلے..... بچپن سے جوانی میں داخل ہونے والی سکھاں سب کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اماں فیضیاں نے اپنی ہم جولی کی موت پر آنسو بہاتے ہوئے چونک کر ماں سے پوچھا۔

”شادو! یہ سکھاں ہے، یہ تو بہت سوئی نکلی ہے۔ میری نسیم کے کا کے رحمت کو دینا اسے، سن لیا کن کھول کے؟“ شادو نے بنا سوچے سمجھے گردن ہلا دی۔ تب پہلی بار کا کے رحمت کے احساس سے اس کی بے خواب آنکھوں میں جگنو سے چمکے، ایک دم ہی دل چاہنے لگا کہ گھر کے باہر کھڑے ڈرائیور کو انکار کر دے اور کہہ دے کہ اب کہیں نہیں جانا مگر بے بے شادو نے جانے اس کے ہلنے سے پہلے ہی گھٹنا دبا کر منع کر دیا۔

جنازے کا وقت ہوا، سب مرد اندر آ گئے، کچے چھوٹے سے گھر میں چھوٹے سے صحن میں چار چھ مردوں کے بعد کسی کی گنجائش نہیں تھی لیکن اماں فیضیاں نے ایسے میں گھس گھس کر دروازے سے باہر جھانکا اور اپنے کا کے رحمت کو اندر بلا لیا۔ اماں کی بغل میں گھسی سکھاں نے اسے دیکھنے کی پوری کوشش کی مگر بہت سی عورتوں کے سامنے آ جانے کی وجہ سے وہ صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکی۔ سفید شلوار قمیص میں اونچے لمبے قد والا، گندی

رحمت والا رحمت ہی تھا۔ سب باہر ملے مگر رحمت اس نے دے دی۔ وہ اماں فیض کی لگا ہوں گا مرنے لگی۔ گوری جی دراز قد، معصوم بھولی صورت والی، کئی بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار اماں نے توجہ بانٹ لی۔

عصر سے ذرا پہلے میت دفن کر سب آ گئے۔ ابا دادا اس سا آ کر صحن میں بیٹھ گیا اور چند قریبی رشتے دار آ کر بیٹھ گئے مگر رحمت نہیں آیا۔۔۔۔۔ تاجا حشمت کے گھر سے روٹی آئی، سب دال روٹی کی لذت میں کھو گئے۔۔۔۔۔ اماں نے ابا کے کہنے پر اسے کمرے میں لے جا کر کہا۔

”سکھاں! اب تو جا، ڈرائیو بار بار کہہ چکا ہے، بیگم صاحبہ غصے ہوں گی۔“

”مگر اماں؟“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔

”تو بیگم صاحبہ کا شکریہ ادا کرنا کہ انہوں نے مہربانی کی۔“

”کیسی مہربانی؟“ وہ بڑبڑائی۔

”یہاں بھیج کر، وہ ہماری طرح فارغ تھوڑی ہیں، کام کاج سے تنگ ہو رہے ہوں گے۔“ اماں نے مالکوں کی شان بیان کی۔

”اماں! میری دادی کا مرنا؟“ وہ گھبرا سی گئی۔

”تو کیا ہو گیا؟ مرنے کی عمر تھی، اب وقت ضائع نہ کر اور ہاں اب چادر اوڑھ کر نکل جاؤ۔“ اماں نے دادی کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ وہ چپ چاپ باہر نکلی اور جیب میں بیٹھ گئی۔ دادی کے غم میں یا ماں کی بے بسی پر موٹے موٹے آنسو آنکھوں سے نکلے اور چادر میں جذب ہو گئے۔ ڈیڑھ سو کلومیٹر جیب کے پچھلے شیشے سے رحمت بھاگتا ہوا دیکھتے سفر گزر گیا۔ نہ کہیں جیب رکی اور نہ ہی رحمت جیب تک پہنچ سکا اور چاہتے ہوئے بھی وہ خود چادر کی بکلی سے منہ نکال کر اسے آواز نہ دے سکی۔ یہ نہیں کہہ سکی کہ تیری دادی کی پسند ہوں، اس نے تیرے لیے مجھے مانگا ہے۔۔۔۔۔ مجھے جیب سے اتار کر مجھے اپنے ساتھ لے چل کیونکہ سکھاں نے پہلی نگاہ سے تجھے پسند کیا ہے۔ مجھے یہیں رہنا ہے۔۔۔۔۔ اپنوں کے ساتھ۔

☆☆☆

”خان محل“ کے درو بام پر ان دنوں خوشیاں مچ رہی تھیں۔ خان ارباب خان کی اکلوتی بیٹی ڈاکٹر جبین کی شادی کی تیاری آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔۔۔۔۔ خان ارباب نے تجوری کا منہ کھول دیا تھا بہار بیگم کو فرصت نہیں تھی کہ کیا خریدیں اور کیا نہیں۔۔۔۔۔ بس ایک پاؤں مارکیٹ میں تھا اور دوسرا گھر میں، ڈاکٹر جبین کی پسند کے مطابق ہر شے خریدی جا رہی تھی مگر کوئی ایسی بات ضرور تھی جس کی کمی پر مہ جبین کے خوب صورت چہرے پر اداسی سی تھی۔ اس کی اداسی دیکھ کر سکھاں دادی کا غم اور رحمت سے نہ ملنے کی اداسی بھول گئی۔

”بی بی! کیا بات ہے؟“ بیڈ کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھ لیا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ ٹال گئی۔

”پھر بھی، کچھ تو ہے۔“

”سکھاں! مرے بابا کو مری خوشی کا خیال نہیں۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”راجا صاحب آپ کو پسند نہیں کیا؟“ مٹھی سی اڑان نے سفر کیا تو وہ ہنس دی۔

”یہ بات نہیں سکھاں! مجھے پڑھایا لکھایا، ڈاکٹر بنایا، اپنے خاندان سے الگ ہو کر مجھے پالا پوسا، اب میں اپنے علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچانا چاہتی ہوں تو میری شادی کر رہے ہیں۔ مجھے اسپتال بنا کر دے سکتے ہیں لیکن نہیں سنی میری بات۔“

”بی بی! خان صاحب کے بعد یہ بات آپ راجا صاحب سے منوالینا، وہ تو ویسے بھی بہت امیر ہیں، آپ کے بابا کی طرح بھی نہیں ہیں۔“ سکھاں کو ڈاکٹر بی بی کی صحبت نے خاصا بقراط بنا دیا تھا۔

”راجا صاحب، بابا کے دوست کے بیٹے ہیں وہ بھی بابا کی مرضی کے خلاف کہاں جائیں گے؟“

”کوئی ضروری تو نہیں، آپ پریشان نہ ہوں جو کچھ آپ کو جہیز میں دے رہے ہیں، اس میں اسپتال بنالینا۔“ سکھاں نے پوری کوشش کی کہ اپنی جیتی بی بی کو خوش کر سکے مگر وہ بہت آزرده سی ہی رہی۔

”تو نے راجا صاحب کو ٹھیک سے دیکھا ہے؟“ مہ جبین نے پوچھا۔

”جب آپ امریکا میں تھیں تب روز ہی خان جی کے پاس آتے تھے۔“ سکھاں نے بتایا۔

”اچھا۔“ مختصراً کہا گیا۔

”ویسے بہت اچھے ہیں اُچے، لمبے رحمت کی طرح۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے خاص انداز میں نکل گیا تو مہ جبین چونکی۔

”سکھاں! یہ رحمت کون ہے؟“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ اماں فیض کے بیٹے نسیم کا بیٹا۔“ سادگی سے ہکا کر پوری تفصیل دی۔

”اچھا! اچھا لمبی کہانی نہیں، تو نے اس کا ذکر پہلی بار کیا ہے۔“ مہ جبین نے کریدا۔

”آٹھ دس سال بعد گاؤں گئی تھی، پہلے ذکر کہاں سے کرتی؟“

”اس کا مطلب ہے تو نے پہلی بار ہی دیکھا ہے۔“ مہ جبین نے کہا۔

”ہوں!“ شرمناک اثبات میں گردن ہلا دی۔

”اور کیا بات ہوئی؟“

”اماں نے رہنے ہی نہیں دیا، جلدی جلدی نکال دیا۔“ وہ ٹھکی۔

”تجھے آنا برا لگا۔“

”ہاں۔“ معصومیت سے کہا۔

”پھر تو دیکھنا پڑے گا، میں بہانے سے تمہیں واپس بھیج دوں۔“ مہ جبین نے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”نہیں جی۔۔۔۔۔ پھر کبھی سہی، ابھی تو آپ کی شادی سر پر آ گئی ہے۔“ وہ ٹال گئی۔

”چلو بعد میں سہی۔“

”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔“ وہ اس فیصلے پر خوش ہو گئی۔۔۔۔۔ کیونکہ مہ جبین بی بی کو وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ جو کہتی ہیں وہی کر کے دکھاتی ہیں۔ اس آسے پر وہ ہر وقت ہر گھڑی رحمت کو یاد کرنے لگی۔

فجر کی نماز پڑھتے ہی عارفہ نے رمان کے کمرے پر دستک دی۔ وہ شاید واش روم میں تھا۔۔۔۔۔ پانی گرنے کی آواز پر وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئیں جب کہ دعا موقع کی تلاش میں تھی۔ ہلکے سے دروازے پر دستک دی مگر دروازہ نہیں کھلا۔۔۔۔۔ چھٹری کے سہارے زخموں کے ساتھ کھڑا ہونا محال تھا بڑی مشکل سے واپس اپنے کمرے تک آگئی۔ رمان نے دروازہ کھول کر پشت سے اسے دیکھ لیا تھا۔

”بگلی! بستر سے اٹھ نہیں سکتی۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا پیچھے چلا آیا۔

”یا گل لڑکی! تمہیں اپنے کمرے میں اپنے بستر پر سکون نہیں ہے کوئی اور مصیبت کھڑی کرو گی، اپنی حالت دیکھو زخم زخم ہو۔“ وہ برستا چلا گیا مگر وہ صرف چپ چاپ گھورتی رہی۔

”اب ایسے کیا گھور رہی ہو، صبح بدشگونی ہوگئی۔ اب سفر کیسا ہوگا؟“ اس نے حسبِ عادت چھیڑا تو وہ ٹپاٹپ روتے لگی۔

”ارے، ارے، چپ کرو، میں نے کیا کہا ہے۔“ وہ قدموں کی آہٹ محسوس کر کے گڑبڑایا اور بولا۔

”مجھے زخمی چھوڑ کر اتنا وقت گھر سے غائب رہے۔“ وہ روتے روتے شکوہ کر بیٹھی۔

”یہ کیسا بیوی نما سوال ہے بھئی؟“ وہ ڈانٹ کر مصنوعی انداز میں بولا۔

”میں تمہاری وجہ سے موت کے منہ میں جاتے جاتے بچی اور تم اپنی نیناں کے ساتھ مگن رہے۔“

”ہائے! کیا یاد دلا دیا، میری نیناں!“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے فرطِ محبت سے چور چور ہو کر چپکا تو دعا کو بہت غصہ آیا۔

”نکل جاؤ، جاؤ یہاں سے۔“ وہ پوری قوت سے چلائی۔ عارفہ آواز سن کر وہیں آگئیں۔ رمان کو وہاں دیکھ کر چونکیں۔۔۔۔۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ کمرے میں تھا۔

”رمان! تمہیں دیر ہو رہی ہے اور دعا کو کیوں ستارہ ہو؟“ انہوں نے اس کے چیخنے اور رونے کا جائزہ لیا۔

”امی! دعا کو ستانے کا شوق ہے بلا وجہ مجھ سے الجھتی ہے۔“ وہ غصہ ہوتے ہوئے باہر نکل گیا۔ عارفہ بھی پیچھے ہی آگئیں، اسے ناشتے کے لیے آوازیں دیتی رہیں مگر وہ انہیں بھی ستانے سے باز نہ آیا۔ دھیرے دھیرے اندر ہی اندر مسکراتا رہا اور بریف کیس میں اپنے کاغذات وغیرہ رکھتا رہا۔

”رمان! مجھے جی بھر کے ستاؤ، فرقان کی جدائی کے بعد میں نے کیسے پالا پوسا ہے اس کا یہی صلہ ہے کہ خوب تنگ کرو۔“ عارفہ نے شوہر کا ذکر کر کے جذباتی طور پر ضرب لگائی تو وہ بھاگ کر ان سے لپٹ گیا۔ اور ان کو محبت سے چومنے لگا۔

”میری پیاری امی، سب سے پیاری امی ہیں۔“

”بس، بس بات سنتے نہیں ہو۔“

”پلیز امی! آپ میرے اور دعا کے معاملے میں نہ آیا کریں۔“

”کیوں نہ آیا کروں، تم اس معصوم کو تنگ کرتے ہو، مڑلاتے ہو۔“

”اس معصوم کو خود شوق ہے۔“ وہ بگڑا۔

”نادان! وہ تم سے بے پناہ چاہت رکھتی ہے، دیکھو ظاہرہ نے ہماری غیر موجودگی میں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہا مگر وہ نہیں گئی۔ رات ہم دیر سے آئے وہ بہت شدت سے انتظار کر رہی تھی۔“ وہ بولیں۔

”اب آپ کیا چاہتی ہیں؟“

”بس کسی کا دل نہیں دکھاتے، اسے سمجھنے میں وقت لگے گا۔“

”وہ غلط سمت جا رہی ہے۔“

”معلوم ہے لیکن اس طرح تو وہ بکھر جائے گی، سلیقے سے دوست بن کر سمجھایا کرو، اب چلو ناشتا کرو بہت دیر ہوگئی ہے۔“ عارفہ نے کہا تو اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

”اوہ! میں بہت لیٹ ہو گیا ہوں آپ سینڈوچ بنا کر لے آئیں، میں گاڑی نکالتا ہوں۔“ وہ تقریباً بھاگتا ہوا گیا۔

”اور ناشتا؟“ وہ چلائیں۔

”آپ لائیں، راستے میں کرلوں گا۔“ وہ بھی زور سے بولا۔ دعا نے اپنے کمرے میں آواز سن کر اس کے جانے کا اندازہ لگایا تو ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے اس کی خیریت اور اس کی حفاظت کی دعا کی۔

☆☆☆

رابعہ کے کمرے کو تالا لگا کر چابی بوا کو دے کر ریحان اختر نے بتایا کہ وہ دو روز کے لیے شہر سے باہر جا رہے ہیں۔

”اور یہ چابی؟“ بوا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”رابعہ اب میرے کمرے میں ہی رہیں گی، اس لیے کمرالاک کر دیا ہے، یہ چابی سنبھال کر رکھنی ہے۔ طلال جا کر رابعہ اور نیناں کو لے آئے گا۔“ انہوں نے ناشتے کی میز تک پہنچتے ہوئے تفصیل دی۔

”خیریت سے جا رہے ہو؟“ بوا نے فیضو کو گرم چائے لانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ضروری کام ہے اور کچھ بتانا ضروری نہیں۔“ سلاکس پر مکھن لگاتے ہوئے طلال نے ان کی جگہ جواب دیا۔ ریحان اختر نے اس کے جواب کو خاموش رہ کر سراہا۔

”فی الحال رابعہ کا کمرہ کھلا رہے دو، اپنے اپنے آنے پر۔“

”بوا! بس اب کوئی حمایت نہیں کرنی، محبت کا مطلب دھوکا دہی نہیں۔“ ریحان اختر نے بڑی سختی سے ان کو بات کرنے سے روکا۔ طلال مسکرایا۔

”کس نے کس کے ساتھ دھوکا کیا ہے، یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔“ بوا نے جل کر جواب دیا تو ریحان اختر سیخ پا ہو گئے۔

”کون سا دھوکا؟ بتائے رابعہ، ہونہہ۔۔۔۔۔ میری ضد اس نے دیکھی نہیں ہے۔“

”ریحان! تم جانتے ہو کہ رابعہ کو کیا ہوا ہے؟“ بوا نے جھٹکے سے اپنا پورا پورا حق استعمال کیا۔

”اس کا صرف دماغ خراب ہوا ہے اگر خود کو ایڈ جسٹ نہ کیا تو مجھے علاج کرنا آتا ہے۔“ وہ یہ کہہ کر تیزی

”ویسے ایک بار مامی کو بٹھا کر آپ صاف صاف پوچھ لیں۔“ طلال نے بھی زبان ہلا کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ بوا کو سخت برا لگا مگر ضبط کر کے کچن کی طرف چلی گئیں۔

”بزرگ ہیں، بہت خیال رکھتی ہیں سب کا۔ خاص کر میری نیناں کا۔“ ریحان اختر نے بیٹی کے لیے بہت زیادہ مٹھاس لہجے میں بھری۔

”ہاں یہ تو ہے، مجھے بھی ماں کی کمی آج تک محسوس نہیں ہوئی۔“ فوراً ہی طلال نے پوری سچائی کے ساتھ تائید کی تو وہ پہلو بدل کے رہ گئے۔ ایک عجیب سی کیفیت ان کے چہرے پر چھا گئی۔ طلال کو اندازہ تھا کہ وہ جب بھی ماں کا ذکر کرتا تھا وہ اسی طرح گم صدم سے ہو جاتے تھے اور اس کیفیت سے باہر نکلنے پر اسے بے حد پیار سے گلے لگاتے۔

”سوری ماموں۔“

”اٹس اوکے!“ وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ طلال بھی ان کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چلے گئے تو وہ بھی اپنے کمرے کی طرف آ گیا، ہیڈ سائنڈ ٹیبل پر رکھی ماں کی تصویر اٹھا کر غور سے دیکھنے لگا۔ تصویر میں مسکراتی آنکھوں والی وسیہ جیسے تصویر سے باہر نکل کر مسکراتے کو بے چین تھی۔ طلال کی آنکھیں بھرا آئیں۔

”کاش! آپ میرے لیے میرے پاس ہوتیں۔“ حسرت و یاس سے اس کے لبوں سے نکلا..... مگر کوئی جواب نہیں آیا۔

”ماموں نہ ہوتے تو میرا کیا بنتا؟“ بڑے کریناک انداز میں اس نے شاید خود سے سوال کیا۔ گو کہ ریحان اختر نے اسے زندگی کی ہر نعمت جمع کر کے دے رکھی تھی مگر ماں باپ کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوتی تھی تو وہ بہت مضطرب سا ہو جاتا تھا مگر ایسے میں من کے اندر نیناں کی موہنی صورت دکھائی دیتی تو وہ مسکرا نے لگتا۔ نیناں تو اس کا عشق تھی، دل کے اندر کس سچ و دھج سے برا جمان تھی یہ خود نیناں کو بھی معلوم نہیں تھا۔

☆☆☆

چھوٹے سے لان میں اپنے مخصوص تخت پر گاؤتیکے سے ٹیک لگائے وہ سنگترے چھیل کر بڑے سلیقے سے ایک ایک پھانک صاف کر کے کھانے میں مصروف تھے ناشتے کے بعد یہیں بیٹھ کر بلا ناغہ اخبار پڑھتے اور پھر سنگتروں کی ٹوکری منگوا کر خود سنگترے چھیلتے اور سیر ہو کر کھاتے..... سبحان نے مسکرا کر ان کو دیکھا اور قریب چلے آئے۔

”تایا ابا! آپ کی مستقل مزاجی دیکھ کر رشک آتا ہے۔“ ان کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سبحان نے کہا۔

”بیٹا جی! مستقل مزاجی ایسا کلیہ ہے کہ آدمی روز روز کی تبدیلیوں اور الجھنوں سے بچا رہتا ہے۔“ وہ رس بھری پھاٹک کا مزہ لیتے ہوئے بولے۔

”اس کا مطلب کہ آدمی بس ایک ہی جگہ سیٹل ہو جائے۔“ سیمان نے ایک پھانک اٹھا کر خود بھی کھاتے

”قطعاً نہیں مگر ایسی چیزیں جو بالکل خاص ہوں انہیں بدلنے سے گریز کرنا چاہیے۔ یہاں بیٹھنا اور یہ سنگترے کھانا چھوٹی سی بات سہی مگر اس میں مزہ بہت ہے۔“ وہ سمجھ گئے کہ سبحان کا اشارہ مخصوص جگہ پر بیٹھنے اور سنگترے کھانے کی طرف ہے۔

”پھل اور بھی لذت بھرے، ذائقے دار ہیں، روزِ سنگترے ہی کھانے کی منطق؟“

”یار! بے شک اللہ پاک نے کثرت سے پھل پیدا کیے ہیں سب ایک سے بڑھ کر ایک، منفرد اور بے مثال ہیں لیکن شناسائی اور عادت سب سے نہیں بنائی جانی چاہیے۔“

”آپ کی آپ جانیں، ہم تو سنگترے نہیں کھا سکتے۔“ وہ سنگتروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سرسری سے انداز میں کہہ گئے۔

”بیٹا جی! یہ صرف سنگتروں کے لیے ہی قتلون مزاجی ہے کیا؟“ انہوں نے پوچھا۔
 ”کیا مطلب؟“

”مستقل مزاج تو آپ بھی ہو، پھل بدلنے کا مشورہ دیتے ہو، سوئی ایک جگہ ہی اٹکی ہوئی ہے۔“ انہوں

نے گہری نگاہوں سے سبحان کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی..... سبحان چونکے۔

”ایسا کچھ نہیں۔“ وہ ٹالنے لگے۔

”رابعہ کے علاوہ کوئی نہیں۔“ پرانی خواہش انہوں نے بیان کی۔

”رابعہ درمیان میں کہاں سے آگئی؟“

”رابعہ درمیان سے گئی ہی کب تھی؟“

”بڑے ابا! آپ کے خیال میں ایسا ہے ورنہ۔“ وہ دانستہ چپ ہو گئے۔

”سبحان! جانتے ہو میری اس مستقل مزاجی کی وجہ کیا ہے، اس گھر کا اکیلا پن۔“

”اسی لیے اب کی بار میں آپ کو ساتھ ہی رونق میلے میں لے جاؤں گا۔“ وہ موضوع بدلنے میں تو ماہر تھے

ہی۔ بڑے ابا کو شکست خوردہ سی ہنسی آگئی۔

”سمجھتے ہو کہ وہاں جا کر تمہاری زندگی کی تنہائی مجھے دکھائی نہیں دے گی۔“

”میں تنہا نہیں ہوں۔ آپ ہیں میرے ساتھ، اللہ تعالیٰ ہے میرے ساتھ۔“

”اللہ تو سب کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔“

”چلیں اٹھیں..... اندر چلیں۔“ وہ یکسر نظر انداز کر گئے۔

”تم جاؤ میں آ جاؤں گا کچھ دیر بعد۔“

”اوکے! میں باہر جا رہا ہوں۔“

”واپسی پر میری بلڈ پریشر کی گولیاں لیتے آنا۔“

”جی بہتر۔“ سبحان نے جواب دیا اور پہلے گاڑی کی چابی اٹھانے کے لیے اندر گئے تو بڑے ابا نے پشت

سے ان کی مردانہ وجاہت کو دور تک دیکھنے کے بعد دل ہی دل میں سراہا..... وہ زمانے کی تبدیلیوں کے باوجود

اب بھی بے پناہ وجاہت اور جاذبیت رکھتے تھے۔

☆☆☆

فیملی پلازہ کی وسیع و عریض پارکنگ میں اپنی گاڑی لاک کر کے پلازہ کے گراؤنڈ فلور پر دائیں ہاتھ

سپراسٹور میں داخل ہوئے..... شیونگ کریم اور پرفیوم خریدنے کے لیے آئے تھے مگر بالکل سامنے کاؤنٹر پر ہل

دیتے ہوئے رابعہ کو دیکھ کر ٹھٹھکے قدم خود بخود اس طرف اٹھے۔

”ہیلو!“ قریب پہنچ کر وہ رابعہ سے مخاطب ہوئے..... رابعہ اچانک انہیں دیکھ کر ایک لمحے کو شناسائی کے

احساس سے مسکرائیں مگر پھر سنجیدہ سی ہو گئیں۔

”ہیلو! اب کی بار سبحان رابعہ کے قریب کھڑی پیاری سی لڑکی سے مخاطب ہوئے جس کے بارے میں ان

کا یقین تھا کہ وہ رابعہ کی بیٹی ہیں۔“

”ہیلو!“ سبحان نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

”یہ میری بیٹی ہے۔“ رابعہ نے انک انک کر تعارف کرایا۔

”میں جانتا ہوں۔“

”کیسے؟“ رابعہ چوٹیں۔

”بھئی حسین ماں کی بیٹی کو اتنا ہی حسین ہونا چاہیے۔“ وہ مسکرا کر بولے۔

”سبحان پلیز!“ وہ کچھ چڑسی لگیں۔

”مما! انکل نے آپ کی تعریف کی ہے۔“ نیناں نے مروٹا نہیں سمجھانے کے لیے کہا۔

”مجھے کسی کی تعریف نہیں چاہیے۔“ وہ بگڑیں۔

”ویسے رابعہ ڈیر، تعریف تو اس خدا کی جس نے تمہیں بنایا۔“ وہ مزہ لیتے ہوئے بولے۔

”نیناں چلو۔“ رابعہ نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے نیناں سے کہا۔

”رابعہ! بیٹی پہلی بار ملی ہے اس کو یوں تو نہ لے کر جاؤ۔“

”دراصل دیر ہو رہی ہے۔“ نیناں خفت سے بولی۔ ”دس پندرہ منٹ کی بات ہے، پلیز رابعہ کافی تو تمہیں

بہت پسند ہے۔“ سبحان نے یاد دلایا۔ وہ کچھ مضطرب سی ہوئیں اور پھر پلکیں جھکالیں۔

”آؤ بیٹا!“ سبحان نے نیناں کو چلنے کا اشارہ کیا اور خود آگے چلنے لگے..... رابعہ سب سے آخر میں تھیں۔

کافی کا آرڈر دے کر وہ اس میز کی طرف آگئے جہاں رابعہ اور نیناں بیٹھی تھیں۔

”کس کے ساتھ آئے ہو آپ لوگ؟“

”ڈرائیور کے ساتھ، نیناں کو کچھ چیزیں لیتی تھیں۔“ رابعہ نے جواب دیا۔

”بس اس طرح خود کو مصروف رکھا کرو۔“ وہ خوشی سے بولے۔

”انکل، آپ ممّا کو سمجھائیں، یہ میرے لیے ہی خوش رہیں۔“ نیناں نے سبحان کی تائید کی۔

”یہ آپ کی خاطر ہی کر رہی ہوں ورنہ وہ شخص تو قابلِ نفرت ہے میرے لیے۔“ رابعہ نے خاصی نفرت

سے کہا۔

”رابعہ! تمہارا مسئلہ کیا ہے؟“ وہ پوچھ بیٹھے۔

”پلیز سبحان! اس موضوع پر بات کرو گے تو میری طبیعت خراب ہو جائے گی۔“

”انکل! پاپا اچھے بھی ہیں اور برے بھی ہیں، ماما ہی بہتر جانتی ہیں کہ مسئلہ کیا ہے؟“ نیناں نے غیر ضروری مداخلت کی تھی رابعہ کو اچھا نہیں لگا۔

”وہ صرف آپ کے لیے..... اپنی بیٹی کے لیے اچھے ہیں۔“ وہ چلائیں۔

”اوکے کول ڈاؤن! تو تم یار فیصلے کی ٹیبل پر بیٹھو۔۔۔ ان سے بات کرو۔“ سبحان نے جلدی سے کہا۔

”اس سے کیا ہوگا؟ مجھے ریحان پر اعتبار ہی نہیں رہا۔“

”صفائی کا موقع دیتے ہیں۔“

”نہیں، میں جو جان چکی ہوں ان سے پوچھنا نہیں چاہتی کیونکہ وہ صرف سوری کہیں گے۔“ وہ بولیں۔

”پلیز لیو دس ٹاپک۔“ نیناں نے جلدی سے روکا۔ اسی اثنا میں کافی کے بھاپ اڑانے لگ آگئے۔

”رابعہ! پلیز اپنا خیال رکھو۔“ وہ دھیرے سے فقط اتنا بولے۔

”تھینک یو!“ رابعہ نے مختصر اُکھا۔ نیناں نے موبائل فون پر وقت دیکھا تو بولی۔

”مما جلدی چلیں، دیر ہوگئی ہے۔“ رابعہ نے بھی یہی محسوس کر کے سبحان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے گویا

مسکرا کر جانے کی اجازت دے دی۔

وہ گاڑی سے اتر کر ایک دوسرے کو تھکنے لگیں، ریحان کی گاڑی کھڑی تھی۔

”ریحان اختر کو سکون نہیں ہے۔“ رابعہ کے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔

”مما! طلال بھائی آئے ہوں گے ہمیں لینے کے لیے۔“ نیناں نے بتایا۔

”کیوں کیوں پہلے کبھی یوں آیا؟“ وہ بگڑیں۔

”اندر تو چلیں پلیز، بابا نے کہا تھا۔“ نیناں نے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اس کے ساتھ اندر آگئیں طلال

ٹی وی لاؤنج میں ہی بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر کچھ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور بولا۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام!“ رابعہ یہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگیں تو طلال بولا۔

”مامی! ذرا جلدی کریں، مجھے پہلے ہی دیر ہوگئی ہے۔“

”آپ جاؤ ہم آجائیں گے۔“ رابعہ نے کچھ سوچ کر نرمی اختیار کی۔

”کس کے ساتھ؟“ سوال چبھتا ہوا تھا۔

”طلال بھائی! ظاہر ہے ڈرائیور کے ساتھ۔“ نیناں نے جواب دیا۔

”چڑیا تم تو چپ رہو، ماما سمیت گھر لے جانے کی ذمہ داری مجھے دی گئی ہے۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

”ہاں! تو بیٹا یہ دونوں تیار ہیں۔“ زیتون بیگم نے جلدی سے کہا۔

”دادی!“ رابعہ جھنجھلائیں۔

”رابی! بیٹیاں اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔“ انہوں نے بہت پیار سے رابعہ کو گلے سے لگاتے

ہوئے کہا۔

”دادی! وہ گھر نہیں ہے۔“

”اچھا چھوڑو، غیر ضروری باتوں پر توجہ نہیں دیتے۔ اچھی بیویاں روز شوہر کے حساب کتاب کی کاپی کا صفحہ پھاڑ کر سوتی ہیں۔۔۔۔۔ یہ مرد چھوٹے بچوں کے مانند غلطیاں کرتے رہتے ہیں۔“

”آپ کا بھی خوب انداز ہے دادی۔“ انہیں حیرت ہوئی۔

”بیٹا! دادی تمہارے باپ کی ماں ہے، جانا پہلے مجھے تھا چلے وہ دونوں گئے اور کتنے دن رہوں گی؟“ زیتون بیگم نے رابعہ کو والدین کے حوالے اور اپنے بڑھاپے کے حوالے سے احساس دلایا۔

”مامی! دادی کو بتادیں کہ آپ کو سہارا دینے والوں کی کمی نہیں ہے۔“ طلال نے ایک دم ہی کافی خباثت

کا مظاہرہ کیا تو رابعہ چلائیں۔

”نہیں چاہئیں ماموں بھانجے کے سہارے۔“

”میں تو ان کی بات کر رہا ہوں جن کے ساتھ آپ کافی پی رہی تھیں۔“ طلال نے اس قدر سرسری انداز

اختیار کیا کہ رابعہ کو شدید صدمہ پہنچا۔

”ریحان اختر کے بھانجے کی سوچ ایسی ہی ہونی چاہیے۔“ رابعہ یہ کہہ کر اندر چلی گئیں۔

”طلال بھائی! آپ نے میری ماما کی انسلٹ کی ہے۔“ نیناں بھی تلملائی۔

”چڑیا! سچ بہت کڑوا ہوتا ہے، یہ جو رنجش چل رہی ہیں یہ بلا جواز نہیں ہیں۔ کون لگتے ہیں وہ مسٹر آپ کی

مما کے؟“

”بیٹا! کس کی بات کر رہے ہو؟“ زیتون بیگم نے پوچھا۔

”یہ تو آپ رابعہ ماما سے پوچھیں۔“ وہ بولا۔

”نیناں! کون تھے؟“ اب کی بار انہوں نے نیناں سے پوچھا۔

”بڑی امی! وہ سبحان انکل، ماما کے کلاس فیلو۔“ نیناں نے ہکلاتے ہوئے بتایا۔

”سبحان! اچھا اچھا، ارے بیٹا وہ بہت اچھا انسان ہے۔ رابعہ کا بہت خیال رکھتا ہے۔“ وہ سادگی سے بتا

کر مطمئن ہو گئیں مگر طلال کے لیے اتنا ہی کافی نہیں تھا۔

”میں ابھی آتی ہوں۔“ نیناں اس کی چبھتی نگاہوں سے گھبرا کر اندر چلی گئی۔

”مما کو کہو جلدی کریں، سب چیزیں تو میں نے پیک کرادی تھیں۔“ زیتون بیگم نے نیناں کو ہدایت کی تو

وہ اثبات میں گردن ہلا کر چلی گئی۔

”بیٹا! مجھے بہت قلق ہے کوئی صدمہ تو ہے جو میری رابعہ کو چاٹ رہا ہے، اس کے سامنے میں زیادہ

پریشان نہیں ہوتی پر اس پریشانی سے نظریں بھی نہیں جھرا سکتی۔“ وہ نیناں کے جانے کے بعد بولیں۔

”دادی! آپ کی پریشانی کا نام سبحان صاحب ہیں۔“ اس نے کافی طنز یہ انداز میں کہا۔۔۔۔۔ تو وہ کچھ نہ

سمجھیں یہ ان کی عمر کا تقاضا تھا یا سادگی۔

کمرے کی صفائی کا مکمل جائزہ لے کر وہ باہر آئیں اور رابعہ کی طرف دیکھا وہ اپنے بند مریے کے دروازے کو گھور رہی تھیں۔

”بیٹا! تمہاری جگہ وہاں ہے۔“ بوانے اُن کے ہر سوال سے پہلے بڑے سلیقے سے کہا۔
 ”یہ کس نے کہا آپ سے؟“ وہ الجھیں۔
 ”میری عمر نے، میرے تجربے نے۔“ مختصر اُ کہا۔
 ”بوا! یہ ضد ہے ریحان کی۔“

”نہیں بیٹا! یہ اس کی خوشی ہے، وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔“ انہوں نے کہا مگر وہ سرد آہ بھر کے بولیں۔

”آپ اس کے جھوٹ پر لاکھ پردہ ڈالیں، مجھے اس کی کسی بات پر یقین نہیں۔“
 ”یقین کرنا ہی پڑتا ہے، تمہاری ساس بھی تمہاری طرح سوچنے لگی تھیں..... خیر آؤ آرام کرو اپنا سامان الماریوں میں رکھو..... میں ذرا باورچی خانے کا چکر لگا آؤں۔“ بوانے خاصی لمبی بات کی۔

”بوا! آپ ریحان کو کتنا جانتی ہیں؟“
 ”جتنا شاید وہ خود کو بھی نہیں جانتا۔“ وہ بہت روانی میں کہہ گئیں۔
 ”پھر بھی!“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں..... پھر بولیں۔
 ”بوا! آپ نہیں جانتیں..... کچھ بھی نہیں جانتیں۔“
 ”جانتی ہوں مگر ریحان کو انسان سمجھو، فرشتہ نہیں۔“ وہ بولیں۔
 ”ہا..... اس نے میرے اعتبار کا خون کیا اتنی گھناؤنی حرکت، اس پر معافی۔“ رابعہ نے تلخی سے تمسخر

اڑایا۔
 ”چلو، کمرے میں چلو۔“ وہ ٹال گئیں۔
 ”ریحان کو فتح یاب کرانا چاہتی ہیں آپ۔“
 ”نہیں، مرد تو ہے ہی خود سری کا دوسرا نام۔“
 ”بوا! مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا۔“ وہ ڈٹ گئیں۔

”ضد نہ کرو، نیناں کی خاطر، کچھ مان لو، کچھ منوالو۔“ انہوں نے پیار سے انہیں گلے لگاتے ہوئے ایک مہربان ماں کی طرح سمجھایا..... وہ ان کے سینے سے لگی موم کے قالب میں ڈھل گئیں۔
 ”یہ نیناں ہی تو میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔“ وہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے ریحان کے کمرے تک آ گئیں جو کہ پہلے ان کا بھی تھا۔

”سمجھ لو نیناں ہی ریحان کی کمزوری ہے۔“ دروازے کے باہر سے انہوں نے کہا اور دائیں ہاتھ مڑ گئیں..... رابعہ چند ثانیے دروازے کے عین وسط میں جمی رہیں پھر اندر قدم رکھے..... سب سے پہلی نظر بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر پڑی جہاں ان کی اور ریحان کی شادی کی تصویر رکھی تھی۔ دوسری سائڈ ٹیبل پر نیناں اور ریحان کی ہنستی مسکراتی تصویر رکھی تھی..... دھیرے دھیرے چلتے ہوئے بیڈ تک پہنچیں اور تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ

گئیں۔ انہیں موندیں مریے کی یادوں سے کنارہ کرے لے رہے تھے۔
 ”یار! تمہاری بند آنکھیں بھی بولتی ہیں۔“ انہوں نے جھک کر پلکیں چوم کر کہا تو وہ خود میں سمٹ گئیں۔
 ”بس، بس دور سے ہی تعریف فرمائیے۔“

”اونہ..... کچھ تعریفیں بازوؤں میں بھر کے کی جاتی ہیں۔“ ان کو پرے کرنے پر بھی خود بخود بازوؤں میں سمٹی چلی گئیں..... کچھ دیر انہوں نے شویوں اور رنگین شرارتوں میں انہیں جکڑ کر بند کیے رکھا۔ جب ذرا موقع پا کر وہ آزاد ہونے میں کامیاب ہوئیں تو وہ مخمور آواز میں بولے۔

”جان! دل چاہتا ہے کہ تمہیں ہریل، ہر گھڑی اپنے بازوؤں میں لیے رکھوں۔“
 ”جی ہاں! کام کاج کے لیے بھی اب وقت نکالیں، شادی کو پندرہ دن گزر گئے ہیں۔“
 ”یار! صرف پندرہ دن ہوئے ہیں اور تم اتنی دور دور بھاگتی ہو۔“ انہوں نے ایک بار پھر جھپٹ کر کلائی دیوچ لی۔

”پلیز۔ پلیز ریحان، خیال کریں، یہ دیکھیں بریسلیٹ ٹیڑھا ہو گیا ہے۔“ وہ منت سماجت کے دوران بریسلیٹ دکھانے کی کوشش کرنے لگی مگر بے سود۔
 ”ہزاروں بریسلیٹ اور آجائیں گے۔“ وہ شوخی سے بولے۔
 ”اوہ، چھوڑیں نا..... چھوڑیں پلیز.....“ وہ بڑبڑائیں۔

”مما کیا ہوا؟“ نیناں نے کندھا پکڑ کر ہلایا تو وہ حقیقت کی دنیا میں آ گئیں۔ بے دھیانی میں بریسلیٹ والی کلائی پر دوسرا ہاتھ تھا..... چہرے پر شبنمی سی نرمی تھی ہونٹ چباتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔
 ”کچھ نہیں.....“

”مما پلیز! بی پی.....“ نیناں کو معلوم تھا کہ اس وقت وہ یہاں کیوں ہیں؟ کس ذہنی کوفت کا شکار ہیں۔
 ”میں آپ میں خوش ہوں، میری فکر نہ کرو۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا تو نیناں کے چہرے پر زندگی سے..... بھرپور مسکراہٹ پھیل گئی۔

”میں آج بہت خوش ہوں۔“ وہ بولی۔
 ”نیناں! اب اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔“
 ”مما! مجھے میٹھس میں بہت پرائیم آرہا ہے۔“
 ”تو کیا مسئلہ ہے، رمان کا میٹھس بہت اچھا ہے، اسے کہہ دیتی ہوں۔“

”نہیں، بس آپ مجھے بابا سے کہہ کر ٹیوٹر رکھوادیں۔“ وہ بولی۔
 ”نیناں! میرے یہاں آنے کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ میں آپ کے بابا میں اتوا لو ہوں۔“ وہ خاصی سنجیدگی سے بولیں..... نیناں ایک دم چپ ہو گئی۔

”اور ہاں کوشش کرنا کہ اپنے اور میرے درمیان انہیں نہ لانا۔“ رابعہ نے تاکید کی تو نیناں نے معصومیت سے اثبات میں گردن ہلا دی۔
 فیضو نے آکر کھانا لگنے کی اطلاع دی تو رابعہ نے اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

دن بھر موسم خشک اور چمکدار تھا مگر رات ایک دم ہی جانے کہاں سے گھٹا آئی اور موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ تیز ہوا کے ساتھ بارش کا شور کھڑکیوں کے پٹ ہوئے ہوئے اپنے ہونے کا احساس دلارہے تھے۔۔۔۔۔۔
نیناں سدا کی بارش سے، تیز ہواؤں سے خوف زدہ ہونے والی تھی۔ ننھا سادل پھڑپھڑانے لگا۔۔۔۔۔۔ چاہا بھاگ کر بوا کے پاس چلی جائے، پیروں میں سلپرز ڈالے ہی تھے کہ لائٹ چلی گئی، چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔ ایسے میں تو اس کی سانس جیسے رک گئی۔۔۔۔۔۔ گلے میں پھندا سا پڑ گیا۔۔۔۔۔۔ حلق سے آواز نہیں نکل پائی مگر ایک دم بوا کی آواز اور دروازے کی دستک نے سانس بحال کی۔ انہیں شاید احساس تھا وہ خود ہی اس کے پاس آگئیں۔۔۔۔۔۔ دروازہ کھولتے ہی وہ ان سے لپٹ گئی۔ انہوں نے اپنی آغوش میں چھپا لیا تو اسے سکون آیا۔
”بوا، بوا۔۔۔۔۔۔ دروازہ لاک کر دیں۔“ وہ ہکلائی۔

”نیناں! بیٹا اس طرح ڈرتے نہیں، یہ لو بند کر دیتے ہیں۔“ انہوں نے کہا اور دروازے کی چنجنی لگا دی۔
اس کا اگلا سوال ماں کے لیے تھا۔
”وہ ماما کیلی ہیں۔“

”ہاں! لیکن وہ گہری نیند سوئی ہوئی ہیں، میں وہیں تھی۔“ انہوں نے پیار سے اسے بستر پر لٹایا اور خود اس کے برابر لیٹ گئیں۔
”انہوں نے میڈیسن پھر کھالی ہوں گی۔“

”عادت بن گئی ہے، کیا کریں؟“ انہوں نے بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی دراز سے ٹول کر موم بتی اور ماچس نکالی۔۔۔۔۔۔ موم بتی کے ننھے سے شعلے میں اس کو تحفظ کا سا احساس ہوا۔
”بوا! ماما کو سمجھائیں نا!“ اس نے اس وثوق کے ساتھ خواہش ظاہر کی کہ جیسے سب کچھ بوا کے اختیار میں ہو۔

”بچے! رابعہ کو صرف تم ہی سمجھا سکتی ہو۔۔۔۔۔۔ جا کر کمرے کا حال دیکھو، سب الماریوں کا سامان نکال کر باہر پھینکا ہوا ہے، جانے کیا تلاش کرتی رہی؟“ وہ خاصی فکر مندی سے بولیں۔
”میری سمجھ میں نہیں آتا ایسی کیا بات ہے جو ماما کو بابا سے اتنی نفرت ہوگئی۔“
”بھول اور نادانی کا موسم بہار اور خزاں کے مانند ہوتا ہے تمہاری دادی کہا کرتی تھیں۔“
”کاش دادی زندہ ہوتیں۔“ بے ساختہ ہی اس کے لبوں سے نکلا تو بوا سر داہ بھر کے رہ گئیں۔
”زندہ تو رہنے کی ان کی اپنی خواہش مر گئی تھی۔“

”بوا! مجھے اپنے کمرے سے اسی لیے بہت لگاؤ ہے وہ یہاں محسوس ہوتی ہیں۔“
”پیاری بیٹی! تمہارا تو نام و نشان بھی کہیں نہیں تھا۔“ بوا ہنس کر بولیں۔

”یہ کمرہ ان کا تھا، وہ دیوار پر تصویر ان کی ہے۔“ تلکبے سے اجالے میں اس نے انگلی سے دیوار کی سمت اشارہ کیا تو بوا نے سختی سے ہونٹ بھیج کر خاموشی اختیار کی۔ نیناں نے سراٹھا کر ان کی طرف دیکھا مگر وہ تو جیسے وہاں تھیں ہی نہیں۔۔۔۔۔۔ ان کی نگاہیں دادی کی تصویر پر جمی تھیں۔۔۔۔۔۔ نیناں نے دھیرے سے اُن کی گود میں سر

رکھ دیا تو ان کی کمزوری انگلیوں میں حرکت پیدا ہوئی، اس کے بالوں میں سرسراہی انٹیوں کا لماں تھا کہ بارش کے شور کے باوجود وہ سو گئی۔ ہر ڈراور خوف سے محفوظ ہو کر۔

”سکھاں! سکھاں!“ ایک دم ہی روشنی غائب ہوئی تو مہ جیس کی آواز کپکپائی۔

”جی بی بی! میں یہیں ہوں، آپ ہلنا نہیں، مہندی خراب ہو جائے گی۔“ سکھاں نے جلدی سے موم بتی جلائی تو ڈاکٹر مہ جیس کو سکون آیا۔
”آپ تو بلاوجہ ڈر جاتی ہیں، باہر دیکھیں کتنا ہنگامہ ہے۔“ سکھاں نے کمرے سے باہر کے شور اور ناچ گانے کی طرف اس کی توجہ مبذول کرائی۔

”مگر مجھے یہ ہنگامہ اچھا نہیں لگ رہا۔“

”یہ تو بری بات ہے بی بی، صبح آپ کی رات آئے گی۔“ سکھاں کی آنکھوں میں دیے جل اٹھے تو مہ جیس پہلو بدل کر رہ گئی۔

”سکھاں! راجا صاحب کے تصور سے بھی میرا دل ڈولنے لگتا ہے مگر کوئی میری بات سمجھنے والا نہیں۔“

”بڑی بیگم صاحبہ بھی نہیں؟“ سکھاں نے پوچھا۔

”ہاں وہ بھی نہیں۔“ مہ جیس کے لبوں سے درد ٹپکا تو سکھاں کے اندر اپنی ماں شادو چھلانگ مار کے اتر گئی۔

”میری ماں کی طرح۔“ وہ کھوئی کھوئی سی بولی اور رحمت سے ملنے کی کک جاگ اٹھی۔

”تمہاری ماں کو تو میں زیادہ نہیں جانتی۔ پر امی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔“ مہ جیس نے کہا۔

”بس صحنوں کا، دیواروں کا فرق ہے۔“ سکھاں دکھی سی ہو گئی۔

”چل چھوڑ، ہم دونوں یہاں سے چلے جائیں گے۔“ مہ جیس نے اس کو بہلانے کے لیے کہا تو وہ جھکی۔

”ہم دونوں۔“

”ہاں! امی نے تمہیں بتایا نہیں؟“ مہ جیس نے سرسری انداز میں پوچھا تو وہ ہونق بنی نئی میں گردن ہلا گئی۔

”میرے ساتھ تمہیں ہمیشہ کے لیے بھیج رہے ہیں۔“

”نہیں نہیں۔“ دھڑام سے کچا کوٹھادل کے اندر گرا اور تصدیق کرنے کے لیے وہ باہر بھاگی، اس جھمے میں

جہاں اس کی ماں شادو اور باپ کام کاج میں مصروف تھے۔ اس کی پتھرائی آنکھوں کو پڑھ کر شادو نے نگاہیں چرائیں، اشکوں نے ٹوٹ ٹوٹ کر اسے جھنجھوڑا مگر وہ تو اس کی رخصتی کا بیان کر چکی تھی۔

”مجھے جہیز کے سامان کی طرح بے زبان سمجھ کر کیوں بھیج رہی ہے۔“ وہ کراہی۔

”بے وقوف! عمر بھر ٹھاٹھ سے رہے گی، یہ تو قسمت والوں کو مقام ملتا ہے۔“ ماں نے بڑے فخر سے اسے

اطلاع دی۔

”بیٹیاں ایسے بھی رخصت کرتے ہیں کیا؟“ سکھاں کا سوال لبوں پر آیا مگر دم توڑ گیا۔۔۔۔۔۔ بڑی بیگم صاحبہ

نے اس کا سوال تو نہیں سنا البتہ خوشی بھرا پیغام دیا۔
 ”سکھاں! خاص ملازمہ کو ہی رخصت ہو کر جانا پڑتا ہے، تمہاری بھی شادی ہو گئی سمجھ لو، اپنی بی بی کے ساتھ رہنا۔“

”جی، کیوں نہیں۔“ شادو نے سکھاں کی جگہ خوش ہو کر اقرار کیا۔

”میری شادی کس سے؟“

”ہا! ہا! بنگی! ہمارے ہاں بیویوں کے ساتھ خاص ملازمہ ہی جاتی ہے، تمہاری ماں نے، باپ نے بتایا نہیں، یہ تو پیسہ دے کر فیصلہ ہوتا ہے۔“ بڑی بیگم صاحبہ نے حیرت سے پوچھا تو سکھاں کی نگاہیں ماں کے چہرے پر ٹپکتی گئیں۔

”اب سمجھی کہ تو مجھے ڈولی میں بٹھانے آئی ہے۔“ سکھاں کے آنسو رخساروں پر سے پھسل کر پیلے کنارے لگے دوپٹے میں جذب ہو گئے۔ مردہ قدموں سے چل کر بی بی کے پاس آئی تو وہ ماجرا جان گئی۔
 ”یہ ظالم رسم تمہیں دکھی کر رہی ہے تو میں احتجاج کرتی ہوں۔“ مہ جبین نے کہا تو اس نے لرزنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

”نہیں، میں دکھی نہیں ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے کہ تم دکھی ہو، رحمت کی آرزو تمہاری بھیگی آنکھوں سے جھلک رہی ہے۔“
 ”نہیں بی بی! مجھے کوئی رحمت نہیں چاہیے، اپنی بی بی کے ساتھ رہنا میری خوشی ہے۔“

”جھوٹ.....؟“

”یہ سچ ہے، میں نے اپنی بی بی کو زیادہ دیکھا ہے، رحمت تو سایہ تھا وہ بھی دو پہر کا۔“ وہ بولی۔

”سکھاں! ابھی وقت ہے پھر دو پہر کا سایہ بھی نہیں ملے گا۔“

”بی بی! چھوڑو میرے ماں باپ نے جس سے چاہا بیاہ دیا۔“ سکھاں نے بہت صبر سے کہا اور گھٹنوں میں منہ دے کر بیٹھ گئی۔ مہ جبین اس کے دکھ کو سمجھتی تھی شاید اسی لیے بہار بیگم اندر آئیں تو وہ کہہ بیٹھی۔
 ”امی! سکھاں کو اس کے گھر بھیج دیں۔“

”کیا مطلب؟“

”مجھے اسے ساتھ نہیں لے جانا، اب زمانہ بدل گیا ہے ہر گھر میں ملازم ہوتے ہیں۔“
 ”ہمارے گھر کا زمانہ نہیں بدلا، جو نوکرانی بچپن سے ساتھ رکھی جاتی ہے وہی ڈولے کے ساتھ جاتی ہے اور راجا صاحب کے گھر شاید ہی کوئی ملازم ہو۔“ بہار بیگم نے فرش پر بیٹھی سکھاں کو سننے کے لیے زور سے کہا۔
 ”مگر امی! سکھاں کی بھی کوئی مرضی ہے، اس کی شادی ہونی چاہیے۔“

”جب پہلی مرتبہ اس کا باپ اسے لایا تھا تب ہی آغا جی نے ساری رقم دے دی تھی اور کہہ دیا تھا کہ یہ مہ جبین کے ساتھ جائے گی۔“

”امی جہیز کے سامان اور سکھاں میں کوئی فرق نہیں کیا؟“

”اس نے کچھ کہا ہے؟“

”نہیں بیگم صاحبہ! میں تو چاہنے پر خوش ہوں۔“ سکھاں جلدی سے اٹھ کر بولی۔
 ”چلو آؤ اپنا سامان بھی دیکھ لو کچھ کمی تو نہیں.....“ بہار بیگم نے سکھاں کو کہا۔
 ”سب ٹھیک ہی ہو گا۔“ وہ بولی۔

”امی یہ ظلم ہے۔“ مہ جبین نے آخری احتجاج بلند کیا۔

”ابھی اہمیت پتا نہیں، پرانے گھر میں قدر آئے گی۔“ بہار بیگم نے بیٹی کو سختی سے کہا اور چلی گئیں۔ مہ جبین اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ سکھاں نے مسکرا کر اس کی تشویش اور پریشانی دور کر دی۔
 ”بی بی آپ کو اندھیرے میں ڈر لگتا ہے نا، میں ساتھ رہوں گی تو ڈر نہیں لگے گا۔“ سکھاں نے بہت دھیرے سے کہا جو شاید مہ جبین سن بھی نہیں سکی۔

☆☆☆

راجا صاحب نے اپنے ذہن اور آغا جی کی جیب کے لحاظ سے کوئی سجاتی تھی اور حجلہ عروسی کی آرائش و زیبائش بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سکھاں نے بی بی کا زریں آنچل سر کا کر کمرے کے بارے میں بتایا تو مہ جبین پہلی بار خوش ہوئی۔

راجا صاحب مردانہ وجاہت کا بے مثال نمونہ تھے۔ ریشمی لباس میں نازک اندام سی مہ جبین کو دیکھتے ہوئے بولے۔

”مہ جبین کے لیے پھولوں اور ستاروں سے کمر سجایا ہے۔“ وہ بری طرح شرما گئی۔ راجا صاحب دوستوں کے جھرمٹ میں گھر گئے تو سکھاں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”بی بی! کمرے میں آرام کر لیں۔“

”ہوں... لیکن!“ صرف مردوں کے ہجوم میں سکھاں ہی اس کے لیے آشنا تھی۔

”آپ چلیں، یہاں صرف راجا صاحب کے دوست ہیں۔“ سکھاں نے اصرار کیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

بھاری لباس میں نئی جگہ چلنے کے لیے سکھاں کے سہارے کی ضرورت تھی۔

”شکر ہے امی نے تمہیں میرے ساتھ بھیج دیا ورنہ.....“ مہ جبین نے کمرے میں داخل ہو کر اطمینان بھری سانس لی۔

”آپ فکر کیوں کرتی ہیں، راجا صاحب بہت اچھے ہیں۔“ سکھاں نے کہا۔

”لیکن سکھاں، میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ ننھی ننھی پسینے کی بوندیں اس کے چہرے پر نمودار ہو گئیں۔

”کیوں..... کیوں؟ میں ہوں نا.....“ سکھاں نے شدت محبت سے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔

”سکھاں تمہارا کمر کہاں ہے؟“

”ذرا دور ہے۔“

”نہیں، تم ساتھ والے کمرے میں رہو گی۔“

”اچھا لیکن کل سہی فی الحال آپ آرام کریں۔“ سکھاں نے اسے بیڈ پر بیٹھنے میں مدد دی۔

”اچھا ابھی میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“

”کچھ کھالیں، سیب کاٹوں؟“ سکھاں نے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھے فروٹ دیکھ کر پوچھا۔
 ”نہیں کچھ دل نہیں چاہ رہا۔“

”بات کیا ہے؟“
 ”پتا نہیں آغا جی نے ٹھیک کیا ہے یا غلط.....“ مہ جیسے تکیے کے سہارے نیم دراز ہو گئی، سکھاں نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ باہر کوئی نہیں تھا، سب جا چکے تھے۔ وہ پریشان سی ہو کر ذرا باہر نکلے تو باورچی خانے سے راجا صاحب ہاتھ میں ٹرے اٹھائے باہر نکلے۔ دو گٹرے میں موجود تھے۔ دودھ یا چائے کے یہ سکھاں نہیں جان سکی بس اتنی تسکین ہی کافی تھی کہ وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ انہوں نے مہ جیسے کا خیال کیا تھا۔ سکھاں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا، لائٹ آن کی اور اپنا ٹیگ کھول کے سامان نکالا۔ بڑی بیگم صاحبہ نے سچ مچ بڑے بڑے دو سوٹ کیس اس کے سامان سے بھر کے دیے تھے۔ کپڑے، جوتے، سرمہ کا جل، چوڑی پائل سب کچھ ہی تھا۔ ہر چیز دیکھتے ہوئے ایک ہی خیال ستا رہا کہ یہ کیسی رخصتی ہے؟ کیسا بیاہ ہے؟ کہ دوسرا کوئی نہیں پلکیں بھگیں تو صاف کرنے والا کوئی نہیں تھا۔
 ”سکھاں! اب یہی تیرا گھر ہے، تیرا مقدر ہے۔“ کسی نے کان میں کہا تو رحمت کا احساس دل میں جاگا لیکن پھر یہ سوچ کر دروازہ بند کر لیا۔ رحمت تو بہت پیچھے رہ گیا ہے؟ تو بہت دور آگئی ہے بھول جا سب پچھلے منظر..... سوچتے سوچتے جانے کس پہر آنکھ لگ گئی کیونکہ نیند تو کانتوں کے بستر پر بھی آ جاتی ہے۔

☆☆☆

”رفیقو! سب لوگ کہاں ہیں؟“ طلال نے ناشتے کی میز خالی دیکھ کر رفیقو کو آواز دے کر پوچھا۔
 ”سب ناشتا کر رہے ہیں۔“

”کہاں اور کیوں؟“

”بیگم صاحبہ کے کمرے میں۔“

”اوہ!“ وہ ہونٹ سیٹھ کر بولا اور خود بھی اٹھ کر ریحان اختر کے کمرے میں آ گیا۔
 ”مامی! صبح بخیر.....“ کچھ عجیب سے انداز میں وہ بولا، نیناں اور رابعہ کے منہ میں ٹوٹ پھنس سا گیا۔
 ”ہینو ناشتا کرو۔“ رابعہ نے دھیرے سے کہا۔

”مامی! میز پر جو ناشتا لگا ہے، وہ کون کھائے گا؟“

”وہ آپ کے لیے ہے طلال بھائی.....“ نیناں نے ہمت کر کے کہا۔

”اچھا میں اچھوت ہوں کہ اکیلا ناشتا کروں؟“ وہ یکدم تیخ یا ہو گیا۔

”کہا تو ہے کہ ناشتا کر لو کیوں بات بڑھاتے ہو۔“ رابعہ نے کچھ سختی سے کہا۔

”رسی چل گئی پر بل نہیں گیا۔“

”تہذیب میں رہو طلال، رشتوں کا احترام مت بھولو۔“ رابعہ کو غصہ آ گیا۔

”بہت خوب..... رشتوں کا جتنا احترام آپ کرتی ہیں کسی ایرے غیرے کے ساتھ کافی پی لی۔“ وہ چبا چبا کر بولا۔

”تم چپ کرو چڑیا، ماموں کی عزت اس طرح خراب کرنے کی کسی کو اجازت نہیں۔“
 ”طلال! بات نہ بڑھاؤ جاؤ کرناشتا کرو۔“ بوائے اسی وقت آ کر سمجھانا چاہا مگر وہ اور زیادہ مشتعل ہو گیا۔

”بوا! آپ ماموں کی وفادار ہیں یا ان کی جو اپنے کلاس فیلو کے ساتھ عیش کرتی پھرتی ہیں۔“

”کچھ بھی سمجھ لو۔“ انہوں نے جل کر کہا۔

”دیکھو طلال! اپنی ذہنیت کا علاج کراؤ۔“ رابعہ نے کہا اور اٹھ کر باہر نکل گئیں..... اس کی نگاہوں کی زد میں اب نیناں تھیں۔

”چڑیا! کالج نہیں جانا کیا؟“ وہ کچھ نہ بولی۔

”اٹھو نیناں! کالج جاؤ۔“ بوائے نے کہا۔

”بوا! وہ.....“ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ وہ بولا۔

”جلدی باہر آ جاؤ، میں گاڑی نکالتا ہوں۔“ وہ باہر نکل گیا تو نیناں نے صاف انکار کر دیا۔

”بوا! مجھے طلال بھائی کے ساتھ نہیں جانا۔“

”نیناں! کیا بچوں جیسی حرکت ہے اپنے اندر اعتماد پیدا کرو۔“ بوائے دھیرے سے کہا۔

”مما کہاں گئیں؟“

”میں دیکھتی ہوں لیکن جاؤ دیر ہو رہی ہے ریحان نے آ کر ناراض ہونا ہے۔“

”اچھا لیکن ممما کو آپ دیکھتی رہنا۔“ وہ معصومیت سے بولی۔ بوائے اثبات میں گردن ہلا دی۔ وہ چلی گئی تو وہ رابعہ کو دیکھنے کے لیے میسر کی طرف آ گئیں۔

”یہاں کیوں آ گئیں؟“

”سائس لینے کے لیے اس کمرے میں دم گھٹتا ہے۔“

”رابعہ! بیٹا جینا ہے تو پورے احساس کے ساتھ جیو، ابھی تو ریحان آئے بھی نہیں ان کے سامنے تو بہت سمجھداری سے رہنا ہے۔“

”کاش..... میں اب ان کے ساتھ رہنا چاہتی۔“ وہ چلائی۔

”اچھا بس، چھوڑو، جو تم کہتی ہو وہ میں نے مان بھی لیا لیکن وہ تو نہیں مانتا۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ریحان اختر میرے دل میں اپنا مقام بحال نہیں کر سکتے۔“

”رابعہ!“

”ہوں!“

”ایک بات کہوں؟“

”جی۔“

”طلال کو نرمی سے سمجھایا کرو۔ اس کی حیثیت بہت زیادہ ہے اور اہمیت بھی ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ میں اور میری بچی طلال کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوا کریں۔“ رابعہ کو برا محسوس ہوا۔

”ہرگز نہیں، طلال کا ہے ہی کون صرف ریحان۔“ بوانے جانے کس وجہ سے کہا۔

”اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ رشتوں کا احترام بھول جائے۔“

”نرمی سے اثر قبول کر لیتا ہے، ریحان نے اسے اس طرح کا بنایا ہے۔“

”بہر کیف! آپ اسے سمجھا دیں۔“

”اچھا! اب اٹھو اندر چلو کپڑے تبدیل کرو، ریحان نے آج آنا ہے۔“

”بوا! آپ یہ مان کیوں نہیں لیتیں کہ ریحان کے آنے یا نہ آنے سے مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، میں

صرف دنیا کی وجہ سے آئی ہوں، باقی وہ تعلق وہ اعتبار اب دوبارہ قائم نہیں ہو سکتا۔“

”ایسا لگتا ہے کہ اس گھر میں پرانی فلم چل رہی ہے۔ تمہاری ساس بھی ایسی باتیں کرنے لگی تھیں۔“

”کیا مطلب..... لگی تھیں؟“

”کیونکہ جو انہوں نے سوچا نہیں تھا ویسا نکلا، بس پھر وہ گھٹ گھٹ کے جیتی رہیں کبھی کبھی تو تمہارے اندر

وہی دکھائی دینے لگتی ہیں۔“

”کیا معلوم؟ آپ نے انہیں دیکھا جانا، میرا تو صرف ریحان سے اصولی اختلاف ہے۔“

”ان کا بھی اصولی جھگڑا ہی تھا۔“

”بوا! ریحان کے ابانے بھی بے وفائی کی ہوگی۔“ وہ اپنے تناظر میں بولی۔

”نہیں! بس ان کا معاملہ بھی اور تھا جس نے بہتری کا راستہ نہیں دیکھا، اسی لیے کہتی ہوں کہ دنیا کے

ذریعے ریحان اختر تک رسائی رکھو، شاید ریحان کا جرم اپنے باپ کی طرح سنگین نہ ہو۔“ بوانے وثوق سے تو

نہیں البتہ انداز سے سے کہا۔ رابعہ کے دماغ کی رگیں چیخنے لگیں، ایک دم ہی غصہ آنے لگا مگر عین اسی لمحے فیضو

نے آکر ریحان کے فون کی اطلاع دی۔

”مجھے نہیں کرنی بات..... جا کر فون بند کر دو۔“ وہ چلائی تب بوانے فیضو کو ہاتھ کے اشارے سے جانے

کو کہا اور خود فون سننے کی غرض سے پیچھے چلی گئیں۔

”بوا! اس گھر میں آپ کا وجود کتنا بڑا سہارا ہے، ورنہ کیا ہوتا؟“ رابعہ نے سوچا۔

☆☆☆

رمان تیار ہو کر آفس کے لیے نکل رہا تھا کہ طاہرہ پچھو نے کچھ سامان کی لسٹ اسے تھمتے ہوئے کہا۔

”رمان! یہ سامان تو دے کر جاؤ۔“

”یہ کیا سامان ہے؟“ لسٹ پر نظر ڈالتے ہوئے وہ بولا۔

”بس چائے کے ساتھ کچھ تیاری کرنی ہے۔“ طاہرہ پچھو نے گول مول سا جواب کچھ مجھے مجھے انداز میں

دیا۔

”خیر تو ہے پچھو، ڈرم اسٹکس، ہکٹ، پزا، کیک، مٹھائی؟“ ناشتے کے لیے ڈائننگ ٹیبل کے پاس پہنچ کر

شرارت سے پوچھا۔

”کچھ مہمان آرہے ہیں دعا کو دیکھنے کے لیے۔“ وہ گلوگیر لہجے میں کہہ کر بلاوجہ مسکراتے کی اداکاری

کرنے لگیں تو وہ حسب عادت شریر ہو گیا۔

”آپ کو صدمہ ہے یا خوشی؟“

”رمان! صدمہ بھی ہے اور خوشی بھی۔“ طاہرہ پچھو اور زیادہ سنجیدہ ہو کر بولیں۔

”ہیں! یہ کیا منطق ہے؟“

”نہیں جو کہا ہے وہ کرو۔“ وہ بولیں۔

”یہ کون لوگ ہیں جن کا دماغ خراب ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”دعا کو دیکھنے کے لیے آنے والوں کی دماغی حالت پر شک ہے مجھے۔“ وہ بہت سادگی سے بولا۔

”کیوں..... کیونکہ وہ غریب ہے، بد شکل ہے۔“ طاہرہ برا مان گئیں تو وہ شرمندہ ہو گیا۔

”میرا مطلب یہ نہیں تھا، میں تو مذاق کر رہا تھا۔“

”یہ بلاوجہ کا مذاق اور شرارت چھوڑ۔ کیوں نہیں دیتے۔“ عارفہ ٹرے میں ناشتا لیے آئیں اور سرزنش

کی۔

”یہ سامان دے جاؤ بس۔“ طاہرہ پچھو یہ کہہ کر چلی گئیں تب عارفہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”دعا کے لیے طاہرہ بہت فکر مند ہے۔“

”کیوں، کیا ہو گیا ہے دعا کو؟“ اس نے ہوا میں بات اڑادی۔

”ایک ماں سے یہ پوچھنا حماقت ہے۔“ عارفہ سنجیدگی سے بولیں۔

”یہ ایک دم ایسی کیا بات ہوگی کہ سب فلاسفر بن گئے۔“

”بس کوئی اچھا رشتہ ہے تو آرہے ہیں۔“ عارفہ نے نظروں نظروں میں بیٹے کو ٹولا۔

”چلیں! اچھی بات ہے۔“ وہ چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔

”رمان! طاہرہ نے کوئی سوال نہیں کیا مگر میں سمجھ سکتی ہوں کہ اس کے لبوں کے اندر سوال دبا ہے۔“

”مثلاً.....؟“

”دعا کے لیے یقیناً پہلا خیال تو تمہارے لیے آتا ہے۔“ عارفہ نے کہا تو وہ منہ پھٹ، پھٹ ہی تو پڑا۔

”جی ہاں! دعا میرے نام کے اعلان کے ساتھ تو تشریف لائیں، ان کے گلے میں میرے نام کا تعویذ

ڈال کر اللہ نے بھیجا۔“

”بس کرو، ایسے استہزا اڑاتے ہیں کسی کا؟“ عارفہ نے دھیرے سے ڈانٹا۔

”اس میں مذاق والی کیا بات ہے، میں سامان بھجوا دوں گا۔“ وہ بہت کچھ سمجھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”رمان! انتہا بہت مشکل سوال ہے بلکہ ناممکن ہے۔“ عارفہ نے اس کے دل کے تار چھیڑ دیے۔ وہ

ایک ٹک ماں کو دیکھتا رہا پھر بولا۔

”امی! کچھ خاص ہی لوگوں سے ہوتی ہے محبت، ہر شخص کو تو دل سے پکارا نہیں جاتا، سورج کی کرنوں سے ہی اجالا ہوتا ہے، اب گھر میں چاند تو اتارا نہیں جاتا۔“ عارفہ بہت کچھ سمجھ گئیں۔ وہ لٹ اٹھا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا اور عارفہ سوچ کے سمندر میں ڈبکیاں کھانے لگیں۔

”نیناں۔“ ان کے نزدیک ایک مشکل اور ناممکن سوال تھا، پسند ہونے کے باوجود اس کے تصور سے بھی باپوسی ہونے لگتی تھی۔ ہر پل ہر لمحے رمان کی نگاہوں میں اس کا چہرہ دمکتا دیکھتی تھیں لیکن دل تھام کر رہ جاتی تھیں کیونکہ انہیں یہ حقیقت معلوم تھی کہ ریحان اپنے بھانجے سے زیادہ کسی کو اہمیت نہیں دیں گے۔ لہذا یہ خیال بھی خال تھا کہ نیناں کے بارے میں کچھ سوچا جائے مگر رمان یہ سب ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اسے جانے کیوں یہ سچائی تسلیم نہیں تھی۔ وہ نیناں کے لیے ہی خوش گمان تھا۔ عارفہ کو دعا سے کچھ لگاؤ اسی لیے تھا کہ دعا ان کی رسائی میں تھی۔ رمان کو جی جان سے چاہتی ہے، طاہرہ اور برکت اللہ رمان کو پسند کرتے ہیں مگر مسئلہ تو رمان کا تھا۔ وہ دعا کے لیے بالکل اس طرح نہیں سوچتا تھا۔ عارفہ کو طاہرہ کے سامنے رات بھی خاصی شرمندگی سی ہوئی تھی۔ طاہرہ نے رات دانستہ آکر آنے والے مہمانوں کے بارے میں بتایا تھا تو عارفہ ان کے لہجے کی حسرت محسوس کر کے چپ ہو گئیں۔ کہنے سننے کو تو کچھ تھا نہیں لہذا خاموشی بہترین حکمت عملی تھی۔ طاہرہ نے بھی بھابی کو زیادہ مشکل میں نہیں ڈالا کچھ نہ پوچھا اور نہ کوئی تند ہونے کا دباؤ ڈالا۔ ذکر کر کے چلی گئیں مگر کافی رات تک وہ کروٹیں بدلتی رہیں، دعا کے بارے میں سوچتی رہیں۔

☆☆☆

”گاڑی کے ہارن پر وہ کمرے سے باہر بھاگیں اور نیناں کے کمرے میں جا کر چھپ گئیں۔ ریحان سے ملنے سے دل نے نفی کر دی تو آندھی طوفان کے مانند کمرہ چھوڑ دیا۔ بوائے نے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا مگر چپ ہو گئیں۔ ریحان مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف گئے اور کمرے میں بکھری، الٹی پٹی چیزیں دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے۔ پورا کمرہ میدان جنگ کا منظر پیش کر رہا تھا۔

”بوا..... بوا!“

”ریحان آہستہ، بالکل والد صاحب کی طرح چلانے لگے ہو۔“ بوائے نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو ان کی نگاہوں کے تعاقب میں سارے کمرے کا حال دیکھ کر چپ ہو گئیں۔

”یہ دیکھ رہی ہیں، یہ کمرہ یہ یا صطبل.....؟“

”باہر آ جاؤ، میں ٹھیک کرانی ہوں۔“

”کیا ٹھیک کرانیں گی، رابعہ کی ذہنی حالت کا اندازہ کریں، کیا چاہیے اسے؟“

”شاید وہ کچھ جو تم نے چھپا رکھا ہے، دکھا کیوں نہیں دیتے؟“ بوائے نے بڑے تحمل سے کہا تو ان کو پتنگ لگ گئے۔

”وہ بیوی ہے، بیوی بن کر رہے، کچھ دیکھنے دکھانے کا وہم دماغ سے نکال دے۔“ وہ پھنکارتے ہوئے

باہر نکلے اور اس کی تلاش میں پاگلوں کی طرح پھرنے لگے۔ نیناں کا کمرہ جھٹکے سے کھولا تو وہ وہیں بڑے پرسکون انداز میں صوفے پر بیٹھی تھیں۔

”اچھا! اچھا طریقہ ہے شوہر کو خوش آمدید کہنے کا۔“ وہ سینے پر بازو باندھ کر دروازے سے ٹیک لگائے ہوئے بولے۔ وہ چپ رہیں۔

”رابعہ! کیا نکالنا چاہتی ہو؟ وہ ضبط نہ کر سکے۔

”مطلب کی بات کریں ریحان اختر۔“

”کمرے کی جو حالت بنائی ہے اسے چل کر دیکھو۔“

”میں نے حالت بنائی ہے، دیکھنے کی مجھے ضرورت نہیں۔“

”پھر کیا ڈھونڈ رہی تھیں؟“ وہ جڑے بھینچ کر ان کے بالکل قریب آ گئے۔

”وہی تمہارے سیاہ کر توت کے ثبوت، جو تم نے غائب کر دیے ہیں، جن کی وجہ سے مجھے تم سے نفرت ہو گئی ہے۔“ وہ غرائیں۔

”رابعہ! ریحان اختر سے نفرت اور دشمنی مہنگی پڑے گی، چلو اٹھو کمرے میں چلو۔“ رابعہ نے ہمیشہ کی طرح نفی کی اور ان کے مضبوط ہاتھ میں رابعہ کے بال جکڑے گئے تو وہ اور زیادہ مشتعل ہو گئیں۔

”جب تک اپنے گناہ کا اعتراف نہیں کریں گے، وہ ثبوت نہیں دیں گے، میری محبت آپ کو نہیں ملے گی۔“

”مجھے محبت لینا آتی ہے، ضدی ہوں بہت..... بہتر یہی ہے کہ ضد نہ کرو۔“ وہ مٹھی میں زیادہ سختی سے بال جکڑتے ہوئے بولے۔ عین اسی وقت نیناں کالج سے آ گئی، یہ صورت حال دیکھ کر وہ فحش سی ہو گئی۔ کپکپی سی طاری ہو گئی۔ ریحان اختر نے رابعہ کے بال چھوڑ دیے اور مسکرا کر بیٹی کی طرف بڑھے مگر وہ بھاگ کر باہر نکلی اور روتے ہوئے لان میں بھاگنے لگی۔ ریحان پیچھے بھاگے لیکن پھر پلٹ کر واپس آئے اور رابعہ کی کلائی پکڑ کر کھینچتے ہوئے اپنے کمرے میں لے آئے اور بیڈ پر ڈھکیل کر چلائے۔

”میری نیناں کی سانسوں میں زہرمت گھولو، میری بیٹی میرا سرمایہ ہے۔“

”کتنے کم ظرف ہو ریحان اختر! بیٹی سے اتنی محبت اور دوسروں کی بیٹی اتنی گھٹیا اور حقیر کہ۔“

”شٹ اپ! میری نیناں کو کسی سے ملانے کی جرات نہ کرنا۔“

”کیوں..... کیوں ریحان اختر؟“

”کیسی ماں ہو، بیٹی کو باپ سے خوف زدہ کرتی ہو۔“ وہ رخ موڑ کر لمبی آہ بھر کے بولے۔

”تم نیناں کے باپ نہیں ہو، وہ صرف میری بیٹی ہے۔“

”اپنی زبان کو لگام دو۔“ وہ گر بے تاب بوا کو ہی مداخلت کرنی پڑی۔

”جاؤ جا کر دیکھو لاڈلی بیٹی لان میں بیٹھی رو رہی ہے۔“

ان کے کہنے پر ریحان دیوانوں کی طرح باہر بھاگے۔

”رابعہ! تھوڑا انتظار کر لو، نیناں کی خاطر ہی سہی۔“ انہوں نے بڑے سلیقے سے کہا۔

”مجھے ریحان کی شکل دیکھتے ہی کچھ ہونے لگتا ہے۔“ رابعہ نے اعتراف کیا۔

”رابعہ بیٹی! ہو سکتا ہے کہ غلط فہمی ہو، وہم ہو گیا ہو، ریحان کے رات دن میرے سامنے گزر رہے ہیں۔“

باہر چلی گئی۔ رمان آوازیں دیتا رہ گیا مگر وہ رکی نہیں وہ کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ عارفہ اس کے لیے کھانا لے کر آگئیں۔

”اس کی بات سن لیتے تو آوازیں نہ دینی پڑتیں۔“ عارفہ نے سرزنش کی۔
 ”امی اوہ تو مہمانوں کے نہ آنے پر اداس ہے، غصہ مجھ پر نکال گئی۔“ اس نے صفائی پیش کی۔
 ”نہیں، بات یہ نہیں ہے۔“
 ”ہات کیا ہے؟“ اسے بھوک لگی تھی جلدی سے سالن پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بولا۔
 ”مہمان آئے تھے۔“

”مہمان آئے تھے..... تو کیا دعا پسند نہیں آئی انہیں؟“ لقمہ چباتے ہوئے پوچھا۔
 ”اس کی تو نوبت ہی نہیں آئی، دعا نے پہلے ہی انہیں کھری کھری سنا کر جانے کو کہہ دیا۔“
 ”کیا؟“ ہاتھ میں پکڑا نوالہ پلیٹ میں چھوٹ گیا۔
 ”اسی لیے کہتی ہوں کہ ابہام اور الجھن دور کر دو۔“ عارفہ بہت اپ سیٹ تھیں۔
 ”میں نے کون سی الجھن اور کیا ابہام پیدا کیا ہے؟“
 ”رمان! جس مرکز پر تمہاری نظریں جمی ہیں، وہ گنہگار ہے۔“
 ”اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میں دعا کو یقین دلا دوں۔“ وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”دعا اپنی بچی ہے، گھر میں ہی رہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“
 ”مجھے اعتراض ہے اوکے اب مجھے سونے دیں بہت تھکا ہوا ہوں۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ عارفہ نے مصلحت پسندی کے تحت خاموشی اختیار کی اور کھانے کے برتن سمیٹ کر چلی گئیں۔

☆☆☆

تھکن کے جس احساس کے ساتھ وہ گھر میں داخل ہوا تھا وہ جیسے کہیں پکھ لگا کر اڑ گئی تھی۔ وہ بیڈ پر سیدھا لیٹا نیم تاریک ماحول میں چھت گھور رہا تھا، جو بھی ہوا تھا اس کا ذمہ دار وہ نہیں تھا، اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دعا ایسا طرز عمل اختیار کرے گی۔ سب کو پریشان کرنے کا مجرم وہ نہیں تھا پھر بھی مضطرب تھا۔ نیند آنکھوں سے اوجھل تھی، رہ رہ کر طہارہ پھپھو اور برکت پھوپا کا خیال آ رہا تھا بظاہر نہ سہی لیکن کچھ تو قصور وار وہ اسی کو سمجھ رہے ہوں گے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے دعا کو سمجھائے محبت کسی ایسے شخص کو تلاش نہیں کرتی جس کے ساتھ رہا جائے، محبت تو ایسے شخص کو تلاش کرتی ہے جس کے بغیر نہ رہا جائے اور جس کے بغیر میں نہیں رہ سکتا، میں نہیں رہ سکوں گا وہ نیناں ہے۔“ اس نے خود کلامی کی تو ایک سکون سا اندر اتر گیا۔ احساس جرم سے نجات مل گئی۔ ذہنی کوفت سے چھٹکارا مل گیا۔

یہ تو سچ تھا کہ اسے دعا سے دوستوں جیسی محبت تھی، انیسیت تھی، اس سے لڑنا جھگڑنا، شرارت کرنا، چڑانا اچھا لگتا تھا مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں، اس سے آگے کی ساری دنیا ایک مرکز اور محور کے مانند صرف نیناں کا طواف کرتی تھی۔ جس کا نہ احساس نیناں کو ہوا تھا اور نہ اس نے اظہار کی کوشش کی تھی۔ اس کا یقین تھا کہ اس کے احساس کی گرمی اور جذباتوں کی سچائی نیناں کے دل میں خود بخود جاگے گی اور وہ اظہار کرے گی اپنے شبہی

”یہی تو آپ کی خوش فہمی ہے۔“ وہ بڑبڑائیں۔

”مان لیتی ہوں لیکن سمجھوتے کے سوا چارہ کوئی نہیں۔“

”سمجھوتا ہی ہے۔“ انہوں نے کمرے میں اپنے موجود ہونے کی طرف اشارہ کیا۔

”میں، کھانا لگواتی ہوں، ہاتھ منہ دھو کر باہر آ جاؤ۔“ بوائے بہت پیار سے ان کے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور چلی گئیں۔

☆☆☆

رات وہ بہت دیر سے گھر آیا۔ ابھی گاڑی پورچ میں لاک کر رہا تھا کہ رابی خالہ کا فون آ گیا۔ چلتے چلتے وہ بات کرنے لگا۔

”اوکے! کل شام کے بعد ہی وقت نکال سکوں گا۔“ کمرے میں داخل ہونے پر اس نے آخری جملہ ادا کیا اور موبائل آف کر کے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کر کے اسے اتار کے ڈریسنگ ٹیبل پر ڈالا، چینیج کرنے کے لیے واش روم جانے لگا تو یاد آیا کہ جوتے نہیں اتارے سو بیڈ کے کنارے پر ٹک کے جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔ اسی اثنا میں باہر قدموں کی آہٹ ابھری تاہم وہ پھر بھی تیزی سے چینیج کے لیے واش روم میں گھس گیا۔ صبح سے اتنی رات تک آدمی پیک ہو کے رہ جاتا ہے، حد درجہ تھکن اور شدید بھوک کے باوجود کپڑے تبدیل کرنا اس کی پختہ عادتوں میں سے ایک تھی۔ ہاتھ منہ دھو کر باہر نکلا تو کافی فریش ہو چکا تھا مگر دعا کو کمرے میں دیکھ کر چونکا پھر وال کلاک پر نگاہ ڈالی تو مزید ٹھٹکا۔

”ہیلو دعا! یہ رات کے بارہ بجے بھی نم جاگ رہی ہو، جانتا ہوں اس پرستان کے شہزادے کی تعریفیں سنانے کے لیے بے چین ہوگی۔ ویسے وہ کون.... گدھا ہے جو تم پر مر مٹا ہے۔“ وہ مخصوص انداز میں بولتا چلا گیا، وہ چپ رہی..... بالکل چپ..... نہ اس کی آنکھوں میں کوئی سوال تھا اور نہ لبوں پر جنبش..... تو وہ پھر سے ٹیپ ریکارڈر کے مانند چل پڑا۔

”ارے تمہارے ہونٹوں پر گوندھ لگا گئے ہیں کیا؟ ہوں! بہت بول رہی ہوں گی وہ برداشت نہیں کر سکے ہوں گے، اب سب رمان احمر تھوڑی ہوتے ہیں کہ تمہاری بک بک برداشت کریں۔“
 ”ہاں! اسی لیے یہ مٹھائی، یہ کیک، یہ سب کچھ تمہارے لیے ہے، کھاؤ۔“ اس نے میز پر رکھی ٹرے سے کوراٹھایا اور بولی تو وہ ششدر رہ گیا۔ سب چیزیں ان سچ تھیں۔

”اچھا! اب سمجھا مہمان نہیں آئے اس لیے چپ ہو، یا ر! یہ مہمان تو بہت بد تمیز تھے، میرا اتنا خرچہ کرا دیا اور آئے بھی نہیں، معلوم ہے پورے پندرہ سو روپے خرچ کیے تھے میں نے۔“ وہ پھر خود سے اسٹارٹ ہو گیا تو وہ جھلا اٹھی۔

”بس کرو، تمہیں پیسوں کی پڑی ہے۔“

”اوہ اسوری! تم فکر نہ کرو، وہ آ جائیں گے اور وہ نہ آئے تو کوئی بھی آ جائے گا۔ یہ چیزیں فریزر رکرو، اوون میں بہترین گرم ہو جائیں گی۔“ اس نے اور جلتی پرتیل ڈالا تو وہ بھٹ پڑی۔
 ”تم بے حس ہو، خود غرض ہو، تم سے سر ٹکرانے سے بہتر ہے دیوار سے سر پھوڑاؤں۔“ وہ یہ کہتے ہوئے

ہونٹوں سے، اپنے مین کٹوروں سے، گلابی رخساروں سے، سیاہ زلفوں سے، مرمریں بانہوں سے۔۔۔ تب جا کر محبت کی تلاش مکمل ہوگی۔ فی الحال تو وہ ایک طرفہ احساسات کی حدت میں پھسل رہا تھا، بالکل شاید دعا کی طرح جیسے وہ ایک طرفہ اس کے لیے بے ہاک جذبے اپنے دل میں پیدا کر چکی تھی۔ اس سے پوچھے بنا اس سے جانے بنا۔۔۔ شاید یہ بھی دل کی مجبوری اور بے بسی ہے کہ انسان بے اختیار ہی کسی کو چاہنے لگتا ہے، کوئی خود بخود صبر و قرار لوٹ کر لے جاتا ہے۔ یہ حال نیناں کے لیے اس کا تھا تو اس کے لیے دعا فاطمہ کا تھا۔

”رمان احمر! تمہیں دعا کو سمجھانا ہوگا، نادان لڑکی اور نہ کچھ کر دے۔“ گاڑی سے چھلانگ والا منظر سوچ کر ہی اسے جھرجھری سی آگئی اور وہ پریشان ہو کر روٹیں بدلنے لگا۔

☆☆☆

اپنے انگلیش کے نوٹس مکمل کر کے وہ کرسی سے اٹھی تو بوا اس کے لیے گرم دودھ کا گلاس لے آئیں۔ اس نے ہمیشہ کی طرح دودھ دیکھ کر برا سامنے بنایا۔

”بری بات دودھ نور ہے، اس کے لیے ایسے منہ نہیں بناتے۔“ انہوں نے کہا۔

”بوا! میرا آج سچ دل نہیں چاہ رہا۔“

”آج کیا خاص حاجت ہے؟“

”بابا آگئے ہیں۔“

”نہیں، ابھی نہیں آئے کوئی کام؟“ وہ وہیں بیٹھ گئیں۔

”مما کیلی ہیں۔“

”تو کیا ہوا؟ وہ گولی کھا کر سو گئی ہیں۔“

”بابا کو ذرا بھی پروا نہیں۔“ وہ دھکی ہو گئی۔

”نہیں، ریحان تمہاری ماما سے بہت محبت کرتے ہیں، تم پر جان بچھا کر رہے ہیں۔“

”یہ کیسی محبت ہے کہ ماما گولی کھا کر سوتی ہیں، بابا بال پکڑ کر پھینچتے ہیں۔“ نیناں اداس سی تھی۔

”جب تک شک اور بدگمانی کا بال نہیں نکلے گا تب تک شاید ایسا ہی رہے۔“

”بوا! آپ کو تو سب پتا ہے آپ ماما بابا کو کیسے کرادیں۔“

”نہیں نیناں، مجھے وہ نہیں معلوم جس کا ذکر تمہاری ماما کرتی ہیں۔“

”آپ کچھ تو کہیں بابا کو۔“

”نیناں! بیٹے! ذہن پر بوجھ نہیں ڈالتے۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ دودھ پی کر سو جاؤ۔“ انہوں نے کہا اور کمرے سے باہر آ گئیں۔ کچن کو مکمل طور پر صاف کرا کے اپنے کمرے میں آ گئیں تو فیضو آ گیا۔

”کیا بات ہے فیضو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”بوا! بارش ہو رہی ہے، باہر جھاڑو دینے والا آیا ہے، کوئی گرم کپڑا مانگ رہا ہے۔“ فیضو بولا۔

”اوہ! ہاں ہاں دے دو وہ چیک والا کبیل دے دو۔“ انہوں نے جلدی سے کہا۔

”ویسے بابا بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔“ فیضو ہلکی سی آواز میں کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ بوا نے فوراً خود کو دیوار گیر آئینے میں دیکھا تو سب حساب کتاب سمجھ میں آ گیا۔

”فیضو ٹھیک کہتا ہے، بابا بوڑھا ہو گیا ہوگا۔“ انہوں نے فیضو کی بات کا گویا جواب دیا۔ ماہ و سال کے حساب کتاب میں کافی وقت لگ ہی جاتا ہے۔ ان کی نظریں اپنے بوڑھے ابھری ہوئی رگوں والے ہاتھوں پر جم گئی تھیں۔ لحاف پر دونوں ہاتھ رکھے وہ بڑی دیر گزرے وقت کو ڈھونڈتی رہیں۔

باہر بارش کے پانی کا طوفانی شور تھا۔ برقی ہواؤں کا زور تھا کہ ہند کھڑکیاں کانپ کانپ جا رہی تھیں۔ اندر اتنی ٹھنڈ تھی تو یقیناً باہر بہت سردی ہوگی۔ شاید کبیل وہ بھی پرانا، سردی میں حرارت کا کام نہ کر سکے انہوں نے یہ سوچ کر آنکھیں موند لیں۔ اس بار بھی بارش خوب ہوئی تھی اور ہادل ٹوٹ کے برساتھا۔ گلیاں کو بچے جل تھل تھے۔ بند دروازوں کے شیشوں پر بوندوں نے ہواؤں سے لڑ کر دستک دی تھی۔

☆☆☆

مینہ کی بوجھار اور برقی ہواؤں کی وحشت ناک چیخوں میں خوف سے پھیلی پتلیوں میں جانے کہاں سے کالی، بد شکل چڑیلیں گھس آئی تھیں کہ کمرے کے نیم تاریک ماحول میں ہر شے تاک میں بول بول کر نازک طبیعت اور کالج سے اعصاب والی مہ جیس کو ہراساں کر رہی تھی۔ اس کی دونوں مٹھیوں میں دبیز مٹھلیں کبیل سختی سے دبا تھا۔ ایسے میں باہر گیٹ پر گاڑی کے ہارن نے مٹھیوں کی سختی کچھ کم کر دی تو بولی۔

”وہ، وہ سکھاں! راجا صاحب آگئے ہیں، دروازہ کھولو۔“

”بس کریں بی بی! اب تو ایسے ڈرنا چھوڑ دیں۔“ سکھاں نے یہ کہتے ہوئے گویا اسے یاد دلایا کہ وہ اب شادی شدہ ہے۔

”جلدی دروازہ کھولو، راجا صاحب جانے اتنی دیر سے کیوں آتے ہیں؟“ اس کے لہجے میں عجلت اور جھنجھلاہٹ دونوں کا تاثر موجود تھا۔

”یہ لیں، کھول دیا دروازہ۔“ سکھاں نے تیزی سے دروازہ کھول دیا، مگر راجا صاحب کچھ دیر گزرنے کے باوجود اندر نہیں آئے تو وہ بیڈ سے اچک اچک کر کھلے دروازے سے باہر دیکھنے لگی۔

”راجا صاحب کہاں رہ گئے؟“

”آجائیں گے، میں کھانا لگواتی ہوں۔“ سکھاں نے کہا پلٹنا ہی چاہتی تھی کہ راجا صاحب اسی کو پکارتے ہوئے چلے آئے۔

”سکھاں! سکھاں! کلینک کی چابیاں لاؤ جلدی سے۔“ انہوں نے نہ گلابی لباس میں ملبوس گلابی سی مہ جیس کو دیکھا اور نہ بات کی۔ سکھاں یا ہر چلی گئی۔

”راجا صاحب! کیا مسئلہ ہے، اتنی دیر سے میں ڈر رہی تھی۔“

”اوہ! یہ ڈرنے کی عمر ہے کیا۔ ڈارلنگ! اٹھو، آؤ میرے ساتھ۔“ انہوں نے باہر نکل کر سکھاں سے چابیوں کا گچھا لیتے ہوئے بہت پیار بھرے لہجے میں کہا۔

”سکھاں! میں نے ٹھیک نہیں کیا۔“

”بی بی! آپ نے ٹھیک کیا ہے پر راجا صاحب نے.....“ داشتہ جملہ سکھاں کے ہونٹوں میں دبا رہ گیا۔

”تو کہا کیوں نہیں، یہ بتایا کیوں نہیں؟“

”میں، میں کیسے کہہ سکتی تھی، میں آپ کی ملازمہ ہوں۔“ سکھاں نے دھیرے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے یاد دلایا تو وہ ایک ٹک سے دیکھتی رہی کچھ بولی نہیں۔ سکھاں کی طرف سے آنے والا جملہ اسے دکھی کر گیا جبکہ سکھاں نے ہلکے سے مسکرا کر اسے ڈھیر سا راحصلہ دیا۔ کبیل پیروں پر پھیلا کر وہ خود مضطرب سی باہر نکل گئی۔ اپنی بی بی کے حوالے سے پریشانی کا پہلا احساس اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھب گیا مگر ظاہر نہیں ہونے دیا۔

☆☆

باہر بارش کا طوفان تھم چکا تھا۔ صرف سروخ بستہ ہوا کا زور باقی تھا۔ کبیل کی نرم سی حرارت نا کافی لگ رہی تھی کہ وہ ہڑبڑا کے فرش پر کبیل میں دیکھی سکھاں کو دیکھ کر بولی۔

”سکھاں! سکھاں! باہر کون ہے؟“

”مگر راجا صاحب!“ وہ بھی باہر لپکی۔

”جان! مریضہ ہے اسے تمہاری توجہ چاہیے، جلدی آؤ۔“ وہ بولے۔

”اس وقت کیا مسئلہ ہے؟“ وہ الجھن کا شکار ہو گئی۔ تب سکھاں نے ہمت بندھائی۔

”بی بی! آپ چل کر دیکھ لو، صاحب غلط تو نہیں کہہ سکتے۔“

”مگر اس موسم میں، دیکھو لائٹ بھی نہیں ہے۔“ مہ جیس نے سکھاں کو جواب دیا جبکہ راجا صاحب آگے

چاچکے تھے۔

”چلو بی بی! چلو۔“ سکھاں نے اس کا ہاتھ تھام کر آگے قدم بڑھائے۔

”باہر بارش ہے۔“

”رکھیں، میں چھتری لے کر آتی ہوں۔“ سکھاں بھاگ کر اندر گئی اور چھتری لے آئی۔ چھتری کا لیور دبا کر اسے اور خود کو بارش سے بچانے کی کوشش کی۔ پورا لان کراس کر کے کلینک والا پورشن تھا۔ سر سے تو محفوظ رہیں البتہ پیر کچھ گیلے ہو گئے تھے۔

برآمدے میں دو دیو، بیکل مرد کھڑے تھے۔ ہلکے اندھیرے میں مہ جیس کو خوف سا محسوس ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی راجا صاحب کلینک سے باہر نکلے۔

”یہ کون لوگ ہیں راجا صاحب؟“ وہ منمنائی۔

”تمہاری پیشین گوئی کے لانے والے۔“ وہ نرمی سے بولے۔ وہ ان کی بات سن کر اندر داخل ہوئی تو ٹھنکی۔ ایک خوب صورت نوجوان لڑکی سکڑی کٹی پیشین گوئی پر بیٹھی تھی۔ موسم ہتی کے زرد سے ہالے میں اس کی آنکھوں میں بڑا گہرا اندھیرا تھا۔ ملگجی سی چادر میں اس کے بدن کی کپکپاہٹ اس نے اور سکھاں نے واضح محسوس کی۔

”جان! اب یہ تمہارے حوالے، جلدی بتا دینا اگر کوئی میڈیسن وغیرہ لانی ہوں۔ ہم گیسٹ روم میں ہیں۔“ راجا صاحب نے ہدایت اور تاکید کے درمیان کا فرق مٹا دیا اور باہر چلے گئے۔ ڈاکٹر جیس نے بے بس نگاہوں سے بند ٹیوب لائنس کو دیکھا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس سے نہ کوئی سوال کیا اور نہ کچھ پوچھا۔ سب سمجھ میں آ گیا اور وہ سب جان گئی۔

جونہی لائٹ آئی تو حکم راجا صاحب کی تعمیل شروع کر دی۔ سکھاں کے سہارے دو ڈھائی گھنٹوں کے بعد وہ انجان مریضہ کو بچانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کا سٹکن سے برا حال تھا۔ باہر لگی تو تقریباً تہجد کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ وضو کیا، اس لڑکی کی صحت اور سلامتی کی دعا کی جس کے بدن میں زہر پھیل چکا تھا اور اب جو وہاؤں کے اثرات میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اس کے کلینک میں لیٹی تھی۔ سکھاں نے چائے کا کپ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا اور اسی لمحے راجا صاحب نے ایک خاک کی بھاری سالفافہ بیڈ پر بالکل اس کے سامنے اچھا لایا۔

”یہ لو، تین گھنٹوں کی محنت کا پھل۔“ راجا صاحب نے بڑی خوشی اور سرشاری سے کہا۔

”پلیز راجا صاحب! اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دیں۔“ اس نے عجیب سے انداز میں منت کی۔ راجا صاحب سگار سے لطف اندوز ہوتے ہوئے واپس باہر چلے گئے۔

”دیکھتی ہوں۔“ سکھاں نے کہا اور باہر گئی کچھ دیر بعد آ کر بولی۔
 ”وہ جھوٹا تھا، لڑکی کا بوڑھا باپ، سردی سے کانپ رہا تھا، اس کے لیے گرم کپڑا مانگ رہا تھا۔“ سکھاں نے اٹے سیدھے جملوں میں بتایا۔

”وہ لڑکی تو ٹھیک ہے نا؟“ اسے ایک دم خیال آیا۔

”راجا صاحب کہاں ہیں؟ اسے دیکھو بہت سردی ہے۔“

”آپ چھوڑ دیں اسے، آرام کریں۔“ سکھاں جھنجھلا سی گئی۔

”اس کا بوڑھا باپ کہاں تھا؟“ اس نے ذہن پر زور ڈالا، رات ان دو آدمیوں کے علاوہ تو کوئی دکھائی

نہیں دیا تھا۔

”وہ گاڑی سے چپکا کھڑا تھا۔“

”کیا! لیکن تم نے بتایا کیوں نہیں؟“

”بی بی! صبح ہو رہی ہے رات کی بات بھول جائیں۔ بس میں نے جھوٹا کو کھیل دے دیا ہے کہ بوڑھے کو دے دو اور چائے بھی بنوا دی ہے، اس کو گرمی کی ضرورت تھی۔“ سکھاں یہ کہہ کر قالین سے اپنا گدانا کرنے لگی۔

”کیا مطلب؟“

”بی بی! اس کی بیٹی ٹھنڈی پڑ گئی ہے۔“ سکھاں نے انتہائی غیر معمولی دھیمے سے لہجے میں کہا تو منہ جبین کی آہ حلق میں گھٹ گئی۔

گاڑی کے نائز چرچرائے اور گیٹ بند ہونے کی آواز پر سکھاں نے جلدی سے اپنا کھیل بھی تہ کیا۔ اسے اندازہ تھا کہ راجا صاحب اب اندر آئیں گے۔ ایسا ہی ہوا وہ ہنستے مسکراتے آگے مگر منہ جبین چھلانگ مار کے ان سے دور بھاگی اور دروازے سے باہر نکلتی سکھاں کے بازوؤں میں جھول گئی۔

”سکھاں! وہ مر گئی، میں نے اسے مار دیا۔“

”اوہ سوٹ ہارٹ! اس کا وقت پورا ہو گیا تھا، دیکھو وہ نیلی پڑ چکی تھی، تم نے بچانے کی کوشش کی مگر وہ مار گئی۔“ راجا صاحب نے بڑی محبت سے اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر بیڈ تک لے جاتے ہوئے کہا تو ڈاکٹر منہ جبین پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

”راجا صاحب! میں ڈاکٹر ہوں، میں نے ایسا کام کیوں کیا؟“

”دیکھو! یہ دنیا ہے یہاں سب اپنا اپنا کام کرتے ہیں، وہ مریض تھی اور تم ڈاکٹر، تم نے کوشش کی مگر وہ مر گئی۔ ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوا، پورے پچاس ہزار کمائے ہیں تم نے۔“ ان کا اس قدر سرد جملہ سن کر سکھاں تیزی سے باہر نکل گئی اور منہ جبین کو اپنی سماعت پر یقین کرنے کے لیے بڑی دیر بھر پور کوشش کرنی پڑی ایسی کوشش باہر نکل کر سکھاں کو باورچی خانے کی دیوار سے لگ کر کرنی پڑی۔ بے اختیار پلکوں سے آنسو ٹوٹ پڑے۔ اپنی پیاری سی نازک سی بی بی کی حساس طبیعت کا خیال کر کے ہی وہ پریشان ہو گئی۔

”بی بی تو چیونٹی پر پاؤں پڑ جانے سے بھی رنجیدہ ہو جاتی تھی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ان کے علاج سے ایک لڑکی مر گئی یہ دکھ یہ صدمہ تو انہیں چاٹ جائے گا۔ راجا صاحب نے اچھا نہیں کیا، اس حالت میں انہیں تو بہت

خیال رکھنا چاہیے۔ اس صدمے سے کہیں برا اثر نہ پڑے۔ یا اللہ! میری بی بی اور بچے کی حفاظت کرنا۔“ اس کے ذل سے دعا نکلی۔ ”ورنہ بغیری بیگم صاحبہ اور آغا جی مجھے ہی الزام دیں گے۔ میں اپنا سب کچھ بی بی کے لیے چھوڑا ہے۔ اس گھر کی خوشی کے لیے۔“

☆☆☆

ہیڈ آفس کی اچانک کال پر اسے دو دن کے لیے لاہور جانا پڑا۔ جلدی جلدی میں وہ رابی خالہ سے رابطہ نہ کر سکا۔ واپسی پر امی سے ٹھیک ٹھاک جھاڑ پڑی۔

”غیر ضروری مصروفیت کا اظہار بہانہ بن جاتا ہے، معلوم ہے رابی نے کتنی بار فون کیا، نیناں کے سمسٹر ہونے والے ہیں، نہیں پڑھانا تو انکار کر دیتے۔“ عارفہ نے نان اسٹاپ سنائیں تو وہ سر کے بال نوچتے ہوئے بولا۔

”اوہ گاڈ! میری مصروفیت آپ کو بہانہ لگ رہی ہے، معلوم ہے نوکری کے مسائل کیا ہوتے ہیں؟ لوگ لائن میں لگے ہوتے ہیں ذرا موقع ملے تو اٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں۔“

”بس، بس سب بتا ہے مجھے۔“ وہ بگڑیں۔

”میں رابی خالہ سے خود بات کر لوں گا، آج شام کو جاؤں گا۔“ وہ بولا۔

”آج تو جانا ہی ہے، نیناں کی سالگرہ ہے۔“ انہوں نے جل کر کہا۔

”کیا! آج نیناں کی سالگرہ ہے؟“ اسے نامعلوم سی خوشی ہوئی۔

”جی ہاں! ٹھیک چھ بجے، دائیں بائیں نہ ہو جانا۔“ انہوں نے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔ وہ نیناں کے لیے گفٹ کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا کہ دعا آگئی اسے دیکھ کر وہ ہولے سے مسکرایا۔

”آؤ، شکل پر بارہ کیوں بچ رہے ہیں؟“

”اب یہ شکل ہے ہی ایسی تو کیا کروں؟“ وہ جل کر بولی۔

”نہیں، خیر شکل تو مناسب ہی ہے۔“ وہ شرارتا غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہوں! مناسب۔“

”اچھی خاصی مناسب۔“ اس نے کچھ اضافہ کیا۔

”کیوں جھوٹ بولتے ہو؟ اگر اچھی خاصی مناسب ہوتی تو۔“

”تو مس ورلڈ بن جاتیں؟“ اس نے جملہ اچک کر چھیڑا۔

”مس ورلڈ تو ایک ہی ہے۔“ اس کے لہجے میں اچھا خاصا طنز تھا۔

”اونہ! مس ورلڈ تو دنیا کے لیے ہوتی ہے، وہ تو دنیاں ہے۔“ وہ اپنی ترنگ میں کہہ گیا۔ دعا کے دل میں کرچیاں سی ٹوٹ گئیں۔

”کیا شرط ہے کہ وہ بھی تمہیں چاہے؟“

”کوئی شرط نہیں، کوئی ضروری نہیں، انسان کو اپنے جذبات پر اختیار ہوتا ہے بس۔“ وہ بولا تو وہ بھیگے لہجے پر ضبط نہ کر سکی۔

”ہاں! وہ تو چاند ہے جسے لوگ شوق سے دیکھتے ہیں، ہماری تو قسمت تاروں جیسی ہے۔ لوگ اپنی دعا مانگنے کے لیے ہمارے ٹوٹے کا انتظار کرتے ہیں۔“

”یہ... یہ کیا کہا تم نے، خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔“ وہ دکھی ہو گیا۔

”اور کیا کہوں، اماں مجھ سے اس دن سے ناراض ہیں، ابا بھی خفا خفا ہیں۔“

”وہ حرکت تمہاری ہے تو نا قابل معافی، میں سفارش کر سکتا ہوں۔“ وہ بن کر بولا۔

”رمان! میں اتنی آسانی سے اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوں گی، پہلا حق میرا ہے۔“ وہ ایک دم ہی زور سے چلائی تو رمان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”شام کو سا لنگرہ میں چلو گی؟“ اس نے موضوع ہی بدل دیا۔

”نہیں، ہر گز ہیں۔“

”ظاہر ہے تمہارا دل تو نہیں چاہے گا لیکن دماغ سے کام لو نا دان لڑکی۔“

”اس کا مقام ہی کیا جو کوئی حیثیت ہی نہ رکھتا ہو۔“ وہ یہ کہہ کر چل دی تو وہ زور سے بولا۔

”شام کو تیار رہنا، ہم نے جانا ہے۔“ وہ تو بنا جواب دیے چلی گئی... لیکن کچھ ہی دیر بعد جب وہ کمرے سے باہر نکلا تو طاہرہ پھپھو نے کڑے لفظوں میں کہا۔

”دعا نہیں جائے گی۔“

”دعا جائے گی۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”کوئی تماشا کرنے کی ضرورت نہیں، اس نے پہلے ہی نادانی کر کے ہمارا نام روشن کیا ہے۔“ طاہرہ پھپھو کا غصہ ظاہر ہو گیا۔

”کیا تو جیہہ ہے یہ کہ رشتے مشروط کر دیے جائیں، دعا میری کزن ہے، وہ کیوں نہیں جائے گی۔“ وہ بھی حد درجہ ضدی پن کا مظاہرہ کرنے لگا۔

رمان! کیوں پھپھو سے الجھ رہے ہو؟“

”الجھ آپ لوگ رہے ہیں، دعا ضرور جائے گی۔“ اس نے اپنی ضدی اڑیل فطرت کے مطابق کہا۔

”رمان! دعا کو اور امتحان میں مت ڈالو۔“

”فی الحال کچھ اور نہیں، دعا کو میں لے کر جاؤں گا۔“ وہ جانے حواس میں نہیں رہا تھا ایک ہی بات پر اڑ گیا۔ اس کی اس فطرت سے پھپھو اور ماں دونوں واقف تھیں۔ اس لیے خاموش ہو گئیں۔ وہ اٹھ کر باہر گیا تو عارفہ نے طاہرہ کو تسلی آمیز اشارہ سا کیا۔ وہ نیم رضامندی ہو کر چلی گئیں لیکن عارفہ کو اضطراب سا لاحق رہا۔

رمان کی اس ضد اور تکرار کو وہ کوئی بھی معنی نہیں پہناسکیں۔

ریحان اختر کی لائی ہوئی ساڑی نظر انداز کر کے ساری توجہ ٹی وی اسکرین پر کر کے اپنی ناپسندیدگی اور لائق کا اظہار کیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم یہ ساڑی نہیں پہنوں گی؟“ انہوں نے خاصے تحمل سے پوچھا۔

”کوئی بھی معنی دے دیں۔“ سرسری جواب دیا گیا۔

”معنی اور مفہوم تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”ریحان! میرا داغ خراب مت کریں، جائیں جو مہمانوں کا میلہ لگا رہے ہیں اس کے انتظامات دیکھیں۔“

”رابعہ! نیناں کی سالگرہ کوئی میلہ نہیں ہے۔“

”چلیں یونہی سہی۔“

”پھر یہ ساڑی پہن کر جلدی تیار ہو جاؤ۔“ اب کی دفعہ لہجے میں تحکم سا آ گیا۔

”مجھے آپ کی مرضی سے نہیں جینا، یہ حق آپ کھو چکے ہیں۔“ وہ حد درجہ بیزاری سے بولیں۔

”اور میری مرضی کے بغیر تم مجھے نہیں سکتیں، مجھ سے ضد تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔“

”ڈر رہے ہیں یاد دھمکی دے رہے ہیں بزدلوں کی طرح۔“

”رابعہ! اگر تم میری محبت نہ ہوتیں تو میں اور طرح جواب دیتا لیکن کیا کروں میری محبت سے بڑھ کر تم میری نیناں کی ماں ہو۔“

”بس کریں، یہ نیناں کی ماں والی تکرار..... جو تم نے آپ نے نیناں کی ماں کو دیا ہے وہ بہت کافی ہے میرے لیے۔“ وہ چیخیں۔

”تمہیں تماشا لگانا ہے، بیٹی کی خوشی خراب کرنی ہے۔“

”اس لیے خاموش رہیں، تقریب میں ریحان اختر کی بیوی نے نہیں، نیناں کی ماں نے شریک ہونا ہے۔“

”دیکھو! یہ ساڑی بڑی چاہ سے لایا ہوں، یہ پہن لو دیر ہو رہی ہے۔“ انہوں نے آخری بار سمجھانے والا انداز اختیار کیا۔

”مجھے ساڑی پسند نہیں ہے۔“

”اس پر ویسے کے پہلو میں ساڑی پہن کر لگی کھڑی ہو، یاد نہیں۔“ ایک دم ہی ریحان اختر سے اڑدھا باہر نکل آیا اور پھنکارا..... وہ حیرت زدہ رہ گئیں۔

”وہ ڈرامے کا کریکٹر تھا۔“

”یہاں بھی ڈرامے کا کریکٹر ہی سمجھ لو۔“

”ریحان! مجھے بیزار مت کریں ورنہ میں کمرے میں خود کو بند کر لوں گی۔“

”اب یہ نالک نہیں چلے گا۔“ وہ غرائے۔

”تو مت ستائیں۔“

”میری بات سمجھ جاؤ۔“ انہوں نے جھٹکے سے رابعہ کی کلائی تھام کر کہا۔

”ریحان! میں آپ کو سمجھ چکی ہوں اور کیا سمجھوں گی۔“ وہ کلائی چھڑانے کی کوشش کے ساتھ بولیں۔

”رابعہ! تم خوش قسمت ہو، میری بیٹی کا صدقہ ہے کہ تمہاری یہ حرکت میں برداشت کر رہا ہوں۔ مرو

اس کمرے میں، مت آنا باہر۔“ وہ شدید اشتعال میں بیڈ پر دھکا دے کر چلے گئے۔ ان کا سر بیڈ کی پشت سے

ٹکرایا تو درد سے ایک آہ ان کے منہ سے نکلی۔ نیناں تیار ہو کر کمرے میں آئی تو انہیں سر تھامے دیکھا۔

”مما! کیا ہوا؟“

”کچھ، کچھ نہیں.....“

”آپ تیار نہیں ہوئیں، واؤ! کتنی خوب صورت ساڑی ہے۔“ نیناں کی نظر ایک طرف پڑی ہوئی گرین

شیفون کی ساڑی پر پڑی۔

”بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ انہوں نے نالا مگر وہ ٹلی نہیں۔

”مما! یہ آپ پر بہت سچے گی، جلدی تیار ہو جائیں سب آنے والے ہیں۔“

”نیناں! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں کچھ دیر کے لیے آ جاؤں گی۔“

”تو یہ پہنیں نا، پلیز۔“

”مجھے یہ نہیں پہننی۔“ انہیں ضدی آ گئی۔

”کیوں..... کیوں؟“ وہ مصر ہو گئی۔

”یہ جو لایا ہے اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔“

”آپ میری خاطر پہن لیں پلیز ممما.....“ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے تو وہ بے بس

ہو گئیں۔

”او کے! آپ چلو، میں تیار ہو کر آتی ہوں۔“

”مائی سوئٹ ممما۔“ اس نے بے اختیار ماں کے گال چوم لیے۔ خوشی سے باہر نکلی اور اپنے کمرے کا رخ

کیا۔ کمرے میں طلال اس کی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا آئینے میں اپنا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے اچھا نہیں

لگا۔

”طلال بھائی! یہ کیا بد تہذیبی ہے؟“

”کیا؟ شیشے میں خود کو دیکھنا یا تمہارے شیشے میں خود کو دیکھنا۔“ وہ خاصی بے تکلفی سے بولا۔

”کسی کے کمرے میں بنا اجازت آنا ہی بری بات ہے۔“ وہ ہکلائی۔

”چڑیا! تم کسی تو نہیں ہو۔“ عالم شوق میں گہری لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ جائیں فوراً۔“ اس نے جرات اختیار کی۔

”میں دراصل یہ پوچھنے آیا تھا کہ تحفے میں کیا لوگی؟“ وہ نرمی سے بولا۔

”کچھ نہیں۔“

”یو ایسے تمہارے لائق کچھ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا، تم میرے ساتھ چلو۔“

کہا۔ اس نے نیناں کا بازو چھوڑ دیا وہ لرزتی کانپتی اندر بھاگ گئی جبکہ رابعہ نے آگے ہو کر طلال کو تنبیہ کی۔
 ”میری نیناں کے لیے اپنی آزادی کا غلط استعمال مت کیا کرو۔“
 ”ہامی، آپ بھول رہی ہیں.....“

”طلال! اجاؤ آپ کے دوست آپ کو مس کر رہے ہیں انہیں کھانا کھلاؤ۔“ ریحان اختر نے دبی دبی سختی سے طلال کو کہا۔ وہ غصے میں چلا گیا تو ریحان اختر نے مسکرا کر رمان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بوانے نرمی سے کہا۔
 ”طلال دل کا برا نہیں ہے۔“ ریحان اختر نے بوا کی تائید میں گردن ہلائی۔
 ”ریحان میاں! اب اجازت دو۔“ زیتون بیگم نے کہا۔

”اوکے ریحان انکل، اللہ حافظ۔“ رمان نے ان سے مصافحہ کیا اور واپسی کے لیے قدم اٹھائے۔
 زیتون بیگم اپنے ڈرائیور کے ساتھ آئی تھیں۔ عارفہ کو انہوں نے ساتھ چلنے کو کہا تو رمان تنہا گاڑی نکال لایا۔
 طبیعت عجیب بوجھل بوجھل سی ہو گئی تھی۔ غیر متوقع ہلکی سی بد مزگی نے ڈسٹرب کر دیا تھا۔ پہلے گھر سے دعا کے ساتھ نہ چلنے پر شدید غصہ آیا تھا اور اب یہ واقعہ..... مضحک سا گاڑی ڈرائیور کے گھر پہنچا۔

☆☆☆

بوانے سب تحائف نیناں کے کمرے میں فیضو سے کہہ کر بھجوا دیے تھے مگر نیناں گم صم سی بیٹھی صرف انگلی میں جگمگاتی انگلی کو دیکھ رہی تھی جس پر اس کا نام کندہ تھا۔ بابا نے اس کا ہاتھ چوم کر تحفہ دیا تھا۔
 ”بابا! میرے بابا کہاں آپ سے کچھ غلط ہو گیا، یہ محبت ثبوت ہے آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں مگر ماما سے آپ کا سلوک اظہار ہے کہ آپ نے ماما کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے۔“ وہ ریحان اختر سے مخاطب تھی، بوا اور رابعہ ایک ساتھ اس کے پاس آئیں تو سب کے سب بند ڈبے دیکھ کر رابعہ نے پیار بھری ڈانٹ پلائی۔

”یہ کیا رونی صورت بنا رکھی ہے اور یہ تحفے کھول کر بھی نہیں دیکھے؟“
 ”یہ بابا کے تحفے کو دیکھ رہی تھی۔“ وہ دھیرے سے ہاتھ رابعہ کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔
 ”کوئی انوکھی بات نہیں ہے، بہت پیسہ ہے ریحان اختر کے پاس۔“ وہ زبان کی کڑواہٹ کنٹرول نہ کر سکیں۔

”ماما! بات پیسے کی نہیں ہے تحفہ کس قدر خوب صورت ہے، یہ دیکھیں۔“ نیناں نے پہلی مرتبہ باپ کی وکالت کی تو رابعہ نے زہر خندہ نگاہوں سے اس کے ہاتھ کو دیکھا اور پھر بولیں۔
 ”جانتی ہوں میں آپ کا نام نہاد باپ بہت باذوق ہے کہیں بھی کسی پر بھی پیسہ اور ذوق نچھاور کر سکتا ہے۔“

”اوہو رابعہ! بچی کو تو نہ الجھاؤ، اس کا دل رکھنے کو تعریف کر دو۔“ بوا کو آخر کار مداخلت کرنی پڑی۔
 ”نہیں بول سکتی بوا میں ایسا جھوٹ۔“

”باپ بیٹی کا معاملہ ہے، سچ کہہ رہی ہے میری گڑیا بہت خوب صورت انگلی تھی ہے۔“ بوانے نیناں کا

”مجھے کچھ نہیں چاہیے، بس۔“

”ویسے تو یہ دل، جان سب تم پر فدا ہیں مگر رسم دنیا بھی تو ہے۔“ وہ مسکرایا تو وہ خائف سی اور دور ہو کر کھڑی ہو گئی۔

”پلیز! آپ جائیں، مجھے تیار ہونا ہے۔“

”کتنی خوب صورت تو لگ رہی ہو اور کیا تیاری کرنی ہے۔“ اس نے سر تا پا پر شوق نگاہوں سے دیکھا تو وہ گڑبڑ اسی گئی۔ عین اسی وقت اس کی جیب میں موجود موبائل فون بج اٹھا، وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ کمرے سے بھاگ نکلی۔

☆☆☆

ایک کٹنے کے بعد کھانا لگنے کا اعلان ہو گیا۔ رابعہ بچ بچا کر وہاں سے جانا چاہتی تھیں مگر رمان نے کان میں سرگوشی کر کے روک لیا۔
 ”رابی خالہ! پلیز ہمارے ساتھ رہیں۔“ وہ رک گئیں۔ تو رمان کو بہت خوشی محسوس ہوئی۔ ریحان اختر نے یہ بات جانچ کر رمان کا شکریہ ادا کیا۔
 ”تھینک یو!“

”فاروہاٹ۔“ وہ نہ سمجھا۔

”رابعہ کو یہاں روکنے کا۔“ انہوں نے بے باکی سے کہہ دیا۔

”ارے نہیں..... کوئی اور بات تھی، رابی خالہ تو یہیں ہیں۔“

”رابعہ! رمان اچھا لڑکا ہے۔“ انہوں نے بے ساختہ ہی سب کے سامنے کہہ دیا۔ عارفہ کو خاصی حیرت ہوئی، زیتون بیگم نے بھی ان کے جملے پر غور کیا۔

”سن لیا سب نے۔“ رمان نے خاصی شوخی سے نیناں کو دیکھتے ہوئے کہا مگر نیناں تو کوئی بھی تاثر نہ دے سکی۔ تبھی وہ آگے بڑھا اور اس کے کان میں چینا۔

”سنا تم نے..... تمہارے بابا نے میری تعریف کی ہے۔“ نیناں اس غیر متوقع حرکت پر پریشان ہو کر بھاگی تو کچھ فاصلے پر کرسی سے ٹکرا کر طلال پر جا گری۔ طلال کو رمان کی حرکت بھڑکا گئی۔

”یہ کیا طریقہ ہے مسٹر؟“ رمان کچھ نہ سمجھا۔

”کیوں ڈرایا ہے نیناں کو؟“ طلال کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

”ڈرتی تو وہ آپ سے ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”یہ کس نے کہا؟“

”نیناں کے چہرے پر یہ کہانی لکھی ہے۔“ رمان نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

”شٹ آپ۔“ وہ گرجا۔

”نیناں! بتاؤ تم اس سے ڈرتی ہو؟“ رمان نے نیناں کا بازو پکڑ کے اس سے پوچھا۔

”کیا طوفان کھڑا کر دیا ہے، چھڑو نیناں کا بازو۔“ عارفہ نے آگے بڑھ کر بات بگڑنے کے ڈر سے

ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر کہا اور اس کی کمر کے پیچھے سہارا دے کر بیٹھ گئیں۔

”ماں کا تحفہ کھولنا بھی گوارا نہ نہیں کیا۔“

”ارے بھی نیناں! یہ تو حد کردی سب تحفے کھولو ہمارے سامنے..... پہلے ماما کا پھر ہمارا، بڑی امی کا، بڑی خالہ کا بعد میں دوسروں کے۔“ بوانے بہت دلا رے کہا تو نیناں مسکرا دی۔ سچ مچ سب سے پہلے ماما کا گفٹ کھولا تو نازک سی رسٹ واپچ دیکھ کر کھل اٹھی۔

”پسند آیا؟“ رابعہ نے پوچھا تو وہ ان سے لپٹ گئی۔

”اب بوا کی باری ہے۔“ اس نے خود سے فیصلہ کیا اور اپنا چہرہ بوا کے سامنے کر دیا۔ ہمیشہ کی طرح بوا نے پیشانی چوم کر دعا دی۔ یہ تحفہ اسے بہت پیارا تھا۔

پھر چند ہی منٹ میں ڈھیر ساری چیزیں اس کے سامنے جمع ہو گئیں۔ پرفیوم، شال، سوٹ، میک اپ کٹ، سویٹر اور جانے کیا کیا مگر طلال کے لفافے سے دس ہزار کا چیک اسے پسند نہیں آیا۔ رابعہ نے نرمی سے رکھنے کا اشارہ کیا۔ سب سے آخر میں بڑا سا ڈبا کھولا گیا جس میں ڈھیر ساری ردی بھر کے وزنی کرنے کے بعد ہنستی مسکراتی اپنی تصویر رکھ کر تحفہ پیش کیا گیا تھا۔

”شریر کہیں کا۔“ رابعہ رمان کی تصویر دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

”یہ تحفہ ہے؟“ نیناں نے معصومیت سے پوچھا۔

”میری گڑیا اصل تحفہ تو یہی ہے سنبھال کر رکھو۔“ بوانے بھی شوق سے کہا تو اسے اچھا نہیں لگا۔

”ہونہ! یہ میں واپس کر دوں گی۔“

”تحفہ پسند نہیں آیا تو فون کر کے مطلع فرمائیں۔“ رابعہ نے تصویر کی پشت پر تحریر شدہ جملہ پڑھا اور اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیر کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

”بوا! یہ کیا بکواس ہے؟“ وہ جھنجھلائی۔

”چلو تصویر اچھی ہے سنبھال کر رکھ لو، کہہ دینا۔“ بوانے کہا۔

”میں ابھی فون کر کے کہتی ہوں۔“

”کسے فون کرنا ہے؟“ اچانک طلال نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا تو وہ بوکھلا سی گئی۔ الفاظ جیسے ساتھ چھوڑ گئے۔

☆☆☆

رمان کو مضحک طبیعت کے باوجود شدت اور بے چینی سے نیناں کے فون کا انتظار تھا مگر فون گہری گہری خاموشی کی طرح خاموش تھا..... پیاس سی محسوس ہوئی تو کمرے سے باہر نکل کر کچن کا رخ کیا..... وہ فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کے باہر نکلا تو دعا کو دیکھ کر جلدی سے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون پر وقت دیکھ کر حیرت سے بولا۔

”دعا! رات کے دو بج رہے ہیں اور تم جاگ رہی ہو؟“

”رمان، رات کے دو بج رہے ہیں اور تم جاگ رہے ہو؟“ دعا نے ہو بہو اس کی نقل اتاری..... وہ ٹی

وی لاؤنچ کی طرف چلتے ہوئے بولا۔

”مجھے ضروری فون کا انتظار ہے۔“

”اندازہ ہے مجھے، کتنی مضبوطی سے موبائل ہاتھ میں قید ہے۔“

”اچھا! فی الحال سر نہ کھاؤ، اور جا کر سو جاؤ۔“ غٹا غٹ بوتل سے پانی پی کر وہ بولا۔

”مجھے نیند نہیں آرہی۔“

”دعا! یہ مجھے بتانے کا فائدہ، میں اب تمہیں لوری دے کر سنانے والا نہیں۔“ شریر لہجے میں کہہ دیا تو دعا جل بھن گئی۔

”تم انتظار کے گیت گاسکتے ہو مگر کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”بد دعا دے رہی ہو؟“

”حقیقت بتا رہی ہوں۔“

”قارگا ڈسک! میں ڈسٹرب ہوں، جاؤ پلیز۔“ وہ ایکدم ہی سنجیدہ ہو گیا، تو وہ پٹ پٹ کرتی چلی گئی اور وہ جھنجھلایا ہوا سا کمرے میں آ گیا..... فون بیڈ پر اچھالا..... پھر کچھ سوچا اور خود نیناں کا نمبر ملا لیا مگر مسلسل چھ سات مرتبہ ملانے کے بعد بھی فون انڈینڈ نہیں ہوا تو اس نے فون آف کر کے خود کو بستر پر گرالیا۔ مگر رات بھر کچھ سوئے کچھ جاگے کا سا احساس رہا۔ غفلت کی نیند کو سوں دور رہی..... آنکھ کھلتی تو چھت گھورتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنے لگتا۔

”یا اللہ! جیسے رات کی تاریکیوں میں چاند جگمگاتا ہے..... بس کچھ ایسا ہی عالم ہوتا ہے جب کوئی اپنا یاد آتا ہے..... رات ان یادوں میں گزر جاتی ہے، مجھے کوئی یاد آرہا ہے بہاروں جیسا..... نسیم صبح کے جھونکوں کے مانند جو مجھے چھو کر گزر رہا ہے..... مجھے بے قرار کر رہا ہے۔ یہ عالم جنوں کیوں آج کی شب طاری ہے مجھ پر..... اے میرے رب! محوں میں قید کر دے صدیوں کی چاہتیں، حسرت سی رہنے لگی ہے کہ وہ بھی میری تمنا کرے..... مجھے یاد کرے..... میں اس کے لیے حرف لازم بنوں یا دعا ہو جاؤں..... کاش! اس کے نازک ہونٹوں سے میرا نام ادا ہو جائے، اس کی شوخ اور سہمی گہری نگاہوں میں، میرا عکس ٹھہر جائے۔“ وہ بہت سے سرکتے لمحات میں صرف اسی کو سوچتا رہا۔

یہ شاید آج کے واقعے کا اثر تھا کہ وہ ذہنی خلفشار کا شکار ہو کر واضح طور پر نیناں کو یاد کر رہا تھا..... اس سے پہلے کبھی ایسی بے قراری کا سامنا نہیں کیا تھا..... پھر دل کو کیوں یقین سا تھا کہ وہ گفٹ کھول کر تصویر دیکھتے ہی مسکرائے گی شرمائے گی اور دھڑکتے دل کے ساتھ فون کر کے کہے گی۔

”تحفہ پسند آیا۔“

مگر رات کے آخری پہر تک یہ خوش گمانی ہی رہی..... ایسا نہ ہوا..... اپنے آپ سے سوال جواب کرتے جانے کس لمحے آنکھیں مند گئیں اور وہ سو گیا۔

☆☆☆

وہ نہا کر واش روم سے باہر نکلتے تو انہیں سویا دیکھ کر پیشانی پر ہزار ہا سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

”رابعہ!“ وہ پوری قوت سے چلائے..... تو وہ ہولے سے کسمائیں لیکن آواز کی گونج سن کر بوا کمرے میں آگئیں..... ریحان نے بیزاری سے انہیں دیکھا اور پوچھا۔

”اتنی پریشان کیوں ہو جاتی ہیں اس کے لیے؟“

”کیونکہ یہ اس گھر کی عزت ہیں، آپ کی بیوی ہیں۔“ وہ خاصے تحمل سے بولیں۔

”ہونہہ! اسی لیے اس گھر کی اور شوہر کی عزت مٹی میں مل رہی ہے۔“

”اس کا ذمہ دار کون ہے؟“ وہ بولیں۔

”آپ بھی مجھے ہی ذمے دار کہیں گی، سمجھ میں نہیں آتا کہ ماں جی کے ساتھ آئی تھیں یا رابعہ کے ساتھ۔“ وہ بہت طنز یہ کہہ گئے..... بوا کو بہت دکھ ہوا۔

”صرف اپنی بد قسمتی کے ساتھ آئی تھی مگر پھر اپنی بی بی کی بد قسمتی کے ساتھ رشتہ نبھایا۔“ وہ جس طرح بولیں، ریحان اختر کو شرمندگی سی ہوئی لیکن اختلاف بھی ہوا جو کہ اکثر انہیں ہو جاتا تھا۔

”گو یا آپ کی بی بی بھی اس گھر میں بد قسمت رہیں اور رابعہ بھی۔“

”ریحان! بہت معمولی سے فرق کے ساتھ۔“ وہ یہ کہہ کر جانے لگیں تو وہ بولے۔

”میرے بابا تو ماں جی سے بہت محبت کرتے تھے۔ ماں جی تو ایسے نہیں رہتی تھیں۔“

”ہاں! تمہاری محبت سے ذرا سی مختلف، باقی بچے شعور کو پہنچ کر سمجھوتا کرنے والی ماں کو ہی دیکھتے ہیں۔“

”کیا مطلب ہے؟“

”چھوڑو، ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

”تو اٹھائیں اپنی لاڈلی کو۔“ ٹائی کی ٹاٹ درست کرتے ہوئے وہ بولے۔

”اے سونے دو، دواؤں کے اثر کے مطابق وقت پر ہی اٹھتی ہے۔“

”تو بند کرائیں دوائیں.....“ وہ چلائے۔

”ریحان! دھیرے بولا کرو، ساتھ کے کمرے میں جوان بیٹی ہوتی ہے۔“ وہ بہت نرمی سے کہہ کر چلی گئیں تو وہ رابعہ پر برس پڑے۔

”رابعہ! رابعہ!“

”اونہہ.....“ وہ بمشکل بول پائیں، آنکھیں تو بند ہی رہیں۔

”مجھے اپنے گھر میں زندہ رابعہ چاہیے.....“ انہوں نے رابعہ کی گردن میں سختی سے ہاتھ ڈال کر جھٹکے سے چہرہ اوپر کرتے ہوئے کہا۔

”تو قتل کیوں کیا رابعہ کو؟“ ہاتھ کے دباؤ کو گردن پر محسوس کر کے وہ درد سے بولیں اور آنکھیں کھول کر سوال کیا۔

”یہی تو میں کر نہیں سکتا کیونکہ تم میری غیباں کی ماں ہو۔“ وہ گردن سے ہاتھ نکال کر بولے۔

”ہونہہ! بس اس لیے، بیوی کے اعتماد اور اعتبار کا قتل تو کر ہی چکے ہو۔“

”رابعہ! تم ذہنی بیماری کا شکار ہو۔“ وہ غصے سے کہہ کر اپنا بریف کیس اٹھا کر باہر نکل گئے۔

اور ان میں جیسے چار سو چالیس کی برقی رو دوڑ گئی..... ناتواں سے جسم سے آہنی شرارے نکلنے لگے.....

الہاریوں کی، درازوں کی ایک ایک چیز کمرے میں نکال پھینکی۔

”میں ذہنی مریض ہوں اور تم گھناؤنے عزت دار ہو، تمہاری شرافت کا یہ ثبوت ہی کافی ہے ریحان اختر!“ وہ چلاتی رہیں لیکن وہاں کچھ ایسا تھا ہی نہیں..... وہ ثبوت تو کسی پرانی قبر میں دبا دیا گیا تھا۔ تھک کے فرش پر پھیلے کپڑوں اور دوسری چیزوں کو ویسا ہی چھوڑ کے جلتے ذہن کو سکون دینے کے لیے واش روم میں گھس گئیں.....

بوانے دروازے کے باہر سے کمرے کے اندر کی بے ترتیبی سے رابعہ کے اندر کے ہیجان کا اندازہ کیا اور دکھ سے ایک طرف ہو گئیں۔

☆☆☆

مہ جبین کی زندگی میں ہر روز پیسے کا اضافہ ہوتا رہا..... راجا صاحب دور ہوتے گئے..... وہ اپنے میسج سے مجرم بننے پر آنسو بہا کر، خاموش رہ کر احتجاج کرتی لیکن راجا صاحب نے کلینک سے چھوٹا سا اسپتال بنا کر اس کی دیرینہ آرزو ضرور پوری کی لیکن اسے، ہمدردی سی مہ جبین کو مار ڈالا۔ اپنی کوکھ میں ممتا کا احساس رکھتے ہوئے جب راجا صاحب کی ذیل کے مطابق کوئی کوکھ خالی کرتی تو اس کے بعد گھنٹوں تکے میں منہ دے کر روتی..... اسے شام سے وحشت ہونے لگی تھی۔ راجا صاحب زبان کی مٹھاس اور نرمی سے اسے بہلانے کے لاکھ جتن کرتے مگر سکھاں کے کندھے پر سر رکھ کر وہ ہچکیوں سے رونے لگتی..... خان صاحب اور بیگم صاحبہ کے سامنے اپنے درد کو زبان دی تو خان جی نے فوراً راجا صاحب کو بے قصور قرار دے دیا..... ماں جی نے مصلحت پسندی کی خاطر عمر بھر اپنی زبان ہند رکھی سو اسے بھی یہی کہا۔

”شوہر کا حکم پہلے، باقی سب بعد میں۔“

”اس نے اجازت دے دی یہی بڑی بات ہے، یہ بھی خدمت ہی ہے۔“ خان جی نے اسے گلے بھی لگالیا اور خاموش بھی کرا دیا۔

وہ سچ مچ چپ ہو گئی..... خان جی اور بہار بیگم اپنے آبائی علاقے چلے گئے..... لیکن ڈاکٹر مہ جبین کے اندر شام اور رات کا سرد وحشیانہ ڈر سا اتر گیا، وہ شام ہوتے ہی چادر شانوں پر پھیلا کر تیار ہو جاتی۔

”ابھی تو جا رہے ہیں، آرام تو ٹھیک سے کیا کریں۔“ سکھاں نے پیروں کی طرف بیٹھتے ہوئے کہا تو اس نے پیر سمیٹتے ہوئے کہا۔

”میں سوتے میں بھی شام کا، رات کا انتظار کرتی ہوں۔“

”شام اپنے وقت پر ہی آتی ہے۔“ سکھاں نے اٹھ کر بیڈ کی سائڈ ٹیبل سے فروٹ کی ٹوکری اٹھا کر بیٹھتے ہوئے کہا اور سیب کاٹنے لگی۔

”سکھاں! تمہیں پتا نہیں میرے اندر دواؤں کی اور جتنا جعدارنی کے فائل کے بھکے اڑاتی ٹاکی نے کراہیت سی بھری دی ہے۔ شام ہوتے ہی مجھے اپنے وجود سے گھن آنے لگتی ہے۔ آج جانے راجا صاحب کا شکار کون ہوگا؟“

”چھوڑیں بی بی! مجھے زیادہ تو نہیں معلوم لیکن کسی لڑکی کے چہرے پر بے بسی اور مظلومیت دیکھ کر مجھے بہت ترس آتا ہے۔“ سکھاں نے اسے سیب کھانے کا اشارہ کیا مگر اس نے ہاتھ سے پرے کر دیا۔
 ”ہاں! کل رات والی لڑکی اور اس کی بوڑھی ماں دونوں ہی بہت مظلوم تھیں ہاتھوں اور کپڑوں سے گتے، کاغذ اور لٹی کی بو آ رہی تھی۔ میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔۔۔ کہ تمہیں بو نہیں آتی۔“ مہ جیوں بولتے بولتے چپ ہو گئیں۔

”پھر اس نے کیا کہا؟“ سکھاں نے پوچھا۔

”لڑکی تو ہونق بنی تھی، ماں نے جواب دیا کہ یہ ہمارا رزق ہے۔“

”رودی میں رودی ہو جاتی، ملک طفیل نے اتنی دولت دی ہے کہ اب عطریں نہائیں۔“ اسی لمحے راجا صاحب نے کمرے میں آتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
 ”مگر ملک طفیل کی بھوک نہیں مٹے گی۔“ مہ جیوں نے کہا۔

”بھوک بھوک کا فرق ہوتا ہے میری جان۔۔۔“ وہ بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے جھوم کر بولے۔ سکھاں تو فوراً وہاں سے چلی گئی۔۔۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ راجا صاحب اس کی کڑواہٹ دور کرنے کا فن جانتے تھے۔۔۔ انہیں معلوم تھا کہ کرلیے نمک سے دھو کر پکانے کے قابل بنائے جاتے ہیں۔ اسی لیے مہ جیوں کو بیٹھی زبان سے وہ سرتا پیر بیٹھا کر کے پھر نئے کیس اور نئی ڈیل میں پکا کر دیتے۔۔۔ ویسے بھی آج کل انہیں اپنے دنیا میں آنے والے مہمان کی فکر تھی، بہت محبت تھی ان دونوں سے۔۔۔ یہ الگ بات تھی کہ ڈاکٹر مہ جیوں جب سے اس گھناؤنے فعل میں ملوث ہوئی تھیں تب سے سمجھوتا کر رہی تھی، محبت نہیں۔۔۔ شاید محبت پر مجبور تھی۔۔۔ لیکن کچھ دیر بعد کمرے میں بکھری چیزیں دکھ کر سکھاں دروازے سے ہی لوٹ گئی۔

پھر اپنی ذات کو ترتیب دے کر وہ مریض دیکھتی رہی لیکن نوبے کے قریب جب اس کی اپنی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔۔۔ راجا صاحب نے انتہائی بے حسی کا مظاہرہ کیا ہرے نیلے نوٹوں سے بھرا پرس لے کر آئے اور اس کی پروا کیے بغیر وہ اپنی ترنگ میں بولتے چلے گئے۔

”مجسٹریٹ صاحب کے بیٹے سے بھول ہو گئی ہے، ڈرائیور کی بیٹی ہے، بیچاری کی زندگی بچ جائے گی۔“ راجا صاحب کے لہجے میں بڑی معصومیت اور طنز شامل تھا۔۔۔ مہ جیوں چلا اٹھی۔

”خدا کے لیے راجا صاحب! رحم کریں مجھ پر، میرے بچے پر، بے چاری ڈرائیور کی بیٹی ہی نہیں، خان صاحب کی بیٹی بھی ہے۔۔۔ کس کس کی بھول کی سزا سے دینا ہے، میرے پاکیزہ فرض کو اتنی پستی میں مت دھکیلیے۔“

”راجا صاحب بی بی کی طبیعت بہت خراب ہے۔۔۔“ سکھاں نے بڑی ہمت کر کے کہا تو راجا صاحب کو پہلی بار سکھاں پر شدید غصہ آ گیا۔

”جاؤ جا کر اپنا کام کرو، ہر وقت سر پر مسلط رہتی ہو۔“

”یہ تمہیں نہیں جائے گی، میں جاؤں گی راجا صاحب! چلو سکھاں، مجھے یہاں سے لے چلو۔۔۔“ شدید اشتعال میں کہتے ہی طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی مگر وہ مصر رہے۔

”دیکھو مہ جیوں، میں نے وعدہ کیا ہے؟“

”کیوں، کیوں وعدہ کیا؟ یہ مقدس فریضہ بزنس کیوں بنایا آپ نے، میں مریض دیکھتی ہوں، مریض کی بے بسی کا سودا نہیں کرتی۔“ وہ درد سے کراہ کر بولی۔

”کس نے مریض دیکھنے سے منع کیا ہے، ایک آدھ اسپیشل کیس بھی آ جاتا ہے۔“ وہ اسے بانہوں کا ہمارا دے کر نرمی سے بولے۔

”راجا صاحب! اللہ کے واسطے بی بی کو اسپتال لے جائیں۔“ سکھاں نے ہاتھ جوڑ دیے تو راجا صاحب کو رحم آ گیا۔۔۔ اسے گاڑی میں لے کر چلے گئے۔

اور اگلے تین گھنٹے سکھاں کی جان پر بنی رہی۔۔۔ بی بی کی سلامتی اور صحت کے لیے دعائیں کرتی رہی۔۔۔ خان جی اور بڑی بیگم صاحبہ کو فون پر بتایا۔۔۔ بیگم صاحبہ نے اسے اپنی ذمے داری کا احساس دلایا۔

”سکھاں! اپنی بی بی کا خیال رکھنا تمہاری ذمے داری ہے، بچے کی پیدائش کے بعد فوراً صدقہ دینا، ہمیں اطلاع دینا۔“

”جی، جی بہتر۔۔۔“

”کچھ زمین کے مسئلے مسائل ہیں، آج کل بہت گرمی سردی چل رہی ہے خان جی کی تمبریز خان سے۔ فرصت نکال کے ہم آئیں گے۔“ بہار بیگم نے خاصی پرتشویش سی کیفیت میں بتایا۔

”بیگم صاحبہ! میرے ابا اور اماں۔۔۔“ ٹوٹا پھوٹا سا مختصر سا جملہ اس کے لبوں پر سسکی لے کر دم توڑ گیا۔
 ”وہ شہر میں حویلی کی دیکھ بھال کر رہے تھے، ہمارے ساتھ ہی یہاں آ گئے ہیں۔“ انہوں نے سرسری سا جواب دیا اور فون بند ہو گیا۔ سکھاں ماں باپ کی یاد سے گلے لگ لگ کر سسکیاں لینے لگی۔

”کیسے بے بس ہیں میرے ماں باپ، بیٹی کو بھول کر بھی یاد نہیں کرتے۔“ دل سے اک آہ نکلی اس میں رحمت کے احساس نے اور اضمحلال بھر دیا۔ ایک دم ہی رحمت یاد آنے لگا، دل پھلنے لگا کہ اڑ کر اس کے پاس پہنچ جائے۔۔۔ مگر وہ تو بیاہی گئی تھی، شادی شدہ تھی۔۔۔ اس کی ڈولی مہ جیوں بی بی کے ساتھ اٹھی تھی، رحمت کے بارے میں تو سوچنا بھی گناہ ہے۔ اس نے بھیگی بھیگی پلکیں صاف کر کے مہ جیوں کے کمرے میں بکھری

سب بے ترتیب چیزیں ترتیب دیں، بظاہر دل ادا سیوں سے بھرا تھا لیکن بی بی سے محبت کا غلبہ تھا کہ اس کا سارا اذھیان ٹیلی فون اور باہر گیٹ کی طرف تھا مگر وقت گزر رہا تھا۔۔۔ کوئی خبر نہیں تھی۔۔۔ پریشانی میں ٹہلنے لگی۔۔۔ ٹہلتے ٹہلتے کمرے سے باہر کھلنے والے دروازے سے لان کی درمیان والی روش پر آ گئی۔۔۔ مگر

لان میں گیٹ سے ذرا دور بیچ پر کوئی چادر اوڑھے لیٹا تھا اور گھاس پر کوئی گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ سکھاں ڈر گئی۔۔۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ان کی طرف قدم بڑھائے اور گیٹ پر موجود چوکیدار کو آواز دی۔

”دلاورا دلاورا۔۔۔“

”جی!“ دلاور پھرتی سے اس کی طرف آیا۔

”یہ، یہ کون ہیں؟“ مدھم مدھم روشنی میں وہ کچھ شناخت نہیں کر پارہی تھی۔

”سکھاں بی بی! یہ کوئی ڈریور مر یور (ڈرائیور) ہے ڈاکٹر صاحبہ کا انتظار کرتا ہے۔“ دلاور نے حسبِ

عادت مخصوص لب و لہجہ میں جواب دیا۔

”مگر اتنی رات ہوگئی اور بی بی تو خود اسپتال میں ہیں، انہیں بھیج دو۔“

”نہیں، جی یہ بولتا ہے کہ اس کا بیٹی زندہ ہے اور دلاور خان کے یقین سے خدا قسم بولتا ہے کہ اس کا بیٹی مر چکا ہے، تم کو یقین نہ آئے تو آؤ ہم تم کو دکھائیں، بالکل برف کے مانند ٹھنڈا..... وہ تو اچھا ہو گیا، اس کا بیٹی خود مر گیا۔“ دلاور خان اپنی ترنگ میں بولتا چلا گیا اور سکھاں کے منہ پر اپنا ہاتھ آہ روکنے کے لیے بڑی دیر رہا..... دلاور چلا گیا تو وہ اس طرف آگئی..... بوڑھا شخص جس کی داڑھی اور سر کے بال سفید تھے اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور وہ چادر کا کونہ اٹھا کر ابدی نیند سوئی لڑکی کو ہلا کر دیکھنے لگی۔

”ڈاکٹر صاحبہ کب دیکھیں گی میری ثریا کو۔“

”اسے گھر لے جاؤ، یہ مر چکی ہے۔“ چادر دو بارہ اوڑھا کر اس نے کہا تو وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔

”مار ڈالا میری ثریا کو، ڈاکٹر ایسے ہوتے ہیں، ڈاکٹر میری ثریا کی قاتل ہے، قاتل ہے ہا ہا ہا.....“ وہ

چینیں مار مار کر رو دیا..... سکھاں دل گرفتہ ہو کر اندر کی طرف بھاگی..... جبکہ وہ آوازیں کمرے کے اندر تک اس کا تعاقب کرتی رہیں..... جب راجا صاحب بیٹی کی پیدائش کی خبر لے کر کچھ ضروری سامان لینے گھر آئے تب وہ ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آئی..... راجا صاحب اسے بھی ساتھ لے کر باہر نکلے تو بیچ خالی تھی..... وہاں کوئی نہیں تھا..... اس نے خاموشی اختیار کی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

وہ کتابوں میں سر دیے بیٹھی تھی کہ اس کی آمد کا پتہ چلا جو نبی اس کے بالوں سے پونی کھینچی تو وہ پلٹی۔

”تم سمجھتی کیا ہو خود کو، بقراط ہو، تم اس قابل ہو کہ میں، یعنی رمان احمر تمہیں اپنی فوٹو دے۔“ کئی روز گزرنے کے بعد..... وہ خاصا تلملایا ہوا آیا تھا۔

”رمان بھائی! یہ کیا بد تہذیبی ہے؟“ وہ بال کھینچنے کی وجہ سے کچھ غصے میں کہہ گئی تو وہ اور پھڑ پھڑایا۔

”تصور یہ رکھ کے پی گئیں، اسے کیا کہتے ہیں؟ دو جملے منہ سے نکالتے ہوئے قیامت آ جاتی۔“

”رکھی ہے آپ کی تصویر، کیوں دی تھی؟“ وہ منہ پھلا کر بولی۔

”عجائب گھر میں رکھنے کو دی تھی، بہت معصوم بنتی ہو۔“ وہ غرایا تو نیناں ہراساں سی ہو کر راجہ اور بوا کو

آوازیں دینے لگی..... مگر وہ دونوں ہی کہیں مصروف تھیں، طلال ٹی وی لائونج سے نکل کر وہاں آ گیا۔

”لو، یہ پنا آواز کے ہی چلے آئے۔“ رمان نے اچھے خاصے تمسخرانہ انداز میں ہنس کر کہا تو طلال کی

پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

”یہ میرا گھر ہے، مجھے آنے جانے کے لیے اجازت نہیں چاہیے۔“ طلال نے سینہ تان کر جتلیا تو وہ

بڑے پرسکون انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

”پھر تو آپ کو یہ اطلاع بھی نہیں دینی چاہیے، کیا آپ آنے جانے والوں کو اپنے بارے میں اسی طرح

بتاتے ہیں۔“

”نہیں، ان کو بتانے کی ضرورت پڑتی ہے جو اپنی حیثیت بھول کر آتے ہیں۔“ طلال اس کا جملہ سن کر

خچ پا ہو گیا۔

”تو جب ہے، میری حیثیت کے بارے میں نیناں نے کچھ نہیں بتایا۔“ وہ نہایت معصومیت سے بولا۔

نیناں ٹپٹا گئی، طلال کی نگاہوں کا رخ نیناں کی طرف ہو گیا۔

”رمان بھائی، مجھے درمیان میں مت گھسیٹیں۔“

”ارے سچ کیوں نہیں بتاتی ہو۔“ رمان نے زور دے کر نیناں کو ہانکا۔

”نیناں! یہ کیا کہہ رہے ہیں؟“ طلال نے تاؤ کھا کر پوچھا۔

”مجھے نہیں پتا، میرا دماغ خراب مت کریں۔“ اسے پتنگے سے لگ گئے۔

”یار! تم مجھ سے بات کرو۔“ رمان نے طلال سے کہا۔

”میں ماموں سے بات کروں گا۔“ طلال بل کھا کر غرایا اور بھاری قدموں سے باہر نکل گیا..... اس

کے جاتے ہی رمان قہقہے لگانے لگا۔

”چپ کریں آپ۔“ وہ چلائی۔

”نیناں! سچ بہت دنوں بعد ہنسا ہوں، اس موچیل کو تو اب کئی روز بد ہضمی رہے گی۔“ وہ ہنستے ہنستے بولا۔

”اور کیا کہانی گھڑی ہے آپ نے، اب اس کا جواب کون دے گا پتا کو۔“ نیناں ہراساں سی ہو گئی۔

”کچھ بھی کہے، ریمان انکل مجھے کچھ کہنے والے نہیں.....“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔

”بڑی بڑی حرکت ہے یہ۔“ وہ بولی۔

”اچھا، اچھا، میری تصویر دو یا پھر کچھ منت و منت کرو، میں تصویر بخش دوں گا۔“ گردن اکڑا کر وہ روبرو

کھڑے ہو کر بولا تو وہ ہلنق سی منہ تھکنے لگی۔

”آپ کیا کہہ رہے ہیں، بس جائیں اور یہ پکڑیں اپنی تصویر، مجھے نہیں چاہیے۔“ وہ بیڈ کی سائڈ ٹیبل

کی دراز سے اس کی تصویر نکال کر بیڈ پر پھینکتے ہوئے بولی۔

”قدر کرو نادان لڑکی، ہمیشہ اس دل کی قدر کرو جو تمہاری قدر کرے کیونکہ تم ساری دنیا کے لیے ایک ہو

مگر کسی ایک کے لیے ساری دنیا ہو۔“ وہ یہ کہہ کر بنا تصویر لیے وہاں سے جانے لگا..... تو وہ منمنائی۔

”رمان بھائی اپنی تصویر لے کر جائیں۔“

”گلابا دوں گا، اس موچیل کو بھائی کہا کرو اور یہ تصویر ہمیں رہے گی سمجھیں تم!“ وہ اچھل کر دونوں

ہاتھوں سے گلابا نے کا انداز اختیار کر کے اس کی طرف لپکا..... وہ سہم سی گئی تو وہ بہت لطف اندوز ہوا.....

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ دل ہی دل میں سوچتا رہا، دیکھتا رہا۔

”لبوں کی شرارت سے

بدن کے چور ہونے تک

میں تجھ کو اس طرح چاہوں

کہ میری سانس رک جائے

خطاؤں پر خطائیں ہوں

نہ ہو کچھ بات کہنے کو
میں تجھ میں یوں سما جاؤں کہ میری سانس رک جائے!“
”رمان بھا.....“ اس کی ہچکچاہٹ کو اس نے سختی سے یہ کہہ کر دیا۔
”شش! صرف رمان.....“
”وہ مجھے میتھس.....“

”ہاں! اچھا نکالو بک اور نوٹس بک.....“ اسے یاد آیا کہ وہ تو میتھس کرائے آیا تھا۔ وہ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

کئی گھنٹوں سے وہ کمرے میں بند تھے۔ کتابوں کا ڈھیر لگائے..... پرانی یادوں اور باتوں سے لپی وہ کتابیں جن پر ان ہاتھوں کے نشان تھے، ان لبوں کے چھونے کا احساس تھا..... ورق ورق پر اس کے نام کے دستخط جگمگا رہے تھے..... اس کی عادت تھی کہ وہ کتاب ہاتھوں میں دبا کر لبوں سے لگاتی اور پھر جہاں دل چاہتا دستخط کرتی رہتی، مختلف زاویوں سے، مختلف انداز میں اس کا نام محفوظ ہوتا رہا..... سبحان کو اس کی یہ ادا بہت پسند تھی، کبھی کبھی اچانک کتاب کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا دیتے تو وہ چونک جاتی۔

”دستخط پلیز.....“ وہ مسکرا کر کہتے تو وہ گورے گورے ہاتھوں میں پین دبا کر زور سے نب ان کی ہتھیلی پر دبا کر ایک نقطہ سالگادیتی اور کہتی۔

”جناب کے لیے یہ بھی بہت ہے۔“ وہ کھلکھلا کے ہنس دیتے۔ کبھی کبھی وہ اپنا نام بڑے خوب صورت انداز میں لکھ کر یاد دہانی کراتی۔

”دوست کے لیے۔“ اور وہ حیرت بھری نگاہوں سے اپنا ہاتھ دیکھنے لگتے۔
”وہ اچھا کرتی تھی کہ مجھے یاد دلا دیتی تھی ورنہ زندگی اجیرن ہو جاتی۔“ وہ خود سے بولے مگر جواب بڑے ابا نے دیا۔

”زندگی تو اب بھی اجیرن ہی ہے، گھنٹوں سے کمرے میں بند جس کو یاد کر رہے ہو، اسے کیا کہتے ہیں؟“

”نہ کروں یاد اسے تو الجھ جاتا ہوں اپنی ہی سانسوں سے، سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگی سانسوں سے ہے یا اس کی یادوں سے۔“ کتابوں پر نظریں جمائے جمائے وہ بولے۔

”سبحان اوہ اب شادی شدہ ہے، اس کو یاد کرنا بھی چھوڑ دو، اپنے بارے میں سوچو، اس گھر اور خاندان کے بارے میں سوچو۔“ بڑے ابا نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

”میں بددیانت تو نہیں، اللہ اسے خوش آباد رکھے۔“

”آمین، وہ میری بیٹی کی طرح ہے مگر اس خاندان کو گمنامی سے بچالو، اپنا گھر آباد کرلو۔“

”کیا؟ حد کردی آپ نے اس عمر میں۔“

”کیا ہوا ہے عمر کو، سعدیہ بھی تمہاری ہم عمر ہی ہے۔“

”ایک تو جانے کیوں آپ کو ہر وقت سعدیہ کی فکر رہتی ہے۔“

”ارے بیٹا! محبت کرنے والوں کو وقت پر مقام دینا چاہیے، جو بنانا ہو اسی وقت بنالو، کسی اور زمانے پر نہ بنالو..... وہ زمانوں سے منتظر ہے۔“ وہ بولے۔

”خدا کے لیے! مجھے سمجھنے کی کوشش کریں، میں اس عمر میں ایسی باتیں سوچتا کیا اچھا لگوں گا۔“

”پھر اس عمر میں لب ہلانے تھے، کچھ تو کہتے.....“ وہ جھنجھلائے۔

”کیسے، کیسے کہتا، میرے ہمسفر کا یہ حکم تھا۔“

کہ میں کلام اس سے کم کروں

مرے ہونٹ ایسے سلے کہ پھر

میری چپ نے اس کو رلا دیا۔“

وہ دھیرے سے کہہ کر کتابوں کو اکٹھا کرنے لگے۔

”رابعہ نے بہت خود غرضی کی، ہمارے گھر کی روشنی چھین لی۔“ وہ یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

”وہ تو خود اندھیروں میں ہے، آپ کو کیا بتاؤں کہ اب وہ کیسی ہو گئی ہے۔“ انہوں نے ان کے جانے

بعد جواب دیا۔ کتابیں بک شیلف میں رکھیں اور باہر نکل آئے کیونکہ بڑے ابا جس طرح گئے تھے، سبحان

جانتے تھے کہ ان کو بہلانا ضروری ہے ورنہ بہت اپ سیٹ ہو جاتے ہیں..... بات سچ تھی وہ مضطرب سے ٹی وی

..... لاؤنج میں ٹہل رہے تھے۔

”کمال ہے آپ کو بھول گیا کہ آج میری سالگرہ ہے اور سالگرہ کا تحفہ آپ ساتھ جا کر دلاتے ہیں۔“

سبحان نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تو ان کا غم، خوشی میں بدل گیا۔

”کب سے تو انتظار کر رہے ہیں، چلو، ہم نے اپنے قریبی دوست بلائے ہیں، اچھا سا کھانا بنوایا

ہے۔“

”دوست ہی بلائے ہیں یا اس سعد یہ کو بھی؟“ دانستہ انہوں نے شرارت کی تو مسکرا دیے۔

”شریر ہو، اس کو بلانے سے ہمیں شرمندگی ہوتی ہے۔“ وہ ا یکدم ہی سنجیدہ ہو گئے۔

”چھوڑیں، جلدی چلیں۔“ انہوں نے ٹالا..... تو وہ اپنا بلیک چرمی چھوٹا سا بیگ اٹھا کر ان کے ساتھ

ہو لیے۔

☆☆☆

بچن کے سب کام نمٹا کر بوا اس کے پاس کمرے میں آ گئیں، وہ اپنے زیورات کے ڈبے کھولے

جانے کیا سوچ رہی تھیں..... بوا کو دیکھ کر بولیں۔

”بوا! ہر شے اپنا رنگ کھودیتی ہے، یہ دیکھیں، یہ سب زیورات اپنا اصل رنگ کھو چکے ہیں۔“

”اصل سونا کبھی نہیں بدلتا، مجھے تو کچھ تبدیل نظر نہیں آ رہا۔“ انہوں نے بڑے غور سے سب پر نگاہ

ڈالتے ہوئے کہا تو وہ دکھ سے ہنس دس۔

”یہ میں نے شادی والے دن پہنا تھا، اس وقت یہ کس قدر دمک رہا تھا اور یہ انگوٹھی، لاکٹ سبحان

نے اس رات پہنائے تھے، اب یہ کتنے مدھم لگ رہے ہیں اور یہ ننگن شادی کی پہلی سالگرہ پر دیا تھا، تب

اسے دیکھ کر سب رشک کر رہے تھے..... یاد ہے مناسب جیولر کا نام پوچھ رہے تھے اور یہ ڈائمنڈ رنگ نیناں کے پیدا ہونے پر سبحان نے اسپتال میں پہنائی تھی۔“ وہ ایک، ایک چیز دیکھتے ہوئے، انہیں ایسے دکھا اور

بلاہری تھیں جیسے وہ انجان ہوں۔

”یہ سب چیزیں آج بھی ویسی ہی ہیں، وہ ہم نہیں کرتے۔“ انہیں بہلانے کے لیے کہنا پڑا۔

”یہ کیسے ممکن ہے، اب یہ سب زیورات ضرور ہیں مگر اپنا احساس کھو چکے ہیں..... بالکل سبحان کی

طرح۔“ انہوں نے بیزارگی سے سب ڈبوں کو بند کر کے اپنے پیروں سے پرے دھکیلا۔

”زیورات پرانے ہو جائیں تو دھلوا کر نیا بنالیتے ہیں۔“ بوا نے دانستہ ان کا طنز نظر انداز کر کے مشورہ

دیا۔

”ہونہہ! کیا کیا انسان نیا کرے؟ سبحان تو نہ نئے ہیں نہ پرانے۔“ ان کا منہ کڑوا ہو گیا۔

”بس انسان سمجھوتا کرے، مجھے نہیں معلوم کہ سبحان کتنے برے اور کتنے اچھے ہیں مگر اس گھر کے

وارث ہیں، نیناں ان کی بیٹی ہے۔“

”بوا! آپ کیوں بار بار یہ احساس دلاتی ہیں، سبحان کی اس زندگی سے آپ ناواقف ہیں، میں بھی

غلط نہیں ہوں۔“ انہیں تقریباً غصہ آ گیا۔

”رابعہ! سمجھوتے کی چادر کو کسی ایک نے تو تھا منا ہی ہوتا ہے، یہ چیز آپ کی ساس میں پیدا ہو گئی تھی۔“

وہ جانے کس خیال سے کہہ گئیں۔

”ان میں اور مجھ میں فرق ہے، میں سبحان کو معاف نہیں کر سکتی۔“

”مرضی ہے، میرا خیال ہے سبحان آگئے ہیں، ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔“ گیٹ پر گاڑی کے

بارن سے انہوں نے اندازہ لگا کر کہا اور خود باہر نکل گئیں۔

”ہونہہ، تازہ دم اس دھوکے باز کے لیے۔“ رابعہ نے تلخی سے بڑبڑاتے ہوئے سر سے پاؤں تک چادر

تان لی..... مگر بوا واپس لوٹ آئیں..... اور بولیں۔

”رابعہ بیٹا! سبحان صاحب آئے ہیں۔“ انہیں بچھونے ڈنک مار دیا، چہرے سے چادر ہٹا کر بولیں۔

”کہاں بٹھایا ہے؟“

”ڈرائنگ روم میں..... سبحان نہیں آئے تھے، آ جاؤ تیار ہو کر۔“ وہ یہ کہہ کر چلی گئیں تو وہ چند ثانیے

کچھ سوچنے کے بعد اٹھیں، ہاتھوں سے کپڑوں کی شکنیں درست کیں، بالوں میں برش کیا اور ڈرائنگ روم کی

طرف آ گئیں مگر دروازے پر ہی جم گئیں۔ سبحان لان میں کھٹنے والی بڑی سی شیشے کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ

رہے تھے۔

”ہیلو.....“ انہوں نے خاموشی توڑی تو وہ پلٹے اور مسکرا کر بولے۔

”خوب صورت گھر ہے تمہارا۔“

”ہاں! شاید.....“

”یقین نہیں کرتیں.....“ انہوں نے بغور ان کے منہ سے سراپا کو دیکھا۔

”کیسے آئے ہیں؟“ وہ ٹال گئیں۔

”گاڑی پر۔“

”میرا مطلب ہے کہ کیسے آنا ہوا؟“

”تمہارے گھر گیا تھا، پھر دل چاہا تو ایڈریس سمجھ کر یہاں آ گیا۔“

”نہیں آنا چاہیے تھا۔“ وہ بے دلی سے بولیں۔

”معلوم ہے۔“ وہ بولے۔

”لیکن دیکھنے آ گئے کہ میں کس حال میں ہوں؟“

”رابعہ! ہماری دوستی اتنی کمزور تو نہیں تھی کہ ہم بدگمان ہو جائیں۔“ انہوں نے شکوہ کیا۔

”نہیں..... مگر میں کمزور چھت کے نیچے رہتی ہوں، جہاں پارسائی کے پردے میں نارسائی ہے، اعتبار

کے پردے میں فریب چھپا ہے۔“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں تو وہ بھی ان کے دائیں طرف والے

صوفے پر ٹک گئے۔

”مجھ سے شیر کرو، میں جانتا چاہتا ہوں کہ اتنی محبت میں اتنی نفرت کہاں سے آ گئی؟“

”سبحان! پلیز یہ ذکر نہ کریں، میں شاید جسمانی طور پر ایسی کیمسٹری اختیار کر گئی ہوں کہ سب کچھ برا سا

لگتا ہے۔ میری بیٹی نہ ہوتی تو میں شاید موت کو ترجیح دیتی۔“

”بہت بری بات، اتنی اسٹرونگ لڑکی اتنی کمزور عورت میں بدل گئی۔ حالانکہ عورت تو ایسے کنکریٹ سے

اپنی تعمیر کرتی ہے جس سے فولاد بھی شرمائے۔“ انہوں نے ہمت بڑھانے کی کوشش کی۔

”چھوڑیں اس ذکر کو، میں جو بھی بن گئی، مجھے ریحان نے بدل ڈالا۔“ وہ کچھ مدھم سی پڑ گئیں۔

”رابعہ! ٹرسٹ می، ریحان نے کیا کیا ہے، بتاؤ میں اس کو سمجھاتا ہوں۔“ وہ بولے۔

”پلیز! سبحان! ریحان نے جو کیا وہ واپس نہیں ہو سکتا، میں ڈسٹرب ہوں، مجھے کچھ شیر نہیں کرنا،

ریحان جس روز خود اقرار کریں گے میں اس روز یہ فیصلہ کر سکوں گی۔“ وہ یہ کہہ کر چپ ہو گئیں۔ بوا چائے

لے آئیں۔ تو وہ چائے کی طرف اشارہ کر کے بولیں۔

”چائے پیئیں۔“

”بیٹا! کھانا تیار ہے، کھا کر جانا۔“ بوانے سبحان سے کہا۔

”نہیں شکریہ، بس میں اجازت چاہتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”چائے تو پی لیں۔“ رابعہ نے روکا۔

”پھر سہی، کسی اعتبار کی چھت تلے اعتماد کے موسم میں۔“ یہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے وہ چلے

گئے۔

وہ بوا کو دیکھتے ہوئے باہر نکلیں اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑ گئیں۔

☆☆☆

وہ اچھے موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے باہر لان میں اترنے والی سیڑھیوں پر بیٹھی میتھس کے

یونٹ نمبر پانچ کی مشق کر رہی تھی کہ خوشبو اڑانا طلال اندر سے تیار ہو کر باہر نکلا۔ اس نے خوشبو سے جان لیا

کہ طلال ہے لیکن نوٹس نہیں لیا۔ وہ برابر آ کر بیٹھا تو وہ پیچھے کھسکی۔

”چڑیا! چلو پڑا کھانے چلیں۔“

”نہیں وہ، میں کام کر رہی ہوں۔“ وہ مسترد کر کے کتاب پر نظریں جمائے جمائے بولی۔

”کام بعد میں کر لینا۔“ وہ پر شوق نگاہوں سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”کہا ہے نا، رمان بھا..... میرا مطلب ہے انہوں نے کام دیا ہے۔“ رمان بھا..... پر وہ کچھ انگی اور پھر

بر ملا کہہ کر وہاں سے اٹھنے لگی۔

”واہ! رمان بھا، بہت اچھا نام رکھا ہے۔“ وہ دہرا کر ہنسا تو اسے خود پر غصہ آ گیا۔

”ان کا نام رمان احمر ہے۔“ وہ غصہ دہانہ سکی۔

”جانتا ہوں، لیکن تمہارے لیے تو وہ رمان بھا ہے۔“ بڑا زور دے کر وہ بولا۔ تو پہلی بار اسے سوچنا پڑا

کہ کچھ گڑ بڑ ہے۔

”اچھی بات ہے اسی طرح پکارا کرو۔“ اس کو الجھنا سادیکھ کر وہ خود ہی بولا۔

”مجھے خود پتا ہے کہ کیا کرنا ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔“ وہ بھرسی گئی۔

”تو پھر چلو، چلیں۔“

”طلال بھائی! مجھے کہیں نہیں جانا.....“ وہ یہ کہہ کر پٹ پٹ کرتی اندر کی طرف چلی گئی..... طلال تاؤ

میں آ گیا..... سیدھا اس کے کمرے میں پہنچ گیا اور تدریجاً مقابل تن کر کھڑا ہو گیا۔

”اتنی حقارت سے میرا دل توڑ کے آ گئیں.....“ وہ پوچھ رہا تھا یا رعب جمار ہا تھا وہ ڈری نہ سہی، اپنی

کتابیں میز پر ترتیب دیتی رہی۔

”نیناں! بہتر یہی ہے کہ میری باتیں سمجھنے لگو۔“

”کیوں..... کیوں سمجھوں؟“ وہ اڑ گئی تو اسے حیرت ہوئی..... قہقہہ مار کے ہنسا اور پھر اس کا ہاتھ تھام

کر بولا۔

”کیونکہ یہ ضروری ہے، کتنی بھی نفرت ہے تم کو میری محبت سے مگر ہاتھ جلانے پڑیں گے میری تقدیر

مٹانے کے لیے۔“

”پلیز! چھوڑیں میرا ہاتھ، جائیں یہاں سے۔“ اس نے جھنجھلا کر ہاتھ چھڑایا۔

”طلال! آپ نیناں کے کمرے میں کیوں آتے ہو؟“ رابعہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے

ناگواری سے پوچھا۔

”کیونکہ نیناں اپنی ہے۔“ اس نے شکل سے جواب دیا۔

”نیناں ڈسٹرب ہوتی ہے۔“

”مامی! رمان کے آنے پر تو آپ ایسے برہم نہیں ہوتیں۔“

”رمان یہاں نیناں کو پڑھانے آتا ہے۔“

”اور میں یہاں رہتا ہوں۔“ اس نے جتلیا۔

”فی الحال یہاں سے جاؤ۔“ رابعہ نے بیزاری سے کہا۔

”آپ لاعلم ہیں کہ نیناں اور رمان کے بیچ کیا ہے؟“

”طلال! کیا بے ہودگی ہے؟“ رابعہ زچ ہو گئیں۔

”مامی! اپنے نقش قدم پر تو نیناں کو نہ چلائیں۔“ اس کے جملے میں بہت گہرا طنز تھا۔ وہ پھٹ پڑیں۔

”طلال! انٹی سیدھی ہانگنے کے لیے اپنے ماموں کے پاس جایا کرو۔“

”ہونہہ.....“ وہ ہٹکارا بھر کے چلا گیا تو نیناں ماں سے لپٹ گئی۔

”چلو شاباش کام کرو، رمان آتا ہی ہوگا۔“ رابعہ نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے تسلی

دی۔ وہ رائٹنگ ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھی تو رابعہ اس کے بیڈ پر لیٹ کر ساس کی تصویر دیکھنے لگیں..... بالکل

سامنے دیوار پر لگی بڑی سی تصویر پر ان کی نگاہیں جم سی گئیں..... تصویر پر چھائے سکوت میں وہ کچھ کھوسی گئیں۔

بوا کسی کام سے کمرے میں آئیں تو ان کی نگاہوں کے تعاقب میں خود بھی دور نکل گئیں..... تصویر پر چھائی

حزن و ملال کی کیفیت کی وہ ہی تو ساتھی اور گواہ تھیں۔

☆☆☆

جائداد کے تازے عرصے میں خان جی اور بہار بیگم کا خون بہا دیا گیا، بیٹی کی خوشی دیکھنے سے پہلے ہی وہ خون

میں نہا گئے..... مہ جیس کے وجود پر نیم و حسیانہ سناٹا طاری ہو گیا..... چند روزہ گول مٹول سی دسمہ ان کی توجہ

سے محروم ہو گئی..... والدین کی موت اور سب مال و اسباب چھن جانے کا غم انہیں ہلا کے رکھ گیا..... بہت

عرصے لیوں پر چپ کی مہر لگی رہی، اپنے آپ سے لڑتے ہوئے دسمہ نظر انداز ہوئی، راجا صاحب سے واجبی

سائلق رہ گیا..... اسپتال تو مستقل ویران سا ہو گیا..... تقریباً ڈیڑھ دو ماہ بعد راجا صاحب نے اپنے لہجے میں

مٹھاس سے انہیں زندہ کر دیا..... وہ ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے روئیں، پھر سکھاں سے اظہارِ

افسوس کرتے ہوئے رو دیں۔

سکھاں نے خان جی اور بیگم صاحبہ کے ساتھ اسنے والدین کی موت کا ذکر نہیں کیا تھا..... بس اشک بہا

کر خود کو یتیم اور مسکین سمجھ لیا تھا۔ اس کا کوئی نہیں رہا تھا لیکن مہ جیس نے یاد دلایا۔

”سکھاں! رحمت ہے نا، تم اس کے پاس لوٹ جاؤ۔“ تو سکھاں اپنی بی بی کے اندر سے کرب اور رنج پر

خود بھی رو دی۔

”میری تو صرف بی بی ہے، پیچھے کیا تھا اور کیا ہے، یہ مجھے نہیں پتا۔“

”سکھاں! اب تو رحمت کے پاس جاسکتی ہے، میں بھجوا دیتی ہوں۔“

”نہیں، اب ہی تو بی بی کو میری ضرورت ہے، رحمت کے پاس جانے اور اپنے بارے میں بتانے کا

وقت تو گزر گیا۔“ سکھاں نے صاف انکار کر دیا۔

”تم میری وجہ سے کہہ رہی ہو؟“ مہ جیس نے پوچھا۔

”میں اپنی وجہ سے کہہ رہی ہوں، مجھے یہیں رہنا ہے، آپ کے پاس۔“ مہ جیس روتے روتے

مسکرا دی..... اور پھر سکھاں اور دسمہ کے سہارے غم غلط ہوتے گئے..... راجا صاحب نے اسپتال پھر سے

آباد کر دیا۔

زندگی کی رسوائیوں کے بعد موت کے تمنائوں کو شکاری ہی نئی زندگی کی نوید سنا کر اس کے پاس لاتے

تھے..... ایک زندگی کے بدلے میں دوسری زندگی بچانے کے حوالے سے ڈاکٹر مہ جیس کو قائل کرنے کی

ذمے داری راجا صاحب نے اٹھا رکھی تھی..... دور، دور ان کا شہرہ یہی پھیل گیا تھا کہ وہ گناہ اور زیادتی کے

نشان مٹانے والی ڈاکٹر ہیں۔ ان کے ذہن پر راجا صاحب نے ایسے تسلط جمایا تھا کہ وہ، ویسا کرتی تھیں مگر

اندر ہی اندر گھن چائے لگا تھا..... ماں باپ کے بعد صرف راجا صاحب ہی تھے یا پھر سکھاں جو پل پل لمحہ لمحہ

ان کے ساتھ جیتی تھی سانس لیتی تھی۔ دسمہ کی ذمے داری بھی اسی پر تھی اور جب وہ شکست خوردہ ہو کر اشک

بہاتی تو تب بھی سکھاں ہی وہ اشک صاف کرتی..... راجا صاحب سے تو مہ جیس نے شکوہ کرنا بھی تقریباً ختم

کر دیا تھا..... ویسے راجا صاحب پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا..... ان کے بینک اکاؤنٹ میں روپے بڑھ

رہے تھے، وہ شہر کے امرا اور روسائیں شمار ہونے لگے تھے۔

”سکھاں! کاش بابا نے مجھے ڈاکٹر نہ بتایا ہوتا۔“ وہ یہ شکوہ اکثر دیشتر بستر پر گر کے کرتی۔

”انہوں نے تو آپ کی خواہش کا احترام کیا تھا۔“ سکھاں جواب میں کہتی۔

”جہاں اسپتال بنانے یا ملازمت کرنے پر پابندی لگائی تھی، وہاں اس خواہش کا بھی گلا دبا دیتے.....

مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی ہے، میرے اور میری بچی کے حلق سے وہ پیسہ اتر رہا ہے جو جائز نہیں۔“ وہ

بے بسی سے بولی۔

”اللہ پر نیت روشن ہے، اللہ سے راجا صاحب کے لیے ہدایت مانگیں۔“ سکھاں بڑے حوصلے کی خاطر

موہوم سی امید کا دیار روشن کرتی۔

”میں کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی، اللہ کے ہاں میری کوئی حیثیت نہیں رہی، سب کے

گناہوں میں برابر کی شریک بن گئی ہوں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دیتی..... تب سکھاں احساسِ گناہ کو کم

کرنے کے لیے زمانے کی تاویل پیش کرتی۔

”آپ یہ غور کریں کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں؟ آپ کی طرح اور بے شمار ڈاکٹر ہوں گی جو ایسے رحم

بھیلویوں کی بھینٹ چڑھنے والی لڑکیوں کے ماتھے کا کلک دھوتی ہوں گی۔ یہ ظلم کتنا عام ہو گیا ہے..... اس

میں ان معصوم لڑکیوں، بچیوں کا کیا قصور؟“

”یہ لولی لنگڑی مثالیں دے کر احساسِ جرم نہ کم ہوتا ہے اور نہ ختم ہوتا ہے۔ میں کسی کے گناہ اور جرم کی گناہ

گار کیوں بنوں؟“ وہ ماننے سے انکاری ہو جاتی ایسے میں سمجھاتا بے حد مشکل ہو جاتا..... دسمہ کی بڑھتی ہوئی

عمر کے ساتھ ساتھ یہ احساس زیادہ ستانے لگا تھا۔

”اللہ نے مجھے بیٹی دی ہے، یہ گناہ سے حاصل کی گئی روٹی میری بیٹی کی زندگی کو کفارہ نہ بنا دے۔“ یہ

خوف مہ جیس کی چٹلیوں سے چپک گیا..... چند مریض جن کا علاج معالجہ جائز سمجھتی ان کے پیسوں سے دسمہ

کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرتی جو کہ ممکن نہیں تھا..... ٹھاٹھ باٹ سے زندگی بسر کرنے والے باپ

کی بیٹی کم حیثیت احساس کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتی تھی..... وسیمہ کے اندر کی اس تبدیلی پر تو وہ راجا صاحب کے سامنے سراپا احتجاج بن گئی۔

”خدا کے لیے! اب اور گناہ پر مجھے مجبور مت کرو، آگ لگا دو اس اسپتال کو، ورنہ میں خود کو آگ لگا کر مار ڈالوں گی..... میری بیٹی ہمارے گناہ کی سزا نہ کائے.....“ جیتے چلاتے وہ رو دی۔

”مہ جی! کیا ہو گیا ہے تمہیں، جان! یہ سب ہماری بیٹی کا ہے، اسے اعلیٰ تعلیم دلوائیں باہر بھیجیں۔“ راجا صاحب بڑی مٹھاس بھری زبان میں بولے۔

”اور احساس گناہ؟“ وہ چلائی۔

”یہ کام تم نہیں کرو گی تو اور بہت سے لوگ کر رہے ہیں، کسی کی زندگی بچانا کوئی گناہ نہیں۔“

”یہ کسی کی زندگی بچانا نہیں، ورنہ صفت انسانوں کی مدد کرنا ہے، اس گناہ کو بے نقاب کرنے کی ذمہ داری کس کی ہے؟“ وہ بولی۔

”کم از کم ہماری نہیں، یہ قانون کے رکھوالے جانیں اور ان کا کام۔“ وہ وسیمہ کے ہاتھ چومتے ہوئے بولے تو اسے غصہ آ گیا۔

”یہ بے حسی ہے راجا صاحب، آپ کوئی کام کریں، اس بچی کو اپنی محنت کی کمائی کا لقمہ کھلائیں۔“

”مزدوری تو کرنے سے رہا اور تم کتنی ناشکری ہو، تھوڑی سی محنت سے ڈھیر سارے پیسے لوگ گھر آ کر دے جاتے ہیں..... پھر اور کچھ کرنے کی ضرورت کیا ہے؟“ وہ انتہائی سادگی سے کہہ کر بیٹی سے کھیلنے لگے..... چار سالہ وسیمہ کو کچھ خبر نہیں تھی کہ ماں باپ کے درمیان کیا بحث و تکرار ہے۔ اسے اسکول داخل کرایا تو ریحان دنیا میں آ گیا۔

ریحان کا پیدا ہونا مبارک ثابت ہوا کہ راجا صاحب نے ایک گلاس فیکٹری میں شرکت شروع کی..... وہ بالکل چپ، خاموش اور ساکت نظروں سے دیکھتی رہتی..... اس کی خوب صورت آنکھوں میں موت کی سی خاموشی چھا گئی تھی..... جسے دیکھ کر صرف سکھاں خون کے آنسو روتی تھی..... لاکھ جتن کے باوجود وہ اسے احساس جرم اور ندامت گناہ سے واپس نہیں لاسکی..... راجا صاحب کاروباری دنیا میں مصروف ہو گئے، وسیمہ اور ریحان کی دیکھ بھال..... مہ جیوں کی دیکھ بھال سب سکھاں کی ذمہ داری میں شامل ہو گئی..... سکھاں کو کوئی شکوہ گلہ نہیں تھا، وہ تو بس اپنی بی بی کے گلنار چہرے پر زندگی دیکھنا چاہتی تھی جو کہ مرتے دم تک ان کے چہرے پر نہیں آئی..... یہ شکایت اپنے تئیں وہ کبھی کبھار راجا صاحب سے کرتی تو وہ مخصوص نرم لہجے میں کہتے..... بلکہ اچھی خاصی تقریر کر ڈالتے۔

”تمہاری بی بی کی خواہش تھی کہ اسپتال بنے، اسپتال بنا تو اسے سو کیڑے نظر آنے لگے۔ میں اب کاروبار میں مصروف ہوں تو بھی اسے پسند نہیں، بیکاری ٹینشن لے، لے کر اسٹریس میں ذہنی مریضہ بن کر بستر پر پڑے رہنا پسند ہے تو میں کیا کروں؟“

”آپ انہیں وقت دیا کریں، ان کی چپ نے بستر سے لگا دیا ہے..... دونوں بچوں سے بھی غافل ہو گئی ہیں۔“

”میں سمجھا چکا ہوں، بس بی بی صاحبہ نے ایسے ہی رہنا ہے، میرے بزنس کے سو بکھیرے ہیں، تم بچوں کی ٹھیک طرح سے تربیت کرو۔“ وہ یہ کہہ کر باہر نکل جاتے اور سکھاں اللہ سے بی بی کی صحت کے لیے دعا کرنے لگتی۔

☆☆☆

سرکلر روڈ سے گاڑی چلاتے ہوئے جب وہ کالج کے سامنے سے گزرنے لگا تو تقریباً سو ایک کا وقت تھا۔ گیٹ سے لڑکیاں رنگین کپڑوں میں باہر آ رہی تھیں۔ اس نے گاڑی گیٹ سے ذرا فاصلے پر کھڑی کی اور اتر کر کھڑا ہو گیا..... کچھ دیر بعد نیناں نے گیٹ سے سر نکال کر باہر دیکھا تو وہ بھاگ کر قریب گیا مگر وہ اندر ہو چکی تھی شاید اپنی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی..... اس نے چوکیدار سے کہا نیناں ریحان کو بلاؤ، چوکیدار نے اندر منہ کر کے نام پکارا تو نیناں باہر آ گئی..... اسے دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔

”آپ!“

”اس موچیل کا انتظار تھا کیا.....؟“ اس نے سرگوشی کی تو وہ شرمندہ سی ہو کر اس کے ساتھ چلنے لگی۔

”رمان بھا! وہ طلال بھائی آتے ہوں گے۔“ گاڑی کے قریب پہنچ کر اس نے جھپکتے ہوئے اس کا نام لیا..... وہ چل کر بولا۔

”واہ! یہ بھا، بھی طلال بھائی کے ساتھ لگا دو، اسے طلال بھا بھائی پکارا کرو۔“

”آپ ہر وقت ڈانٹتے ہی رہتے ہیں۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”چلو بیٹھو، بتاتا ہوں، میں تمہیں شیر بنانا چاہتا ہوں بلکہ شیرنی بنانا چاہتا ہوں۔“ اس کے لیے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والا دروازہ کھول کر بیٹھاتے ہوئے وہ بولتا گیا۔

”میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“

”ہاں! ایسے بھی بہت ٹھیک ہو، اتنے خوب صورت لباس میں تو کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی ہو۔“ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس کے جملے کی اچھی خاصی تشریح کر کے پُرشوق نگاہوں سے دیکھا۔

”وہ آج فن فیئر تھا.....“ اس نے جلدی سے بتایا۔

”اچھا یہ بتاؤ، کیا کھاؤ گی اور کیا کھلاؤ گی؟“

”آج فن فیئر تھا۔“ اس نے دوبارہ بتایا۔

”اچھا، اچھا میں بہرہ نہیں ہوں، کیا کھاؤ گی؟“ وہ اس کی بات سنی ان سنی کر کے زور سے بولا تو وہ ڈر گئی۔

”بہت ڈر پوک ہو۔“ وہ محفوظ ہوا اور گاڑی اپنے گھر والے روڈ پر ڈال دی۔

”آپ کو معلوم ہے طلال بھائی کتنا ناراض ہوں گے، آپ مجھے فوراً گھر چھوڑیں۔“ وہ بہت گھبرا رہی تھی۔

”کتنا..... یا آج بتا ہی دو.....“ وہ گاڑی کی رفتار کم کر کے اسے دیکھتے ہوئے بولا تو وہ گڑبڑا گئی۔

”آپ ایسے کیوں پوچھتے ہیں؟“

”یہ کہو کہ ایسے کیوں دیکھتے ہیں؟“ اس نے چھیڑا۔

”پلیز! مجھے گھر چھوڑ دیں۔“ وہ جھلائی۔

”گھر ہی تو لے جا رہا ہوں۔“ اس نے ایک دم اسپید بڑھائی اور گاڑی زانے بھرتی ہوئی چند ہی منٹ میں فرقان منزل کے گیٹ پر بھی۔

☆☆☆

نیناں کی غیر متوقع آمد پر عارفہ حیران سی ہو گئیں۔۔۔۔۔ دعا کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا۔۔۔۔۔ اٹھ کر جانے لگی تو رمان نے اس کا ہاتھ تھام کر زور سے جھٹکا دے کر کہا۔

”نیناں! یہ دعا ہر وقت تمہارا ذکر کرتی رہتی ہے، دیکھنا منٹوں میں میز پر کھانا لگائے گی۔“ دعا بھونچکاسی عارفہ کو اور رمان کو دیکھنے لگی۔۔۔۔۔ عارفہ بیگم اس کی شرارت پر مسکرائیں اور بولیں۔

”نیناں! بیٹھو میرا بچہ، آج بڑی خالہ کی یاد کیسے آگئی؟“ نیناں وہیں ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”یہ تو امی ضد کر کے آئی ہے کہ گھر لے چلو۔“ رمان کے سفید جھوٹ نے اسے برقی جھٹکا لگایا۔

”اچھا کیا، اس بہانے رمان احمر کی خواہش پوری ہوگئی۔“ دعا نے کہا اور جانے کے لیے مڑی۔

”اے دعا کھانا لگاؤ۔۔۔۔۔ بہت بھوک لگی ہے، نیناں کیا سوچے گی؟“ رمان نے اس کا راستہ روک کر کہا تو وہ چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

”نیناں کو وہی سوچنا چاہیے جو تم سوچتے ہو کیوں نیناں؟“ اس نے ایک دم نیناں سے پوچھا تو وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

”آپ تینوں بیٹھ کر گپ شپ کرو، میں کھانا لگواتی ہوں۔“ عارفہ بیگم نے کہا اور کچن کی طرف چلی گئیں۔

”پلیز! مجھے چھوڑ آئیں، طلال بھائی پپا سے شکایت کریں گے۔“ نیناں نے بیچارگی سے کہا۔

”نیناں، رمان اغوا کر کے تو نہیں لایا۔“ دعا نے ہنستے ہنستے نجی سے کہا۔

”ارے یہ کرنا پڑا تو رمان احمر یہ بھی کرے گا۔“ رمان نے دعا کو چڑایا۔

”اچھا ماما کو فون تو کر دیں۔“ نیناں کو سخت فکر مند ہی تھی۔

”ریحان انکل اور رابی خالہ نے دودھ پیتی بچی بنا کر رکھا ہے، موبائل فون نہیں ہے کیا؟“

”کالج میں پریشن نہیں ہے۔“ وہ شرمندہ سی ہوگئی۔

”اچھا یہ لو فون اور رابی خالہ کو بتا دو کہ شام کو میرے ساتھ آؤ گی، ٹیوشن والے ٹائم پر۔“ اس نے اپنے موبائل فون پر رابی خالہ کا نمبر ڈائل کر کے اسے تھما دیا اور خود فریٹش ہونے کے لیے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

دعا کچھ دیر خاموشی سے اسے بات کرتا دیکھتی رہی پھر کچن میں عارفہ ماما کے پاس آگئی۔۔۔۔۔ انہوں نے کچن والی ڈائنگ ٹیبل پر تقریباً کھانا لگا دیا تھا، صرف پھلکے بنانے شروع کیے تھے۔ اس نے مجھے سے چہرے کے ساتھ پوچھا۔

”مامی! میں پھلکے بنا دوں؟“

”ارے نہیں، تم فریج سے راستہ نکالو اور پانی کی بوتل نکال کر رکھو۔“

”مامی!“

”ہونہہ، کیا بات ہے؟“ انہوں نے اس کی مدھم آواز سے بہت کچھ بھانپ لیا۔

”نیناں بہت خوب صورت ہے نا؟“ بڑی حسرت و یاس کے ساتھ اس نے پوچھا۔

”ہیں، یہ کیا بات ہوئی؟“ انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

”کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں بس۔۔۔۔۔“ وہ یہ کہتے ہوئے وہاں سے بھاگ کر باہر نکل گئی عارفہ بیگم آوازیں دیتی رہ گئیں۔۔۔۔۔ پھر دل مسوس کے چپ کر گئیں۔۔۔۔۔ انہیں اس کی ذہنی کیفیت اور دلی جذبات کا احساس ہو گیا تھا۔ دعا، نیناں کو دیکھ کر افسردہ سی کیوں ہوگئی ہے؟ اس بات کو وہ اچھی طرح سے سمجھ سکتی تھیں مگر کچھ نہیں

سکتی تھیں۔۔۔۔۔ رمان کی دلچسپی اور جھکاؤ اس بات کا کھلم کھلا اظہار تھا کہ اسے نیناں پسند ہے۔۔۔۔۔ نیناں کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے اس سے وہ ناواقف تھیں۔۔۔۔۔ انہیں نیناں اگر پیاری تھی تو دعا بھی بہت عزیز تھی۔ ان کے دل میں دونوں کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

☆☆☆

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ طلال نے ان دونوں کے آتے ہی قیامت برپا کر دی۔۔۔۔۔ اس کی غصیلی آوازیں کر ریحان اختر باہر آگئے۔۔۔۔۔ نیناں سہم کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔۔۔۔۔ جبکہ رمان نے طلال کے جاہ و جلال کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں لیا۔۔۔۔۔ ریحان اختر سے ہاتھ ملا کر بڑے آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ مگر طلال مزید طیش میں آگیا۔

”ماموں! اس شخص کو بتا دیں کہ نیناں کے معاملے میں آئندہ محتاط رہے ورنہ۔۔۔۔۔“

”ورنہ کچھ نہیں ہوتا مسٹر طلال، میں حیران ہوں آپ کیوں ناراض ہو رہے ہیں؟ آپ کی حیثیت، آپ کا مقام تو خدا نخواستہ متاثر نہیں ہوا، کیا ہوا جو وہ کچھ دیر کو اپنی بڑی خالہ سے مل آئی؟“ رمان نے نہایت میٹھی اور نرم زبان میں بات کی تو ریحان اختر نے فوراً مدخلت کی۔

”ارے کچھ نہیں رمان بیٹا، طلال نے کچھ زیادہ ہی محسوس کر لیا۔“

”وہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کیوں؟“ رمان نے جرح کی۔

”دراصل طلال کو نیناں کی عدم موجودگی میں پراہلم ہوئی اور خیر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ میری نیناں کا میتھس امپروو ہو رہا ہے؟“ انہوں نے بات ہی ٹال دی..... طلال بل کھا کر بولا۔

”جی ہاں اسارے شہر میں میتھس کے پروفیسر ہڑتال پر ہیں، مسٹر رمان پڑھا رہے ہیں۔“

”یار! آپ پڑھاؤ، میں کون سی فیس لیتا ہوں۔“ رمان نے کڑوی بات بیٹھے میں ڈبو کر کی تو ریمان اس سے کام کے متعلق پوچھتے رہے، مشاغل کی تفصیل معلوم کی..... اچھی سی پُرتکلف چائے اس کے ساتھ پی..... رابعہ کو نہ انہوں نے بلایا اور نہ وہاں آئیں..... خود سے پوچھنے کی جسارت اسی کو کرنی پڑی۔

”رابی خالہ تو ٹھیک ہیں نا.....؟“

”معلوم نہیں.....“ مختصر اُکھا گیا۔

”مطلب.....؟“

”ہمیں تو یہ پتا ہے کہ وہ سوتی رہتی ہیں۔“ انہوں نے طنز یہ کہا۔

”سو نے کی وجہ نہیں معلوم کی آپ نے.....؟“ اس نے بھی کریدا۔

”ہو نہ! اپنی خالہ کو اتنا ہی سمجھتے ہو۔“ وہ تسخرانہ ہنسی بنے۔

”وہ ٹیکسر تبدیل ہو گئی ہیں، یقیناً کچھ ایسا ہے جس کی وجہ سے وہ ڈسٹرب ہیں۔“ اس نے بھی جم کر جواب دیا تو ریمان اختر لا جواب ہو گئے..... کچھ دیر چپ رہے پھر نئے سرے سے بات میں وزن پیدا کیا۔

”رابعہ سے میری لومیرج ہے، میں اگر سب کو تا ہیوں کو نظر انداز کر کے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتا ہوں تو رابعہ کو بھی چھوٹی موٹی بدگمانی کو خود پر طاری نہیں کرنا چاہیے۔“ رمان کو ان کی دوپرتہ بات اچھی نہ لگی، کھلے لفظوں میں انہوں نے رابعہ بیگم کے کردار پر تنقید کی تھی۔

”رابی خالہ نے ایسی کوئی کوتاہی کبھی کی ہی نہیں۔“

”یار رکی کوتاہی ہر شخص میں ہوتی ہے، ہر آدمی کی پرسنل لائف ہوتی ہے شادی سے پہلے کے سب معاملات بھول کر اعتماد کا رشتہ قائم کیا جاتا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ رابی خالہ کی پرسنل لائف کچھ اور تھی۔“

”رمان! بہت براڈ مائنڈ آدمی ہوں میں، بیوی کے کلوز فرینڈ کے بارے میں جانتے ہوئے بھی میں نے شادی کی۔“ انہوں نے پھر رابعہ کا ماضی موضوع بنایا تو وہ ناگوار سے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”کوئی چیز مخفی ہو تو تکلیف دہ ہوتی ہے، رابی خالہ نے کچھ چھپایا نہیں، اپنی ہاؤ پھر ملاقات ہوگی، مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ خاصا یدمرزہ... ہو کر مصافحہ کر کے واپس پلٹ آیا..... نہ رابی خالہ سے ملا اور نہ نیناں کو میتھس کرایا..... دماغ سلگ رہا تھا اور دلی طوڑ پر غمگین تھا..... کسی حد تک رابی خالہ کی ڈسٹربنس کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

باقی آئندہ ماہ

چھنا کے سے کرٹل کاواز کرچی کرچی ہو گیا۔ آواز سن کر بوا اور رابعہ ایک ساتھ دوڑ کر اس کے کمرے میں آئیں۔ وہ غصے میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ یہ اس کا مخصوص انداز تھا، غصہ سہم کی صورت اختیار کرتا تو وہ تنہی منی رنگین چڑیا کی طرح دیک سی جاتی اور اگر غصہ ابال کی شکل میں ڈھلتا تو ایک دد چیز کی توڑ پھوڑ کے بعد وہ نارٹل سے انداز میں چہل قدمی شروع کر دیتی۔ بوا داز کی کرچیوں کو سمیٹتے ہوئے آبدیدہ سی ہو گئیں۔ پرانی یادوں سے جڑا یہ واز ڈاکٹر مہ جیس کے جہیز میں آیا تھا، ان کے کمرے میں کتنے زمانوں سے محفوظ تھا۔

”دھیرے دھیرے سب یادیں مٹی جاتی ہیں۔“ بوا نے گلوگیر لہجے میں کہا تو رابعہ کو شدت سے احساس ہوا۔

”بوا! نیناں کو معاف کر دیں، مجھے معلوم ہے یہ امی جان کا پسندیدہ گلدان تھا۔“

”خیر، اتنے غصے کی وجہ کیا تھی؟“ طویل آہ بھر کے انہوں نے براہ راست نیناں کو مخاطب کیا۔

”سب بابا جیسے ہیں، طلال بھائی، رمان بھائی سب برے ہیں۔“ وہ چلانے لگی تو طلال نہ چاہتے ہوئے بھی آواز سن کر کمرے میں آ گیا۔

”ایکسیکو زمی! خبردار جو مجھے سب کے ساتھ ملایا۔“

”ارے کیوں نہ ملائیں، اس نے ہوش میں تم سب کو غصہ کرتے ہی دیکھا ہے اور طلال تم تو بالکل اپنی ماں جیسے ہو۔“ بوا کو غیر معمولی غصہ آ گیا تو وہ چڑ گیا۔

”کیوں میری ماں میں خرابی تھی؟“

”اٹھا! ارے بچے نہ منہ کھلاؤ، خرابی تو تم کیا سمجھو گے؟“ بوا نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

”آپ جیسے ملازم ہی ہوتے ہیں جو گھر والوں میں کیڑے نکالتے ہیں۔“ طلال نے انتہائی بدتمیزی سے کہا اور چلا گیا جبکہ بوا کے ہاتھ کی مٹھی تختی سے بند ہوئی اور کرچیوں نے لہو بہا دیا۔ برسوں کی خدمت کا صلہ لحوں میں وہ اس طرح دے گیا کہ وہ صدمے سے بے حال ہو گئیں، رابعہ اور نیناں کو افسوس ہوا۔

”بوا! اس کی بات کا برا نہ منائیں، آپ ہی تو کہتی ہیں کہ یہ دوسیمہ باجی جیسا ہے۔“ رابعہ نے کہا تو انہوں نے رابعہ کی طرف دکھ بھری نگاہوں سے دیکھا۔

”سوری بوا! سب میری وجہ سے ہوا ہے۔“ نیناں ان کے ہاتھ سے سب کرچیاں اپنے دوپٹے کے پلو میں ڈال کر بولی۔

”ارے دوسیمہ تو طوفان برپا کر دیتی تھی، ایسے بہت سے گلدان، قیمتی برتن اٹھا اٹھا کر پٹختی تھی، ماں کی بے بسی کا ناجائز فائدہ اٹھاتی تھی۔“

”اور دادا جی انہیں کچھ نہیں کہتے تھے؟“ نیناں نے معصومیت سے پوچھا، ڈسٹ بن میں سب کا بچ کے ٹکڑے اور ذرے جھاڑے۔

”دادا جی تمہارے تو بہت بڑے تاجر بن گئے تھے، دوسیمہ کو وقت دینے کے بجائے آزادی اور روپیہ دیتے رہے۔“ وہ بولیں۔

”چلیں انھیں، میں ڈرائیور سے کہتی ہوں گاڑی نکالے۔“ نیناں نے کہا۔

”وہ کس لیے.....؟“ انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

”ڈاکٹر کے پاس چلیں اور کس لیے.....؟“

”نیناں ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ رابعہ نے تائیدی کی۔

”ایسے معمولی زخموں سے تو دامن بھرا ہے، میں ہاتھ دھو کر دوا لگا لوں گی۔“ انہوں نے کہا اور اٹھ کر چلی گئیں۔

”مما! طلال بھائی نے بہت ہرٹ کیا ہے۔“ نیناں دکھ سے بولی۔

”ریحان اختر کا بھانجا اور کر بھی کیا سکتا ہے؟“ رابعہ کا منہ کڑوا ہو گیا۔

”اسی لیے مجھے کوئی مردا چھان نہیں لگتا۔“

”یہ بھی حقیقت نہیں ہے شاید.....“ رابعہ نے اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تو وہ رمان کو بھی برا بھلا کہنے لگی۔

”رمان تو بہت اچھا ہے، میرا اور آپ کا خیال رکھتا ہے۔“ رابعہ نے بڑی نرمی سے کہا۔

”بس مجھے اچھی نہیں لگتیں ان کی حرکتیں۔“ وہ جھلا کر بولی۔

”کون سی حرکتیں.....؟“

”بس چھوڑیں۔“

”شریر ہے، اس کی شرارت کو انجوائے کیا کرو۔“

”یہ آپ کہہ رہی ہیں.....؟“ اسے خاصا تعجب ہوا۔

”ہاں! کیونکہ رمان کو میں جانتی بھی ہوں اور سمجھتی بھی ہوں۔“

”بہر حال ان کی وجہ سے سب غلط ہوا، انہیں سمجھا دیں آئندہ وہ ایسی حرکت نہ کریں۔“

”اسے سمجھنا مشکل ہے، اب اپنی پڑھائی کرو اور غصہ نہ کیا کرو۔“ وہ یہ کہہ کر چلی گئیں..... اس کے لیے

ماں کی بات سمجھنا آسان نہیں تھا بس سوچتی رہ گئی۔

کبھی کبھی تو وہ ماما کو بھی ایک پیلی کے مانند بوجھنے کی کوشش کرتی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے کبھی بابا ٹھیک

لگتے اور کبھی ماما..... اس کی ذات ماں باپ کے فاصلوں کی زد میں قید تھی۔ بابا کا بے پناہ پیار اور ماما کی خوفزدہ سی

ممتا اسے الجھا دیتی تھی۔

☆☆☆

سارا شہر سو گیا تھا مگر ان کی آنکھوں سے نیند کو سوس دور تھی۔ ہلکی سی روشنی میں کمرے کی چار دیواری سے

وحشت ٹپک رہی تھی۔ بے بس اور بے اختیار، لاوارث اور بے نشان..... پلکوں سے موتی ٹوٹ کر تکیے میں

جذب ہو رہے تھے..... مدتوں بعد دل کا درد جاگا تھا..... ایک بار پہلے ایسی زہر آلود برتھی دل و جگر کو چیرتی ہوئی

گزری تھی..... جب ماں سے کڑوا بولتی دوسیمہ کو انہوں نے سرزنش کی تھی اور وہ پھر کر کمرے میں طوفان لے آئی

تھی۔

”اوقات میں رہا کرو، گھر کی ملازمہ بن کر آئی ہو۔“ یہ جملہ یاد کر کے وہ اس وقت بھی بلبلاتا تھا

بیٹھیں..... اس رات بھی وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں، رات بھر جاگنے سے اور رونے سے آنکھوں کی حالت گوشت کی بوٹیوں جیسی ہو گئی تھی۔
 ”سکھاں! یہ تمہاری آنکھیں.....؟“ ڈاکٹر مہ جیس کے حلق میں... کئی کانٹے ٹوٹے۔
 ”کچھ پڑ گیا تھا.....“

”یو! بابا مر گیا ہے۔“
 ”کو..... کون مر گیا.....؟“ وہ گھبرا کر دروازے کی طرف لپکیں۔
 ”وہ جھاڑو دینے والا بابا، شام سے اس کی طبیعت خراب تھی۔“ فیضو ہمدردی سے بولا۔
 ”اب؟“

”ڈرائیور سے کہیں اس کے گاؤں میت چھوڑ آئے۔“ فیضو نے مشورہ دیا۔
 ”تمہیں اتنا پتا معلوم ہے تو ڈرائیور کے ساتھ چلے جاؤ۔“ انہوں نے کہا۔
 ”مجھے نہیں معلوم، رحمت نام ہے، میں تو اتنا ہی جانتا ہوں۔“
 ”رحمت، رحمت، کون رحمت؟“ وہ کپکپاتا تھا۔
 ”جمہور جھاڑو والا بابا.....“

”میں نے کبھی نہیں دیکھا.....“ ان کے دل کو کچھ ہور ہا تھا۔
 ”چل کر دیکھ لیں پھر جیسا کہیں.....“ فیضو نے کہا اور آگے چلا گیا..... ان کے قدم وہیں جم گئے..... دل کہتا چل کر دیکھ یہ رحمت کون ہے مگر ذہن نے تاویل پیش کی، چھوڑ نہ جانتا بہتر ہے، انجانے اور ان کہے حوالے اچھے ہوتے ہیں، کچھ دیر کی کشمکش کے بعد انہوں نے ریحان اختر کو جگانے کے خیال سے اُن کے کمرے کا رخ کیا۔

☆☆☆

جونہی طلال نے نیناں کے ہمراہ گاڑی گیٹ سے نکالی تو ریحان اختر نے بھی فوراً ڈرائیور کو آواز دی.....
 برف کیس اٹھایا مگر بوانے آ کر روک دیا۔
 ”کہاں جا رہے ہو؟“

”ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں، کل رات تک آؤں گا۔“
 ”اور وہ، وہ کون تھا؟“ دل میں پھنسی بات زبان پر آئی گئی۔
 ”وہ کون؟“ رابعہ نے آپ کے بھی کان بھر دیے ہیں۔“ وہ کچھ سے کچھ سمجھ کر برسے۔
 ”وہ رحمت.....؟“ وہ ہکلائیں۔

”رحمت مسیح، اس کی میت اس کے شہر بھیج دی ہے، کچھ پیسے بھی ساتھ دیے ہیں۔“ وہ عجلت میں بتا کر آگے بڑھ گئے۔

”رحمت مسیح.....“ سہم زوہ ہونٹوں کے درمیان سے جملہ نکلا، ساتھ ہی دل کی بے قراری کو سکون سا آ گیا، انہیں انجانا سا خوف تھا جس میں درد اور ندامت کا احساس بھی شامل تھا کہ کہیں یہ وہ رحمت تو نہیں۔
 ”نہ نہیں..... اللہ نہ کرے.....“ بے اختیار ہی دل نے کہا تو رابعہ نے سن کر بے دھیانی میں پوچھ لیا۔
 ”کیا ہوا.....؟“

”ہاں! کچھ نہیں، وہ بس وہم سا تھا۔“ وہ چونک کر بولیں۔
 ”آپ وہم کے لیے پریشان تھیں، مجھے دیکھیں جو حقیقت جان کر بھی زندہ ہوں۔“ رابعہ نے جس انداز

”نہیں، وسیمہ نے اچھا نہیں کیا۔“ وہ جان گئی تھیں۔
 ”سب اچھا ہے بی بی، میں جہیز کا سامان ہی تو ہوں، سونا موتی، کپڑے لٹے، برتن، میز کرسیاں، قالین، مشین سب استعمال کے لیے آپ کو دی گئیں تو میں بھی کام کے لیے بھیجی گئی۔“
 ”نہیں، تم میرے لیے امید اور سہارا ہو، تمہارے ماں باپ نے، میرے ماں باپ نے جو بھی سوچا مگر میرے پاس تم نہ ہوتیں تو راجا صاحب مجھے مار ڈالتے۔“ وہ تڑپ اٹھیں۔
 ”ارے نہیں بی بی، راجا صاحب تو آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔“
 ”جانتی ہوں میں مگر تم کیا ہو میرے لیے یہ یاد رکھنا۔“ وہ تھوڑا سا جھکیں اور سکھاں کا ہاتھ تھام کر بولیں۔
 ”آپ وہم نہ کریں، یہ لیں دلیہ کھالیں۔“
 ”تم نے کچھ کھایا، نہیں کھایا ہوگا۔“
 ”مجھے تو بھوک کی خواہش بھی نہیں ہوتی، ماں اور باپ کی بھوک مٹاتے مٹاتے مجھے بھول گیا کہ بھوک بھی کوئی چیز ہے۔“ وہ اپنے آپ سے مخاطب تھی۔

”تمہاری طرح راجا صاحب نے میری بھوک مٹادی بلکہ میری ذات ہی مٹادی۔“ وہ دکھ سے کروٹ لے کر لیٹ گئیں۔

”ذات مٹ جائے تو اچھا برا احساس کہاں باقی رہتا ہے..... طلال نے کچھ غلط نہیں کہا..... میں نے ہی غلط سمجھ لیا..... میں بھول گئی، میرا یہاں سے کیا تعلق ہے، میری بی بی یہاں موجود ہیں، میں تو اُن کے لیے ہوں۔“ اپنے اندر کے غم کو متقل کر کے انہوں نے بڑی ہمت سے کروٹ لی اور آنکھیں موند لیں..... تو موقع پا کر رحمت چہم سے آ گیا۔

”سکھاں..... سکھاں! اب تو آنکھیں کھول دے۔“ ان کے کان میں کہا گیا تو جھٹ سے آنکھیں کھل گئیں مگر کمرے میں تو کوئی نہیں تھا۔

”اللہ کے بندے، کیوں میرے صبر کو آزمانے آ جاتا ہے؟“ انہوں نے خاصی بلند آواز میں اسے ایسے لتاڑا جیسے وہ بیچ بیچ ان کے سامنے کھڑا ہو، باتیں کر رہا ہو وہاں کوئی نہیں تھا مگر کچھ تو تھا کہ ایک بار پھر اُن کی بوڑھی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی..... نہ چاہتے ہوئے بھی وہ انہیں دکھائی دینے لگا۔ انہیں یہ احساس تڑپانے لگا کہ اگر رحمت ہوتا تو وہ طلال کے کڑوے جملے سننے کے لیے یہاں نہ ہوتیں۔ کچی سوندھی مٹی کے چھوٹے سے گھر میں اس کے ساتھ من چاہی زندگی بسر کر رہی ہوتیں۔

”یو! یو!“ دروازے پر فیضو نے آواز دی تو وہ ہوش کی دنیا میں آ گئیں۔
 ”ہاں، ہاں، فیضو.....“

میں کہا تو انہوں نے غور سے دیکھا، سرخ آنکھیں بے ترتیب بال، سلوٹ زدہ کپڑے کچھ بھی تو ٹھیک نہیں تھیں۔
 ”رابعہ! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“
 ”یہ حالت آپ کو پسند نہیں؟“ انہوں نے مدہم لہجہ میں پوچھا۔
 ”میری یہ حیثیت نہیں، بس اچھا لگنا چاہیے۔“ وہ طلال کے کڑوے جملے کے پس منظر میں بولیں۔
 ”جب اپنے گلے میں بازو ڈال کر تمام رات رونا پڑے تو ایسی حالت ہو جاتی ہے۔“ وہ صوفے پر گری گئیں۔

”کیا ضرورت ہے رونے کی، اسے تو پروا بھی نہیں رہی، تیار ہو کر شہر سے باہر چلا گیا۔“ وہ کافی سنجیدگی سے بولیں۔
 ”مجھے اس کے آنے جانے سے کچھ سروکار نہیں، بس وہ میری پروا نہ ہی کرے، ایک فریبی شخص کی پروا مجھے چاہیے بھی نہیں۔“ وہ بڑبڑائیں۔
 ”کیوں نہ کرے، اسے اس طرح آزادمت چھوڑو۔“
 ”ایسی کوئی خواہش میرے اندر نہیں رہی، مجھے تو دل ناداں کی تسلی کا کوئی افسانہ نہیں چاہیے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”رابعہ بیٹی! جانے کیا حقیقت ہے کیا افسانہ ہے.....؟“
 ”میں دادی کے پاس جا رہی ہوں، نیناں چاہے تو اسے بھی میرے ساتھ بھیج دیں۔“
 ”مگر ریحان.....“

”بوا! ریحان کی بات مست کیا کریں.....“ وہ الجھیں۔
 ”سمجھو، وہ شہر سے باہر گیا ہے، مجھ سے پوچھے گا اور نیناں کیسے آئے گی؟“
 ”بوا! میں نے رات بھر سلگ کر گزاری ہے، مجھے سکون چاہیے، میں رکشے پر جا رہی ہوں، نیناں کو رمان آکر لے جائے گا۔“

”رابعہ! فساد برپا ہوگا، طلال کو سمجھانا مشکل ہوتا ہے، اپنی نیناں کا خیال کرو۔“ انہوں نے بہت پیار سے سمجھایا تو وہ کٹی پٹنگ کے مانند دوبارہ اسی صوفے پر گر گئیں۔ نیناں ان کے لیے اہم تھی، بوانے سچ ہی کہا تھا کہ طلال کو سمجھانا مشکل ہے اور سچ سچ وہ کوئی طوفان برپا کر دے گا، رمان سے تو اسے ویسے ہی اللہ واسطے کا بیر تھا۔
 ”آپ کا مطلب ہے، میں گھٹ گھٹ کے مرجاؤں؟“ کچھ دیر بعد انہوں نے دھیماسا شکوہ کیا۔
 ”راکھ کو کریدنا چھوڑو، ریحان کے سچ جھوٹ کا فیصلہ اللہ پر چھوڑو، کبھی تو سب سامنے آئے گا مگر اس وقت تک کے لیے خود کو سنبھالو۔“ انہوں نے مشورہ دیا۔

”مگر کیسے؟ وہ میرے سامنے آتا ہے تو مجھے کوفت ہوتی ہے۔“
 ”کہانا کہ کچھ صبر سے کام لو، نیناں کے امتحان ہونے والے ہیں وہ پریشان ہوگی۔“
 ”میری نیناں کی قسمت اچھی ہو، وہ تو خود ڈسٹرب رہتی ہے۔“ وہ بولیں۔
 ”سب ٹھیک ہو جائے گا، میں ناشتا لے کر آتی ہوں۔“ بوانے تسلی دی۔

”گرم پانی اور روئی بھی، میرے سر سے خون نکلا تھا۔“ انہوں نے سر کے بال ہٹاتے ہوئے وہ حصہ انہیں دکھانا چاہا جہاں چوٹ لگی تھی، درو تھا اور بال خون سے تر ہو کر جڑ گئے تھے۔
 ”کیسے..... کیسے چوٹ لگی.....؟“ وہ تڑپ کر اس کے سر پر جھکیں۔
 ”اب تو سمجھ جایا کریں بوا.....“ زخمی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر کھیل گئی۔
 ”ارے بچی.....! بوا دکھی ہو کر فقط اتنا ہی بولیں اور باہر کو بھاگیں۔“

☆☆☆

نیناں گلاس وئیر انڈسٹری کا مونو گرام بن کر آ گیا تھا، طلال نے غور سے دیکھتے ہوئے منیجر کو واپس کر دیا اور کہا۔

”یہ ایم ڈی صاحب کی میز پر رکھ دیں، فائل تو انہوں نے کرنا ہے، میرے خیال میں تو ٹھیک ہے۔“
 ”جی بہتر.....“ منیجر صاحب یہ کہہ کر چلے گئے تو طلال اپنے دوست بلال کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”ہاں! کیا کہہ رہے تھے تم.....؟“
 ”پوچھ رہا تھا۔“
 ”کیا.....؟“

”تمہاری نیناں کا دماغ نیچے آیا کہ نہیں؟“
 ”سور کی یار..... تیز سے، نیناں میری عزت ہے.....“ اسے اچھا نہیں لگا۔
 ”سوری، ویسے عزت اور محبت میں فرق ہوتا ہے۔“ بلال نے معذرت کے ساتھ ہی ٹکڑا لگا دیا۔
 ”جس سے محبت ہو اس کی عزت بھی کی جاتی ہے۔“
 ”یار! تم تو سنجیدہ ہی ہو گئے۔“

”ایسی بات نہیں ہے، بس نیناں میرے لیے بہت ایشیل ہے۔“ اس نے اعتراف کیا۔
 ”جانتا ہوں، اس کے نام سے سارا کاروبار منسوب کر دیا ہے اس سے زیادہ اہم بات کیا ہوگی۔“
 ”یہ ماموں کا فیصلہ ہے۔“
 ”اور تمہارا کیا رہا؟“ بلال نے کچھ ذومعنی انداز اختیار کیا۔
 ”میرا سب کچھ، نیناں میری تو سب میرا.....“
 ”اور اگر نیناں نہ مانی تو.....“

”ماموں مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں، نیناں کی نہیں ماموں کی مرضی چلے گی۔“ وہ بولا۔
 ”پھر بھی اسے کچھ تو اختیار ہوگا؟“

”میں جانتا ہوں، کچھ بھی ہو نیناں میری ہی ہے۔“ وہ وثوق سے بولا۔
 ”اور وہ جو تم اس کے کزن کی بات کر رہے تھے؟“ بلال نے کہا۔
 ”وہ اوور اسمارٹ بننے کی کوشش کرتا ہے مگر ہاتھ کچھ آنے والا نہیں.....“ اس نے خاصے فخریہ انداز میں سینہ پھلا کر کہا۔

”او کے! دوش یوگڈ لک، میں اب چلتا ہوں بیگم صاحبہ کھانے پر انتظار کر رہی ہوں گی۔“ بلال اٹھ کھڑا ہوا تو اسے بھی ایک دم یاد آیا نیناں کو کالج سے لینا تھا۔ وہ بھی ساتھ ہی باہر نکلا اور اپنی گاڑی کی طرف تیزی قدموں سے گیا جبکہ بلال نے اپنی گاڑی کی جانب رخ کیا..... طلال نے گاڑی سیدھی کر کے نکالی ہی تھی کہ موبائل فون بجنے لگا..... ان فون نمبر دیکھ کر اس نے فون ریسیو نہیں کیا مگر بار بار فون آنے کی صورت میں اٹینڈ کرنا پڑا۔

مسکرا دی۔

”بالکل اپنی مہمانی طرح مسکراتی ہو۔“ گیٹ پر گاڑی روک کر ہلکا سا ہارن دے کر انہوں نے غیر اراچی طور پر کہا۔

”میری مہمانی بھی ہوں گی، یہ سن کر حیرت ہوتی ہے۔“ گاڑی سے اترتے ہوئے وہ بولی۔

”کیوں، آپ نے مہمان کو کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔“ پورچ سے مین دروازے کی طرف چلے ہوئے انہوں نے پوچھا تو اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔۔۔۔۔ اب سبحان کے چوتھے کی باری تھی۔

”کمال ہے، رابعہ تو مسکراتے کا، قہقہہ لگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔“ وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں پہنچ چکے تھے۔

”جیتے رہے سبحان میاں۔۔۔۔۔“ زیتون بیگم نے تشکر آمیز لہجے میں دعا دی تو انہوں نے جانے کی اجازت طلب کی۔

”اجازت دیجیے، تاپا ابا فکر مند ہوں گے۔“

”ارے ابھی نہیں، رابعہ سے مل کر جانا، اسے رمان لے کر آئے گا۔“

”ہاں! سبحان انکل پلینز۔۔۔۔۔“ نیناں نے بھی اپنا نیت سے کہا۔

”نہیں دادی، میں پھر آ جاؤں گا، رمان نے دوسرے شہر سے آنا ہے اور پھر رابعہ کو لانا ہے۔۔۔۔۔ میرے تاپا ابا شہر میں منادی کرادیں گے۔“ انہوں نے بڑے جولی موڈ میں کہا تو زیتون بیگم نے اجازت دے دی۔ نیناں ہلکی سی اداس ہو گئی۔

”آپ ہمارے گھر آیا کریں، مہمان کو خوشی ہوگی۔“ وہ بولی۔

”کاش! میں ایسا کر سکتا۔“ وہ خود بھی اداس ہو گئے۔

”بس اللہ ہی میری رابی کو خوش رکھے، آمین۔“ زیتون بیگم نے بے اختیار ہی دعا کی۔

”او کے اللہ حافظ۔۔۔۔۔“ وہ بولے۔

”اللہ حافظ۔۔۔۔۔“ اس کے لبوں سے بڑی مشکل سے ادا ہوا شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ جائیں۔ ان سے باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا مگر وہ چلے گئے تب وہ بڑی امی کہہ کر ان سے لپٹ گئی۔۔۔۔۔ وہ اسے لپٹائے پلٹائے صوفے پر بیٹھ گئیں۔۔۔۔۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں گلو اس کے لیے ٹرے میں کھانا لے کر وہیں آ گیا۔

”چلو جلدی سے ہاتھ دھو کر آؤ۔“

”مگر بڑی امی مجھے تو بھوک نہیں ہے۔“

”فضول باتیں نہیں بلکہ لاؤ گلو ہم خود نیناں کو کھانا کھلائیں گے۔“ انہوں نے گلو کے ہاتھ سے ٹرے لے کر سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

وہ تینوں زیتون بیگم کے کمرے میں تھے۔ رمان سفر کی تھکان کے باعث بیڈ پر ترچھا سا لیٹا تھا۔۔۔۔۔ رابعہ

اور نیناں بڑے عرصے بعد ٹی وی کی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں۔ زیتون بیگم۔۔۔۔۔ کمرے میں آئیں تو ایک دم ہی رمان نے ایک آنکھ کھول کر دیکھا اور کہا۔

”کسی کو میرا خیال نہیں۔۔۔۔۔“

”ہیں! یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ زیتون بیگم نے کہا۔

”آپ دیکھ رہی ہیں دونوں ماں بیٹی کتنی محو ہیں، میں رابی خالہ کو لے کر آیا ہوں اور یہ آ کر بیٹی کے ساتھ بیٹھ گئی ہیں۔“

”رمان بھائی! آپ لڑائی کے بہانے کیوں ڈھونڈتے ہیں؟“ نیناں نے کہا۔

”زیادہ باتیں نہ بناؤ، آج کا ٹیسٹ دو لے کر کاغذ چین۔“ وہ اکڑ کر بولا۔

”میں نے ٹیسٹ تیار نہیں کیا۔“

”کیوں، تمہیں اندازہ ہے نیناں بیگم کہ امتحان کتنے قریب آچکے ہیں؟“

”دراصل۔۔۔۔۔“ وہ ہکلائی۔

”اچھا، اچھا جاؤ کافی بنا کر لاؤ۔“ اس نے شرارت سے حکمانہ لہجے میں کہا تو اسے برقی روچھو گئی۔

”یہ میری بڑی امی کا گھر ہے یہاں میں آپ کی نوکر نہیں ہوں۔“

”واہ! تو یہ میری بھی بڑی امی کا گھر ہے، میں یہاں کا مالک ہوں۔“ وہ دودھو ہو گیا۔

”ہونہ، کیا مصیبت ہے۔۔۔۔۔؟“ نیناں پاؤں پیچھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔۔۔۔۔ تو رابعہ اور زیتون

بیگم نے اسے گھیر لیا۔

”رمان کیوں ستاتے ہو؟“

”رابی خالہ! آپ نہیں جان سکتیں۔۔۔۔۔“ وہ مسکرایا۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”ابھی تو آپ کی بونگی بیٹی نہیں جان سکی، کیوں بڑی امی؟“ اس نے شرارت سے آنکھ دبا کر زیتون بیگم کو

مخاطب کیا۔

”شریر! خبردار جو میری نیناں کو بونگی کہا۔“ زیتون بیگم نے اسے لتاڑا۔

”بونگی ہی تو ہے، کچھ بھی نہیں سمجھتی۔“

”جو آپ اسے سمجھانا چاہتے ہو وہ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔“ رابعہ نے گھور کر جواب دیا تو وہ کھلکھلا کر

ہنس دیا مگر منستے ہنستے اسے بریک لگ گئی۔ گلو کی ہمراہی میں طلال بڑے کروفر کے ساتھ آ رہا تھا۔ وہ تینوں چپ

سے ہو گئے تو گلو نے ہی زبان کھولی۔

”میری بیوی مرحومہ کتنی تھی مہمان اللہ کی رحمت ہوتا ہے۔“

”بہت بہت شکریہ! آپ نے معلومات عطا فرمائیں۔“ رمان نے طلال کو نظر انداز کر کے گلو کی بات کا

مذاق اڑایا۔

”بیٹھو طلال بیٹا۔۔۔۔۔“ زیتون بیگم نے کہا تو اراچی رسم رمان نے اس سے مصافحہ کیا۔

”جی شکر یہ، جلدی ہے، چلیں ماما.....“ طلال نے رابعہ کو مخاطب کیا۔

”ارے ایسی بھی کیا جلدی، میں چائے بنواتی ہوں۔“ زیتون بیگم گلو کو اشارہ کرتے ہوئے باہر چلی گئیں۔

”طلال! ریحان اختر نے دو ڈرائیور رکھے ہوئے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر آپ کو ہمارے لیے کیوں آنا پڑتا ہے؟“ رابعہ کو چڑسی تھی۔

”یہ ماموں سے ہی پوچھیے گا، مجھے بزنس ڈنر پر جانا ہے آپ جلدی چلیں۔“ وہ خشک سے لہجے میں ابرو چڑھا کر بولا۔

”یار! آپ جاؤ میں چھوڑ دوں گا۔“ رمان نے آفر پیش کی جو کہ طلال کو اور زیادہ بری لگی۔

”کیوں اس اتنے بڑے گھر میں ایک بھی ڈرائیور نہیں.....؟“

”ہم اپنوں کو پیار سے لاتے اور لے جاتے ہیں۔“ رمان نے چسکا لیا۔

”طلال! ہم کل آئیں گے، میں نے بوا کو فون کر دیا ہے۔“ رابعہ نے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگیں۔

”بوا گھر کی ملازمہ ہیں ماما.....“ اس نے جتایا۔

”وہ آپ کی نانو کے ساتھ اس گھر میں آئی تھیں سمجھے.....“ رابعہ نے مڑ کر تلخ جواب دیا تو وہ احساس توہین سے سرخ پڑ گیا۔

”مگر وہ میری نانو نہیں ہیں۔“

”کون کیا ہے اس بحث میں مجھے نہیں پڑنا.....“ رابعہ یہ کہہ کر چلی گئیں تو طلال بھی پھٹکا رہا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”بیٹھو یار! بڑی امی چائے بنا چکی ہوں گی.....“ رمان نے کہا۔

”میں جلدی میں ہوں.....“ اس نے تن کر کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

میڈم حمیدہ کی آنکھوں میں جلال ہی جلال تھا۔ وہ دونوں خفت و خجالت سے سر جھکائے کھڑی تھیں..... ان کے پیچھے اور چند طالبات موجود تھیں۔

”خود سوچو، تینوں ہاؤس سز کے ڈرامے تیار ہیں اور ہم انکار کر کے مطمئن ہیں۔“ انہوں نے لتاڑا، وہ چپ رہیں تو وہ اور زور سے گر جیں۔

”جواب دو مدیحہ رمضان، نیناں ریحان، میں پرنسپل کو کیا جواب دوں؟“

”سوری میڈم!“ نیناں نے کہا۔

”فارواٹ امیری بے عزتی کرانے کے لیے؟“ وہ تاؤ کھا گئیں۔

”ایکچھلی! میڈم میں نے انکار ڈرامے سے نہیں، اس ڈرامے سے کیا ہے، اس کردار سے کیا ہے.....؟“ مدیحہ میں ایک دم ہی جرات آگئی کہ میڈم حمیدہ سے غصے کی پروا کیے بغیر کہہ دیا۔

”کیا..... کیا کہا.....؟“

”مجھے یہ کردار نہیں کرنا، آپ کسی اور سے کروالیں۔“

”اس وقت لاسٹ اسٹیج پر آپ مجھے مشورہ دے رہی ہو؟“ انہوں نے سختی سے پوچھا۔

”سوری میڈم!“ وہ فقط اتنا بولی۔

”یہ ڈراما تو کرنا ہے، میں پرنسپل صاحبہ کو کیا جواب دوں گی؟“

”میڈم! آپ مدیحہ کی جگہ کسی اور کو یہ کردار دے دیں۔“ نیناں نے لقمہ دیا۔

”تو پہلے یہ کہنا تھا، اب کس کا آڈیشن لوں اور کس کو رہنمائی کراؤں.....؟“ وہ پھر خاموش ہو گئیں۔

”میڈم حمیدہ غصے سے لال پیلی ہو گئیں۔“

”گیٹ آؤٹ، جلی جائیں آپ لوگ.....“

”سوری میڈم!“

”نوسوری، میں نے کہا کہ آپ لوگ جائیں.....“ وہ سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ نیناں کو ان پر خاصا ترس

آیا۔ باہر آ کر اس نے مدیحہ کو کچھ سختی سے لعن طعن کیا۔

”اپنے استاد کی تمہاری نظروں میں ذرا سی بھی عزت نہیں۔“

”نیناں! اپنی حد میں رہو، میری سہیلی ہو بس.....“ مدیحہ کو جانے کیا ہو گیا تھا۔ نیناں دنگ رہ گئی۔

”مدیحہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ معمولی سی بات کو ضد بنالی۔“

”بس یہی تو بات ہے..... معمولی جان کر ہم عمر بھر اس کی سزا بھگتتے ہیں۔“

”ویسے بات کیا ہے؟ مجھے بتاؤ، کیوں ڈسٹرب ہو؟“ نیناں کو سنجیدہ ہونا پڑا کہ کچھ تو ہے۔

”بڑے لوگوں کو بتانے سے فائدہ.....؟“ مدیحہ نے ایک دم طنز کیا۔

”کیسی باتیں کرتی ہو..... فارگا ڈسک.....!“ نیناں کو غصہ آ گیا اور رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”سوری نیناں، بات کچھ نہیں ہے، بس میں نے ہی زیادہ محسوس کر لی ہے۔“ وہ کچھ شرمندہ سی ہو کر

بولی۔

”اٹس اوکے! لیکن مجھے یقین ہے کہ کچھ نہ کچھ ہے۔“ نیناں نے اس کی تسلی کو دل سے قبول نہیں کیا۔

اسی وقت بریک ٹائم ہو گیا۔ مدیحہ نے اپنے بیگ سے اخبار میں لپٹا پراٹھا اور آلیٹ نکالا اور بیچ پر

درمیان میں کھول کر اسے دعوت دینے لگی تو نیناں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”میں ناشتا کر کے آئی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔“ مدیحہ نے منہ میں نوالہ ڈالتے ہوئے کہا اور تیزی سے کھانے لگی، نیناں کو صاف اس کے

کھانے کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اپنے اندر کی لڑائی کو چھپانا چاہ رہی ہے مگر اس وقت کچھ بھی پوچھنا

مناسب نہیں تھا لہذا وہ انگلش کا ناول نکال کر ورق گردانی کرنے لگی جبکہ مدیحہ دنیا دہانیہا سے بے خبر مزے سے

ٹھنڈا پراٹھا کھانے میں مگن رہی اسے دائیں بائیں آنے جانے والوں کی تنقیدی نگاہوں کی بھی پروا نہیں

تھی..... اپنی حیثیت اور اوقات میں مست مدیحہ کو اپنی آپا کے لفظوں کا پاس تھا۔

☆☆☆

کئی روز سے ہونے والے گھٹنے کے درد نے شدت اختیار کر لی تھی۔ طاہرہ اور دعا بہت خیال رکھ رہی

تھیں۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ریست کی پابندی، دوائیں استعمال کرانا..... دعا تو عارفہ کی پٹی سے لگ گئی

تھی..... رمان کو ماں کی فکر بہت تھی لیکن تھوڑی سی بے فکری بھی تھی کہ ماں کی دیکھ بھال ہو رہی ہے۔

ماسی نے واشنگ مشین لگائی تو دعا نے جلدی جلدی بیڈ شیٹس، سٹیکے کے کور، رمان اور عارفہ کے واش روم

سے میلے کپڑے اس کو لا کر دیے۔ عارفہ نے آواز دے کر کہا۔

”دعا بیٹا! رمان کی عادت ہے کہ وہ کمرے میں بھی دائیں بائیں شرٹس اور بنیان وغیرہ ڈال دیتا ہے۔“

”جی مامی.....“ وہ تو اس کو اپنی خوش بختی سمجھتی تھی کہ رمان کو چھو کر گزرنے والی ہوا کو بھی ہاتھوں میں تھام

لے، بانہوں میں بھر لے لیکن ایسا ہو نہیں سکتا تھا، وہ لپک کر اس کے کمرے میں گئی تو سچ سچ بیڈ کے دوسری طرف

عجلت میں اتار کر پھینکی ہوئی سوئٹ پنک شرٹ پڑی تھی۔ اس نے بڑی اپنائیت سے اسے اٹھایا، بے اختیار ہی

مٹھیوں میں دبا کر ناک کے نتھنوں تک لائی اور پھر رمان کے بدن کی مخصوص مہک اور پرفیوم کی سحر انگیز خوشبو

نے مل کر اسے بے خود بنا دیا..... آنکھیں موند کر وہ اس معطر احساس کو اپنی روح تک میں اتار لی رہی۔

”رمان! خدا کے لیے، بس ایک پل، صرف ایک پل ایسا مہکا مہکا سادے دوجس میں زندگی کی ساری

خوشیاں ہوں، تمہارا سارا پیار ہو۔“

”ہوں! دیکھو کپڑے سو گھنٹے سے کپڑوں کے رنگ خراب ہو جاتے ہیں اور سو گھنٹے والے کو دمہ ہو جاتا

ہے۔“ پشت پر سے رمان کی شوخ آواز آئی تو وہ چونکی شرٹ ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ شرمندہ سی ہو کر نظریں

جھکا لیں۔

”ویسے میری چند شرٹس جو بے رنگ سی ہو گئی ہیں، وجہ آج معلوم ہوئی ہے۔“ اس نے اس کی چپ اور

شرمندگی سے فائدہ اٹھایا۔

”وہ شرٹس نیناں کو دے دو، اس کے سو گھنٹے سے ٹھیک ہو جائیں گی۔“ وہ حواس بحال کر کے حملہ آور

ہوئی۔

”خالی شرٹ اسے کیوں دوں.....؟“ اس نے مزہ لیا۔

”ہوں! جانتی ہوں۔“

”پھر ایسی باتیں کیوں کرتی ہو ڈیئر.....؟“ وہ ضروری کاغذات لینے کے لیے گھر آیا تھا، کمرے میں

اسے دیکھ کر شرارت سو جھ گئی..... یاد آیا تو الماری کھول کر مطلوبہ کاغذات کی فائل نکالنے لگا۔

”بہت ناز ہے اس بات پر.....“ وہ دکھی سی ہو گئی۔

”کس بات پر.....؟“ فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے بے دھیانی سے پوچھا۔

”کہ نیناں بھی تمہیں گھاس ڈالے گی۔“ وہ جمل کر بولی۔

”نیناں پاگل ہے کیا کہ ایک خوب رو نو جوان کو گھاس ڈالے۔“ اس نے فائل بند کر کے پوری طرح متوجہ

ہو کر جواب دیا۔

”نیناں..... نیناں، بس کرو میرے کان پک گئے ہیں۔“ اسے شدید غصہ آ گیا۔
 ”دعا فاطمہ! تمہارا دماغ چل گیا ہے، میں کہتا ہوں ظاہرہ پھیو کو کہ تمہارا علاج کروائیں۔“ وہ کہتا ہوا باہر نکل گیا تو اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے موٹی ٹوٹ کر برسے گئے۔ کس حسرت سے اس کے بدن کی لطافت کو محسوس کیا تھا، کس چاہ سے تمنا کی تھی سب ہوا میں اڑا کے وہ چلا گیا۔ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ کر وہ اشک بہانے لگی۔

”رمان! تم کس قدر سنگ دل ہو، میری چاہت تمہیں دکھائی نہیں دیتی اور جو تمہیں دیکھتی نہیں وہ تمہارے ذہن میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔“ اس نے سائنڈ میبل پر مسکراتی رمان کی تصویر سے کہا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ کچھ لمحات اسی کیفیت میں گزر گئے تب شرٹ اٹھا کر افسردہ خاطر سی باہر آ گئی۔ عارفہ نے بلایا تو آنکھیں صاف کر کے ان کے کمرے میں آ گئی۔

”جی مائی!“
 ”دعا مجھے اچھا نہیں لگتا کہ آپ خود پراتنا ظلم کرو۔“ اس کی نم آلود آنکھوں نے راز افشا کر دیا۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ انجان بن گئی۔

”بیٹا، مجھے بہت شرمندگی محسوس ہوتی ہے، میں کیسے آپ کو سلگتا دیکھوں؟“
 ”مائی، مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے آپ میری فکر نہ کریں۔“ اس نے تسلی دی۔
 ”دعا بچے میں رمان کی ماں ہوں، اسے اچھی طرح جانتی ہوں لہذا میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنی ماں کی بات مان لو جو بھی اب آئے اسے قبول کر لو۔“ انہوں نے خاصا بے تکلف رویہ اختیار کیا تو اسے اچھا نہیں لگا۔

”مائی! آپ مجھے راستے سے نکالنا چاہتی ہیں، رمان کی مرضی پوری کرنا چاہتی ہیں۔“
 ”ارے نہیں میری بیٹی۔“ وہ تڑپ اٹھیں اسے گلے لگا لیا۔
 ”کاش..... میں ایسا کر سکتی۔“ اس کا گلارندہ گیا۔

”اور کاش! میرا کوئی دوسرا بیٹا بھی ہوتا مگر کیا کروں؟“ وہ شکست خوردہ سی ہو کر بولیں۔
 ”آپ پریشان نہ ہوں اللہ مالک ہے۔“ وہ بڑے پیار سے کہہ کر چلی گئی۔ عارفہ مضحکہ خیز اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں لیے کچھ سوچتی رہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس پاگل سی لڑکی کو کیا سمجھائیں اور کس طرح بتائیں کہ دشت طلب میں کبھی بھی انسان کی اتنی سی اوقات رہ جاتی ہے کہ سکے کی طرح دست گداگر پر جا گرتا ہے..... یہ طلب کا صحرا بے نشان، بے نور ہوتا ہے اس میں دیوانگی کا مقام کسی پنوں جیسا ہے مگر ان کے لیے جو ایک طرف آگ میں جل رہے ہوں وہ صرف صحرا کی دھول کے سوا کچھ نہیں پاتے۔ انہوں نے دعا سے محبت کے باعث اس کے حوالے سے سوچا۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم کی لائٹس آن دیکھ کر ریحان اختر وہیں آ گئے۔ رمان، نیناں کو پڑھا رہا تھا۔ انہیں غیر معمولی خوشی ہوئی اندر آ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

”رمان یار، میری نیناں کو مستحس کا چیمپیئن بنادو۔“ ان کی ہر خوشی کا مرکز نیناں تھی اس لیے انہوں نے

وہیں سے بات شروع کی۔
 ”معاف کریں انکل، نیناں کا دماغ ہے ہی نہیں اور مستحس دماغ والے سیکھتے ہیں۔“ وہ شرارت سے باز نہیں آیا۔ نیناں نے خشکیوں نگاہوں سے دیکھا۔
 ”نہیں، نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، یہ دماغ کے معاملے میں اپنے دادا پر گئی ہے۔“ ریحان اختر کا لہجہ فخر سے رنگین ہو گیا، سینہ پھول گیا۔

”آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میرا تو مشورہ ہے کہ نیناں کی آنکھیں، کان سب چیک کرائیں۔“
 ”وہ معنی جملہ کہہ کر نیناں کی طرف دیکھا۔
 ”جی نہیں، میں دیکھ سکتی ہوں، سن سکتی ہوں۔“

”ہا..... ہا ہا ہا.....!“ ریحان اختر نے قہقہہ لگایا۔
 ”اچھا یہ بتاؤ تو میں کیسا دکھتا ہوں، کیسا بولتا ہوں؟“ اس نے مزید تنگ کیا تو وہ جپ ہو گئی۔
 ”بتاؤ کہ آپ اچھے ہو۔“ ریحان اختر نے نیناں سے کہا مگر وہ نظریں نیچی کر کے پیچھے رہی۔

”دیکھا آپ نے، یہ بول بھی نہیں سکتی۔“ رمان نے موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔
 ”آپ کام کرو، میں فریش ہو کر آتا ہوں پھر گپ شپ کریں گے۔“ ریحان اختر نے کہا اور اٹھ کر باہر چلے گئے تب نیناں نے غرا کر اسے دیکھا۔
 ”ایسے کیا دیکھ رہی ہو سفید بلی؟“

”رمان بھائی آپ.....“ اس نے انگلی کے اشارے سے غصے کا اظہار کیا مگر اس نے بڑے پیار سے اس کی انگلی پکڑ کر نرمی سے کہا۔
 ”کتنی بار کہا ہے کہ طلاں بھائی اور رمان احمر صرف رمان ہے تمہارے لیے۔“ اس کی آواز کا زیروہم اور آنکھوں میں چھپا شوق کا عالم..... نیناں کچھ گڑبڑا سی گئی جلدی سے نوٹ بک پر نظریں جمالیں۔

”اب جواب دو ناں!“
 ”وہ بس آج اتنا کام کافی ہے، باقی کل۔“ وہ یکدم ہی چیزیں سمیٹنے لگی۔
 ”ٹھیک ہے، میں رابی خالہ سے مل لیتا ہوں۔“

”یہ بابا سے پوچھنا تھا۔“
 ”کیا مطلب؟“
 ”مجھے نہیں معلوم۔“

”کیوں، کیوں معلوم نہیں؟“ اس نے جرح کی۔
 ”مما سوئی ہوں گی اور بابا بول رہے ہوں گے۔“ وہ فقط اتنا کہہ کر باہر چلی گئی جبکہ وہ الجھن کا شکار ہو گیا۔ اس کی بات میں عجب سا اسرار تھا۔ الجھا الجھا سا باہر نکلا تو قدم پتھر کے ہو گئے۔ انکل ریحان کی غصیلی آواز اور رابی خالہ کا احتجاج صاف سنائی دے رہا تھا۔

”جی تو چاہتا ہے کہ تمہارا گلا دبا دوں مگر پھر خیال آ جاتا ہے۔“ ریحان انکل کی آواز تھی۔

”یہ حسن سلوک کر ہی ڈالو..... میری بھی یہی خواہش ہے۔“

”گوا اس بند کرو مجھے اپنی بیٹی کا خیال ہے ورنہ.....“

”ورنہ کیا، بتاؤ بیٹی کو کہ تمہاری اصلیت کیا ہے؟ دکھاؤ وہ ثبوت جو تم نے غائب کر دیے ہیں۔ کاش..... میں نے تم سے شادی کا فیصلہ ہی نہ کیا ہوتا۔“

”ہا..... تو نہ کرتیں، کر لیتیں اس دو ٹکے کے پروفیسر سے..... اب بھی کچھ نہیں بگڑا وہ اب تک اکیلا ہے۔“

”وہ تم سے بہتر تھا اور بہتر ہے۔“ چٹاخ، چٹاخ۔

”اوہ گاڈ۔“ رمان غصے سے کھول اٹھا جذباتی ہو کر اندر جانا چاہا مگر روتی ہوئی نیناں بھاگ کر آئی اور کچپکپاتے ہوئے بولی۔

”میری ماما، میری ممانیں مل سکتیں، جاؤ آپ.....“ وہ اس کی حالت دیکھ کر تیز قدموں سے نکل آیا۔ مزید وہاں رک کر اپنا ٹیمپرامنٹ لوڑ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ مداخلت کا موقع نہیں تھا لہذا دور اندیشی کا تقاضا یہی تھا کہ خاموش رہا جائے۔ یہی سوچ کر وہ نکل آیا۔

☆☆☆

”اُف تو یہ ہے بھی خواتین کے ساتھ بازار آنا کڑا امتحان ہوتا ہے۔“ مدیحہ اور آپا کو بازار کی بھیڑ میں گم ہوئے گھٹنے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ چند منٹ کا کام کہہ کر مدیحہ نے منت کی تھی مگر اب چھوٹے سے پُرجوم بازار کے باہر موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے اتنا وقت ہو گیا کہ اسے غصہ آ رہا تھا۔ بار بار رست واپس پر نگاہ ڈال کر بڑبڑاہٹ میں برا بھلا کہہ رہا تھا لیکن کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

”چلیں زلفی بھائی۔“ پشت سے مدیحہ کی آواز آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ شاپنگ مکمل ہو گئی۔

”میڈیکل اسٹور ہمارے ابا سرخوم کا نہیں ہے۔ میں وہاں ملازم ہوں، کتنا وقت لگا دیا۔“ زلفی کے منہ سے چنگاریاں نکلیں۔ ارد گرد کے خیال سے آپا نے اس کا کندھا دبا تو وہ کچھ دھیرے سے بولا۔

”آپا اس بے ہودہ بازار میں یوں موٹر سائیکل پر انتظار کرتا انسان احمق لگتا ہے اور مارکیٹیں بند تھیں کیا؟“

”اور مارکیٹیں زلفی! گاڑیوں کے حوالے سے بنی ہیں۔ ہم وہاں کیسے جائیں۔“ آپا نے چادر سنبھال کر اس کا کندھا پکڑ کے موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ مدیحہ نے ان کی تائید کی اور اچک کر خود بھی بیٹھ گئی۔

”بھائی صاحب، وہاں نہ ہم جا سکتے ہیں نہ ہماری حیثیت ہے۔ ہم نے پانچ سو روپے کا سوٹ لیا ہے، یہ اس بازار میں ہی ملتا ہے۔“

”تم عورتوں سے اللہ بچائے۔“ زلفی نے کہا اور سلسلو موٹر سائیکل بھیڑ کے درمیان سے نکالی کھلی سڑک پر نکلے ہی مدیحہ ایک دم چلائی۔

”روکو، روکو یہ تو نیناں ہے۔“ زلفی نے جھٹکے سے بریک لگائے۔

”کیا مصیبت ہے؟“

”وہ سامنے پلازہ کی پارکنگ میں ابھی گاڑی گئی ہے پلیز ذرا دیر کو چلیں۔“ مدیحہ نے سامنے دیکھتے ہوئے بے تابی سے کہا۔ زلفی کے شدید رد عمل سے پہلے ہی آپا نے بات سنبھال لی۔

”چلو دو منٹ کے لیے لے چلو۔“ زلفی آپا کی بات رد نہیں کر سکتا تھا مجبوراً موٹر سائیکل سامنے کی طرف لے آیا۔ نیناں اتر کر ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ مدیحہ کی آواز پر مڑ کے دیکھا اور واپس باہر آ گئی۔

”میں نے گاڑی دیکھی اور زلفی بھائی کو کہا کہ نیناں سے ملنا ہے۔“

”آپ بے نیناں آپا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ہاں، یہ میری پیاری پیاری سی آپا ہیں یعنی حقیقی پھوپھو ہیں اور یہ میرے زلفی بھائی ہیں۔“ مدیحہ نے تعارف کرایا۔

”پھوپھو اور آپا.....“ وہ بولی۔

”ان کے امی ابا مجھے آپا کہتے ہیں بس یہ بھی آپا ہی کہنے لگے۔“ سرمئی بالوں پر سلیقے سے سفید چادر جھائے انتہائی متانت سے آپا نے ہی وضاحت کی، نیناں ان کے لب و لہجے سے بہت متاثر ہوئی۔

”آپ سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ مدیحہ ہر وقت آپ کا ذکر کرتی ہے۔“

”دو دنوں ہی میری کل کائنات ہیں۔“ انتہائی پُر مٹھاس لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

”چلیں۔“ زلفی نے یاد دہانی کرائی۔

”اوہ نیناں بس ہم چلتے ہیں، دیر ہو رہی ہے۔ زلفی بھائی نے کام پر جانا ہے اور میں نے بھی امی کے ساتھ کچھ بنانا ہے۔“ مدیحہ نے تیزی سے بتایا۔

”کہاں آئی تھیں یہ تو بتایا ہی نہیں؟“ نیناں کو یاد آیا۔

”وہ وہاں اندر چھوٹے سے بازار میں، آپا کے لیے سوٹ خریدنا تھا۔“ مدیحہ نے ہاتھ سے اس طرف اشارہ کیا جہاں بازار تھا۔

”تو یہاں سے خرید لیتیں۔“ نیناں بھولپن سے کہہ گئی۔

”یہاں سے خریدنے کے لیے بیچنے کو ہمارے جیسے لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہوتا بیٹا۔“ آپا نے کہا تو وہ خفت سے صرف ہونٹ پھیلا کر رہ گئی، مسکرا نہیں سکی۔

”نیناں آج میری طرف آؤ پلیز۔“ مدیحہ نے ایک دم فرمائش کی تو نیناں سوچ میں پڑ گئی۔

”وہ، میں..... وہ ماما سے پوچھ کر بتا دوں گی۔“

”مدیحہ بے زلفی نے چلا کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو وہ دونوں نیناں کو خدا حافظ کہہ کر موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی ان تینوں کا تجزیہ کرتی رہی پھر اچھا سوچ کر اندر واپس آ گئی مگر یہ سادہ سے بے پاک سے لوگ اسے اچھے لگے پرانی سی پینٹ شرٹ میں ملبوس آزاد بے فکر نوجوان، سادہ بادقاری آپا جن کا سونی معمولی سا لباس بہت صاف ستھرا اور پاکیزہ سا تاثر قائم کر رہا تھا اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ ان کے گھر جائے بہت سا وقت وہاں بتائے۔

☆☆☆
مدیحہ کے گھر جانے کی خواہش سب سے پہلے اس نے بوا کے سامنے ظاہر کی تو انہوں نے پہلانے کی کوشش کی۔

”چھوڑو بیٹا، دو ہفتے بعد امتحان شروع ہونے والے ہیں۔“
”بوا تھوڑی دیر کے لیے بس۔“

”اپنے بابا کو جانتی نہیں؟“ بوا نے دھیر سے کہا تو رابعہ نے واش روم سے نکلتے ہوئے سن کر کہا۔
”خدا نہ کرے کہ میری بیٹی ریحان اختر کو جانے۔“
”مما، بابا مجھے آنے جانے سے تو نہیں روکتے۔“

”نینا، جب یہ بتاؤ گی کہ کہاں جانا ہے تو پھر باپ کا اصل چہرہ نظر آئے گا۔“
”یعنی.....“

”چھوڑو بیٹا آپ اپنے کمرے میں جا کر پڑھائی کرو۔“ بوا نے نینا کو ٹانے کی غرض سے کہا۔
”مما مجھے جانا ہے، وہ لوگ اتنے اچھے ہیں کہ کیا بتاؤں۔“ نینا نے براہ راست ماں سے کہا۔
”بوا جانے دیں نینا کو..... یہ تو اچھے لوگ دیکھے، انہوں نے بہت سنجیدگی سے کہا تو بوا نے جواب کے لیے جلدی اختیار کی۔

”نینا کو تو سب اچھے لگنے دو کیونکہ لوگ تو سبھی اچھے ہوتے ہیں بس بھاگ دغا نہ دیں۔“ رابعہ ان کے لہجے کی گہرائی میں اتر کر خاموش ہو گئیں کیونکہ خاموشی ہی بہتر تھی۔
”مما پلیز۔“ نینا نے پھر منت کی۔

”کوئی اور بات کر دوسرے کھاؤ۔“ رابعہ جھنجھلا سی گئیں۔
گیٹ پر گاڑی کا ہارن بجا تو بوا نے مسکرا کر نینا کو مخاطب کیا۔
”جاؤ جلدی سے تیار ہو جاؤ، رمان بیٹا آ گیا ہے اس کے ساتھ جانا۔“
”ہیں سچ۔“ نینا، رمان کے ساتھ جانے پر بھی راضی ہو گئی۔ خوشی سے چلائی یہ پہلا موقع تھا کہ نینا رمان کے ساتھ جانے پر اتنا خوش ہوئی۔ بوا اور رابعہ نے واضح طور پر محسوس کیا۔ وہ چھلانگ مار کر تیار ہونے چلی گئی اور رابعہ نے بوا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”رمان کے ساتھ جانے پر ریحان اختر کو اعتراض نہیں ہوتا۔“ طلال کے ساتھ جانے پر نینا پریشان ہوتی ہے۔“ انہوں نے انتہائی دور اندیشی سے کام لیا تھا، رابعہ ان سے متفق ہو گئیں۔
”اور طلال جو آگ بگولہ ہوتا ہے اسے رمان ایک نظر نہیں بھاتا۔“
”یہ سچ ہے لیکن ریحان کو تو رمان کے آنے جانے پر اعتراض نہیں۔“
”مجھے نینا کی فکر لاحق ہے طلال کی خود سری اور حق جمانے کی عادت سے مجھے کوفت سی ہوتی ہے۔“

”طلال بھی ریحان اختر کو بہت عزیز ہے۔ یہ خود سری اور ہٹ دھرمی ریحان نے ہی دی ہے۔ مرحومہ بہن کی اولاد جان کر بہت پیارا اور اختیار دیا ہے بلکہ ریحان نے ہی پالا ہے، تمہاری ساس سسر تو سال بھی زندہ نہیں کی اولاد جان کر بہت پیارا اور اختیار دیا ہے بلکہ ریحان نے ہی پالا ہے، تمہاری ساس سسر تو سال بھی زندہ نہیں کی۔“

”وہ سہم گئی۔“
”ورنہ کیا.....؟“
”ورنہ کچھ نہیں، اچھے بھلے موڈ کا ستیاناس کر دیا۔“ اس نے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔
”میں نے تو کچھ نہیں کہا۔“

”یہی تو رونا ہے کہ تم کیوں نہیں کہتیں؟“ گاری کی اسپینڈ بڑھاتے ہوئے وہ بولا۔
 ”کیا کہوں.....؟“ وہ معصومیت سے بولی۔

”واہ! کیا ادا ہے، ایمان سے کافر ادا ہو لیکن اللہ میاں حسن کے ساتھ ذہن بھی دے دیتا تو کتنا اچھا ہوتا.....“ مست لہجے میں خمار ی تھی۔ وہ گھبرا کر نظریں چرا گئی۔
 ”میتھس پڑھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ذہین نہیں ہوں رمان بھا.....“ آخری لفظ پر اس کی زبان رک سی گئی۔

”آج اگر نیناں ریحان تم نے مجھے رمان بھائی کہنا تھا تو میں نے تمہیں گاڑی سے اٹھا کر پھینک دینا تھا۔“ اس نے دھمکی آمیز رویہ اختیار کیا۔ اسے کہنے پر ہی یقین آ گیا..... جان چھڑانے کے لیے بولی۔
 ”آپ کو معلوم ہے ہمیں کہاں جانا ہے؟“

”تمہارے ساتھ تو میں کہیں بھی جانے کو تیار ہوں۔“
 ”میری سہیلی مدیحہ کے گھر، محلہ گوالان نزد بستی مہر داد۔“
 ”نہیں، ہیں، یہ کہاں ہے بھئی، مجھے اس کا رستہ معلوم نہیں۔“
 ”جی ٹی بس اڈے سے سیدھے ہاتھ والی سڑک پر چلیں۔“
 ”یہ کون ہے، کہاں رہتی ہے؟“

”پرانہ علاقہ ہے، بس مجھے یہی پتا ہے۔“
 ”اچھا سرکار اب آئیں ہیں تو اصل جگہ پہنچا کر ہی جائیں گے۔“ اس نے اس کی خاطر کچھ سوچ کر اپنے ہاتھ والی سڑک پر گاڑی ڈالی اور پھر اس کے کہنے کے مطابق جی ٹی بس اڈے پر پہنچ کر دائیں ہاتھ والی سڑک کا انتخاب کیا۔

مغرب کی اذان ہو رہی تھی، جھٹ پٹے کا سا وقت تھا..... اب گھر تلاش کرنا مشکل کام تھا، تنگ ٹیڑھی سی گلیوں میں مشکل سے گاڑی چلتی ہے، کچھ دور تو جاسکے، آگے گاڑی نہیں جاسکتی تھی لہذا رمان نے بے بسی سے اسے دیکھا اور کہا۔

”یار! ایسی سہیلی سے ملنے کو اتنی بے قراری کیا تھی؟“
 ”اس نے بہت پیار سے بلایا تھا۔“
 ”پیار سے کوئی بلائے تو تم چلی آتی ہو کیا؟“
 ”کیا مطلب.....؟“

”مطلب چھوڑو، اب کیا کریں واپس چلنا پڑے گا۔“ اس نے مجبوراً کہا تو وہ افسردہ سی ہو گئی۔
 ”چلیں!“ دیکھی ہو کر واپسی کا کہا۔

رمان کو کافی پیچھے گاڑی ریورس کرنی پڑی..... خاصی مشکل برداشت کر کے گلی سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

”کبھی نین بنے، کبھی نین بچ بنے کجرا
لا، لا، لا، کبھی نین بچ بنے کجرا“

زلفی منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے، گنگنا رہا تھا..... اپنی دنیا میں گمن، صحن میں موجود ماں، آپا اور مدیحہ کا اسے خیال تک نہیں تھا..... اپنی ترنگ اور امنگ میں تار سے تو لیا کھینچ کر ہاتھ منہ صاف کر کے جیب سے چھوٹی سی کنگھی نکال کر بال سنوارنے شروع کیے۔
”زلفی بھائی.....!“ مدیحہ چلائی۔

”ہونہہ، ہاں۔“ وہ چونکا۔

”کیا مل گیا ہے جو ایسے گن ہو رہے ہیں؟“ مدیحہ کا موڈ نیناں کے نہ آنے کی وجہ سے سخت آف تھا۔ اوپر سے بھائی کی عدم توجہی وہ جھنجھلا اٹھی۔

”اچھا سوال ہے مائی ڈیزس سسٹر.....“ وہ کہتا ہوا چار پائی پر آ بیٹھا..... دو چار پائیوں کے درمیان پرانی سی میز پر آج کھانے کا خصوصی اہتمام تھا۔

”سوال جواب چھوڑو، کھانا کھاؤ، بجلی کے جانے کا وقت ہو رہا ہے۔“ اکبری بیگم نے کہا۔

”واہ! آج تو بہت کچھ پکا ڈالا۔“

”اللہ کا شکر ہے۔“ آپا نے کہا۔

”اوہ، یاد آیا آج تو آپا کی سالگرہ ہے اسی لیے۔“ اس نے پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے کہا۔

”مدیحہ کی ضد ہے بس اور وہ آئی بھی نہیں.....“ اکبری بیگم کے چہرے پر خرج کے اثرات ظاہر تھے۔

”وہ سہیلی نہیں آئی، بیچاری مدیحہ.....“ زلفی نے چھیڑا۔

”اس کا یہاں آنا ویسے بھی مشکل ہوتا، بڑی بڑی گاڑیوں کا ہماری ٹیڑھی ترچھی گلیوں میں کیا کام.....؟“

آپا نے وضاحت کی۔

”پھر ان گاڑی والوں سے میل جول نہیں رکھنا چاہیے۔“ زلفی نے گرہ لگائی۔

”کیوں، کیوں نہ رکھیں، نیناں ایسی لڑکی نہیں ہے۔“ مدیحہ کا دل بہت دکھی سا ہو رہا تھا۔

”جانتا ہوں میں، وہ راجا ریحان اختر کی اکلوتی بیٹی ہے، نیناں گروپ آف انڈسٹری کی مالک ہے۔“

زلفی نے تیزی سے کہا۔

”کس نے بتایا.....؟“ آپا نے یکدم سوال کیا۔

”سارا شہر جانتا ہے، مدیحہ سے پوچھ لیں۔“ پانی پی کر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”مدیحہ نے پہلے تو کبھی نہیں بتایا۔“ آپا کی بڑبڑاہٹ کسی نے نہیں سنی۔

”آپا! نیناں میں امیر لڑکیوں والی کوئی بات نہیں ہے، بہت سمیل، بہت معصوم ہے۔“ مدیحہ نے نیناں کی مدح سرائی کی مگر آپا بنا کسی جواب کے وہاں سے اٹھ گئیں..... اکبری بیگم نے برتن سمیٹنے کا مدیحہ کو کہا اور کچھ

توقف کے بعد کہا۔

”نیناں سے بہت ملنا جلنا مناسب نہیں۔“ وہ تو یہ کہہ کر چلی گئیں اور مدیحہ جھنجھلا کر آپا سے پوچھنے آ گئی۔

”کیا کیڑے ہیں نیناں میں، سب ہی اس کے مخالف ہو گئے ہیں۔“ آپا نے کرسی پر بند آنکھوں سے پیٹھے ہوئے اس کی جھنجھلاہٹ کا دھیرے سے جواب دیا۔

”نہیں، وہ تو بہت اچھی اور بہت پیاری ہے۔“

”پھر، پھر کیوں نہ ملوں.....؟“ وہ بولی۔

”اس کی گاڑی ہماری گلی میں نہیں آتی..... پھر فاصلہ ہی رکھنا چاہیے۔“

”کمال ہے آپا! بات تو وہی ہو گئی، اتنی پیاری سیٹلی چھوڑ دوں۔“

”اچھا، اب چپ کر کے سو جاؤ۔“ عجب اسرار سا تھا اُن کے انداز میں، تنہائی اور انفرادی کے ساتھ

آنکھیں موند لیں، بہت نئی نئی سی لگ رہی تھیں۔

”آپا!“ بہت سنجیدگی سے ان کے گلے میں بازو ڈال کر پکارا تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

”ہوں.....!“

”آپ کو کیا ہوا ہے.....؟“

”گھن زدہ عمارت کو کچھ نہیں ہوتا۔“

”آپ کی سالگرہ کا دن ہے، پتا نہیں کیسا ماحول بن گیا۔“

”یہ ماحول تو بہت پرانا ہے، تمہارے اور زلفی کے وجود نے رنگ بھر رکھا ہے۔“ انہوں نے بہت پیار

سے اس کے بال سنوارے۔

”مجھے آپ کی باتیں عجیب سی لگ رہی ہیں۔“

”کوئی نئی بات نہیں ہے، تم اب سو جاؤ، صبح کالج کے لیے اٹھنا ہے۔“

”ہوں، کالج، کل تو ڈیٹ شیڈ مل جائے گی..... نیناں کی تیاری اچھی ہے اور میری بس گزارہ ہے۔“ وہ

موضوع سے ہٹ کر بتانے لگی۔

”یہ کیا بات ہوئی؟ نیناں کی اچھی اور تمہاری صرف گزارہ.....“

”وہ بہت پڑھا کو ہے، آج کل پتھرس اپنے کزن سے کر رہی ہے۔“

”چھوڑو، تم اپنی پڑھائی پر توجہ دو.....“ انہوں نے نیناں کے ذکر کو نظر انداز کر دیا۔

”ویسے کل اس سے میں نے لڑائی کرنی ہے، میرے غریب بھائی کی کمائی خرچ ہو گئی اور وہ نہیں آئی۔“

”اتنا کھانا اور ایسا کھانا تو راجا صاحب کے بنگلے کے باہر کھڑے بھکاریوں کو ملتا ہے۔“ وہ تلخی سے ہنس کر

بولیں۔

”کون راجا صاحب.....؟“

”نیناں کے دادا.....“

”مگر آپ.....؟“

”سو جاؤ، میں نماز تسبیح پڑھ کر آتی ہوں۔“ وہ یکسر اس کا جملہ نظر انداز کر کے کھڑی ہو گئیں..... یہ وقت

ان کی نمازِ عشا اور اس کے بعد کثیر وقت تسبیحات کے ورد کا ہوتا تھا۔ لہذا مدیحہ خاموش ہو گئی اور اپنی چار پائی پر

آ کر لیٹ گئی۔

☆☆☆

وہ گھر کے کاغذات بغور دیکھ رہے تھے کہ بڑے ابا وہیں آ گئے۔

”یہ وقت تو آپ کے آرام کا ہے.....“ سبحان نے گویا یاد دہانی کرائی۔

”کون سی مٹی سے بنے ہو یا.....؟“ انہوں نے بہت زیادہ سنجیدگی سے پوچھا تو وہ اجنبی بن گئے۔

”کیا مطلب.....؟“

”گھر بار بیچ کر غیروں کے وطن میں بسنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہو؟“ انہوں نے صاف صاف کہا تو وہ

سمجھے۔

”انسان جہاں رہتا ہے وہی اس کا وطن ہوتا ہے، ہم وہاں گھر میں بلکہ شاندار گھر میں رہیں گے۔“ ان کا

دل رکھتے کو وہ فائل بند کر کے بہت میٹھی زبان میں بولے..... مگر انہوں نے ان کے خیال کو رد کر دیا۔

”گھر اور مکان کا فرق معلوم ہے، وطن اور ملک میں بھی وہی فرق ہے، ہم اپنا گھر اپنا پاکستان چھوڑ کر

کیوں جائیں.....؟“

”بڑے ابا! مجبوری ہے، میری ملازمت ہے، یہاں آپ..... اکیلے ہوتے ہیں مجھے آپ کی فکر لاحق رہتی

ہے۔“

”اب! میری فکر..... اگر فکر ہوتی تو ہم دونوں یوں تنہا نہ ہوتے، اتنی خود غرضی کا تو ہمیں گمان بھی نہیں تھا۔“

وہ حد درجہ غصے سے بولے..... تو وہ ناوم ہو گئے۔

”آپ کی تنہائی کا ہی تو خیال ہے، یہاں آپ اکیلے ہیں۔“ انہوں نے خاصی مہارت سے بہلانے کی

کوشش کی۔

”ارے گولی مارو ہماری تنہائی کو، ہم تو گزار چکے اپنی فکر کرو۔“ وہ جھنجھلا گئے۔

”بڑے ابا! ہماری بھی گزر گئی، یہ دیکھیں تو سفیدی اتر آئی ہے۔“ نہایت شگفتگی سے اپنا سر اُن کی طرف

جھکاتے ہوئے کہا۔

”بکومت! چاہے جتنی تبدیلیاں لاؤ اپنے آپ میں، اس کی یاد میں اداس رہنے کی عادت اب بھی باقی

ہے۔“ انہوں نے کاری ضرب لگائی تو وہ پہلو بدل کے رہ گئے۔ بڑی دیر خاموشی رہی پھر بڑے ابا ہی بولے۔

”یہ مان لو کہ یہ تنہائیاں اس عشق سے ہی پائی ہیں، ایک سے ہی محبت اتنی کر لی ہے تم نے کہ اب اور کسی

سے محبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”عشق بھی ایک حادثہ ہوتا ہے، پیش آ گیا سو آ گیا مگر آپ جانتے ہیں کہ رابعہ میرے لیے معتبر حوالہ ہے،

وہ اچھی دوست تھی اور ہے۔“ وہ بہت مضطرب سے ہو گئے..... شاید اس بات پر کہ وہ اچھی دوست کہہ کر خود کو

بڑے ابا کو تسلی دیتے تھے۔ سچ تو اس کے برعکس تھا..... وہ محبوب اور دوست بن کر پہلے بھی سینے میں دھڑکتی تھی

اور آج بھی لاکھ کوشش کے باوجود پتلیوں میں جڑی تھی..... آنکھیں کھول کر بھی دیکھ لیتے اور آنکھیں موند کر بھی

اسے ہی سکتے رہتے۔

”اسلام میں واضح احکامات ہیں کہ نکاح کیوں ضروری ہے؟“ بڑے ابا کے اندر سے ایک پکا سچا واعظ ایسے موقع پر نکل آتا تھا۔

”اور نکاح سعدیہ سے کرنا ضروری ہے۔“ انہوں نے شرارت کا سہارا لیا۔

”یار! اس میں کیا برائی ہے، وہ بیچاری آج بھی تمہاری ہاں سننے کی منتظر ہے۔“ انہوں نے بہت لاڈ سے

کہا تو وہ کھٹکھٹا کر ہنس دیے۔

”اب اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے.....؟“

”بڑے ابا! اسے کہیے کہ میری نہ میں ہاں تلاش نہ کرے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے فائلیں واپس دراز میں بند

کیں اور رسٹ وارج پر نگاہ ڈالی۔

”کان کھول کر سن لو، ہم تمہارے ساتھ فرنگیوں میں نہیں جائیں گے۔“ بڑے ابا نے آخری جلائی حربہ

استعمال کیا اور اپنے کمرے کا رخ کیا..... سبحان دل گرفتہ سے ہو کر کمرے میں ٹھہلنے لگے۔ انہیں بڑے ابا کی اداسی

قبول نہیں تھی مگر ان کی اداسی دور کرنے کا حوصلہ بھی نہیں تھا۔ اپنی زندگی کو رابعہ کا عنوان دے کر ہمیشہ کے لیے

پابند کر دیا تھا اب کسی اور عنوان کی سختی نہیں لگائی جاسکتی تھی۔ ویسے بھی اس کو وہ بددیانتی گردانتے تھے، رابعہ تو

ان کے دل سے نکلنے والی دعا تھی جس کی خوشی اور سلامتی کے لیے وہ ہر پل ہر لمحہ اچھا ہی سوچتے تھے مگر وہ پھر

بھی خوش نہیں تھی، اسے سکون و اطمینان بھری زندگی حاصل نہیں تھی وہ اس کا درد دور کرنا چاہتے تھے مگر کر نہیں

پارہے تھے۔

”بڑے ابا! اب بچا ہی کیا ہے جسے کسی اور کے نام لکھوں، سب کچھ جس کے نام لکھ چکا ہوں اللہ اسے

خوشیاں ہی خوشیاں عطا فرمائے، (آمین۔)“ خلوص دل سے انہوں نے بڑے ابا سے معذرت بھی کر لی اور

وضاحت بھی کر دی۔

☆☆☆

ریحان اختر واش روم میں تھے۔ وہ غیر ارادی طور پر اٹھیں اور بیڈ پر رکھے ان کے بریف کیس کو کھولنے

کی کوشش کرنے لگیں کچھ دیر کی کوشش کے بعد کوڈ نمبر لگ گیا..... بریف کیس کھل گیا..... انہوں نے جلدی

جلدی چیزیں الٹ پلٹ کر رکھ دیں..... کاغذات، چیک بکس، کریڈٹ کارڈز سب کچھ بیڈ پر نکال کر سب

پاکٹس چھان ڈالیں تو ایک خفیہ جیب نظر آئی اس کی زپ کھولی تو اسی وقت ریحان اختر واش روم سے باہر نکلے

اور باز کے مانند اُن پر جھپٹے۔

”تمہاری دماغی حالت تمہیں چین نہیں لینے دیتی۔“ ان کے بازو کو پکڑ کر انہوں نے زور سے بیڈ پر چٹا تو

وہ چیخیں۔

”ہاں! ہاں.....“

”کیا چاہیے تمہیں، یہ لو چیک بک، یہ لو کریڈٹ کارڈز.....“ انہوں نے چیک بک، کریڈٹ کارڈز، اسے

ٹی ایم سب ان پر اچھال دیے۔

”یہ سب نہیں چاہیے ریحان اختر، وہ ثبوت دو جس سے تمہاری بے وفائی ثابت ہو۔“ رابعہ نے واپس

سب کچھ فرش پر دے مارا۔

”کس سے بے وفائی.....؟“ وہ ان کے بہت قریب بیٹھ کر بھولپن سے بولے۔
”مجھ سے، مجھ سے ریحان اختر۔“

”تم سے اور بے وفائی، ہا..... ہا..... ہا.....! وہ دیوانہ وار ہستے ہوئے بولے۔
”ہاں مجھ سے، جس سے محبت ہے تمہیں۔“

”یہ کس نے کہا؟ سچ تو یہ ہے کہ تم سے نہ محبت ہوئی اور نہ بے وفائی.....“ وہ ایسی سچائی اس قدر آسانی سے بیان کر گئے کہ ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ ذومعنی انداز میں مسکرائے اور بولے۔
”تم نیناں کی ماں اور میری شری بیوی ہو، محبوب نہیں۔“

”اور وہ سب، وہ سب دعوے۔“ صد سے وہ رو دیں۔

”وہ سب، اس پروفیسر سے دور کرنے کے طریقے تھے۔“ وہ پاٹ سے لہجے میں بولے۔

”اوہ! تو تم جھوٹے بھی ہو، جھوٹ بولتے رہے، میری محبت کا مذاق اڑاتے رہے، کیا ضرورت تھی میری؟ کسی سے بھی شادی کر لیتے۔“ غم و غصے میں وہ کہتی چلی گئیں۔

”جھوٹی تو تم بھی ہو، پروفیسر سے محبت کرتی ہو۔“

”کاش! ایسا ہی ہوتا، مجھے تمہارا فریب نظر آ جاتا۔“

”چلو اب تو ہر فریب نظر آ گیا، یہ بھی پتا چل گیا کہ میں نے تم سے محبت نہیں کی۔“ وہ اتنا کہہ کر اپنی بے ترتیب چیزیں سمیٹنے لگے جیسے ساری اہمیت انہی کی تھی، ان کی ذات کو تھیک کے نشتر چھو کر زخم زخم کر کے بالکل اتجان اور مطمئن جو بھرم قائم تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔

”پھر میں یہاں کیوں ہوں؟ مجھے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔“ اٹکبار لہجے میں اپنی کم مائیگی کا بھرم رکھنے کی خاطر کہا۔

”صرف میری بیٹی کی وجہ سے، میری زندگی میں دوسرے درجے کے شہری والی حیثیت ہے تمہاری، جس حقیقت کو جاننے کے لیے تم بے قرار تھیں، وہی میری پہلی اور آخری محبت ہے۔“ انہوں نے بریف کیس بند کر کے ٹیبل پر رکھا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارنے لگے۔

”اب مجھے کسی حقیقت کو جاننے کی آرزو نہیں رہی۔ کیونکہ محبت کا کھیل ختم ہو گیا۔“ رابعہ نے بھیگی پلکیں جھیلی کی مدد سے رگڑ کر صاف کیں اور برسکون سی ہو گئیں۔

”اب کچھ تلاش کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔“ وہ مڑ کر بہت بارعب سی آواز میں آڈردے کر جانے لگے تو انہوں نے کہا۔

”سنو! مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا۔“ غصیلے فیصلہ کن لہجے میں کہا گیا یہ جملہ ریحان اختر کے حواس چھین لے گیا۔

”شٹ اپ! رہنا تو تمہیں نہیں نہیں ہے، بہتر ہے خاموشی سے رہو اور ہاں اب میری واپسی تک میرا کمر اچھوڑ دینا۔“

”میں کیا ہوں، کوئی، سیکار سامان جب چاہو کمرے میں رکھو اور جب چاہو نکال دو۔“ وہ دہاڑیں۔
”ہاں شاید، نیناں کے صدقے صرف کمر ابد لئے کو کہا ہے۔“ وہ باہر نکل گئے تو وہ جذباتی سی ہو کر بوا کو آوازیں دینے لگیں۔ کمرے کی ہر چیز فرش پر پٹخ کر بھی قرار نہیں آیا تو اپنا سر بیڈ کی پٹی سے ٹکرا کر لہو لہان کر لیا۔ نیناں کے لیے اور بوا کے لیے یہ منظر ناقابل یقین اور ناقابل برداشت تھا۔
”مما.....! یہ بابا نے کیا ہے.....؟“ وہ ان کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر رو دی۔

”یہ ریحان نے کیا ہے؟“ بوا نے سخت غصیلے انداز میں پوچھا۔

”ریحان نے جو کیا ہے اس پر آپ کو نہ پہلے یقین آیا اور نہ اب آئے گا۔“ انہوں نے بوا سے شکایت کی۔

”رابعہ! ریحان تم سے.....“ بوا نے کچھ کہنا چاہا تو وہ چلا گئیں۔

”کچھ نہیں ہے ریحان کو، بتا دیا ہے اس نے کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔“

”مما..... ممما! پلیز انھیں بیڈ پر کیشیں، خون بہہ رہا ہے، بوا ڈاکٹر کو بلا لیں۔“ نیناں کے حواس جیسے خطا ہو گئے..... بوا بھی خاصی پریشانی میں ڈاکٹر کو فون کرنے کے لیے باہر گئیں۔

”نیناں! بیٹا! مجھے یہاں سے جانا ہے۔“ رابعہ نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

”مما! مجھے بھی آپ کے ساتھ جانا ہے، مجھے بابا سے نفرت ہو رہی ہے۔“ نیناں نے روتے ہوئے ماں سے کہا۔

”ریحان آپ کو کبھی نہیں جانے دیں گے۔“

”بابا پہلے ایسے نہیں تھے۔“

”مجرم جرم ثابت ہونے کے بعد ایسا ہو گیا ہے۔“ نفرت و حقارت دونوں اٹھ آئے۔

”بابا نے کیا، کیا ہے، ممما پلیز بتائیں تو.....؟“ آج پہلا موقع تھا کہ اس نے ماں سے واضح طور پر استفسار کیا۔

”پہلے تو شاید بتا دیتی مگر اب تو مجھے ہی کچھ پوچھنے جانے کی ضرورت نہیں رہی۔“ وہ بہت نرمی سے بولیں۔

”مطلب.....؟“

”مطلب کچھ نہیں، کاشن اور پاپوڈین نکال کر دو.....“ وہ ٹال گئیں..... نیناں جلدی سے بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی ڈراز سے دونوں چیزیں نکالنے لگی۔

☆☆☆

غسل خانے میں پیر پھسل جانے کی بات بنا کر بوا نے گھر کی عزت ڈاکٹر سے بچالی..... رابعہ نے پٹی ہونے کے بعد آنکھیں موند لیں، نیناں ان کی پٹی سے لگی رہی۔ بوا مغموں سی کرسی پر بیٹھیں انہیں دیکھ رہی تھیں..... وہ بالکل ان کی بی بی جیسی لگ رہی تھی، فرق صرف اتنا تھا کہ ظاہری جسمانی گھاؤ نہیں لگتے تھے مگر اندرونی حالت شاید رابعہ سے بھی ابتر تھی..... راجا صاحب کی شکر قد جیسی زبان ان کے زخم ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی مگر وہ کڑھتی رہتی تھیں، وسیعہ کی حد درجہ بڑھی آزادی اور ریحان اختر کی لالہالی، خود سر طبیعت دیکھ دیکھ

کردہ ہوا سے ہی اپنا دکھ، اپنی فکر بانٹا کرتیں۔

”سکھاں.....! راجا صاحب نے جس ذریعے سے پیسہ کمایا وہ پیسہ وسیعہ اور ریحان کو تباہ کر رہا ہے مگر میں کیسے وقت کے پر باندھوں.....؟“ مہ جیس نے بے بسی سے کہا۔

”کڑھنے کا فائدہ بی بی، اس پیسے سے تو اب بہت آگے جا چکے ہیں راجا صاحب۔“ سکھاں نے جواب دیا تو وہ بھیگی پلکیں جھپکائے بنا چھت گھورتے ہوئے بولیں۔

”مگر وہ پیسہ جس میں میرا گناہ بھی شامل ہے، وہ وسیعہ کو اور ریحان کو ساتھ لیے جا رہا ہے۔“

”ریحان تو لڑکا ہے لیکن مجھے وسیعہ کے تیور ٹھیک نہیں لگتے بی بی۔“ سکھاں کو وسیعہ کی سرکش منہ زور جوانی سے خوف آتا تھا مگر راجا صاحب کو اس پر اندھا اعتماد تھا، انہوں نے نئے ماڈل کی گاڑی اسے لے کر دی، اب وہ تھی اور شہر کی سڑکیں، نہ اسے بستر سے لگی ماں کا کبھی خیال آتا تھا اور نہ بزنس میں پھنسے باپ کا، ریحان تو ویسے بھی اپنے ہم عمر یار دوستوں میں مگن رہتا تھا۔

”وسیعہ! کہاں ہے.....؟“

”بتا کر نہیں گئی.....“ سکھاں نے مہ جیس کے بالوں میں برش کرتے ہوئے دھیرے سے بتایا۔

”سکھاں، آج خان جی زندہ ہوتے تو دیکھتے ڈاکٹر مہ جیس کس حال میں ہے.....؟“

”کچھ نہیں ہوا، آپ اب بھی ویسی ہو۔“ سکھاں دل گرفتہ سی صرف دل ہی رکھ سکتی تھی۔

”سکھاں! خان جی نے اچھا فیصلہ نہیں کیا، وہ تمہارے بھی مجرم ہیں، میرے ساتھ تمہیں بھی عمر قید کی سزا

سنائی۔“

”نہیں، وہ بھلا کیوں برا سوچتے۔“ اپنے اندر کا دھواں پھپھروں میں ہی قید کرنے کا ہنر سکھاں کو بھی خوب آتا تھا، مہ جیس نے اس دھوئیں کی گھٹن محسوس کر کے تھکن زدہ مسکان کے ساتھ جواب دیا۔

”سکھاں! تم تو جی سکتی ہو، جاؤ جتنی بہاریں بچی ہیں وہ تو سمیٹ لو، یہاں میرے بعد تمہارے لیے کیا بچے گا؟“

”اللہ آپ کو سلامت رکھے، اب اس عمر میں اپنے مالکوں سے دغا کروں، جب تک زندہ ہوں اس گھر میں رہوں گی۔“

”ہونہہ! اگر زندہ رہیں گے تو۔“ ایک درد کی لہر ان کے وجود پر چھا گئی۔

”اٹھا! بی بی، یہ گھر سمیٹنے کی کوشش پھر سے ناکامی میں بدل گئی ہے۔ ریحان اختر کی زندگی اور خوشیوں کی آپ کو بڑی تمنا تھی مگر خوشیاں تو جن جن کر خود ریحان نے گھر سے باہر دھکیلی شروع کر دی ہیں..... میں شرمندہ ہوں کہ میں کیا کروں؟“

”ہوا! نیناں نے خیالات میں کھوئی ہوا کو پکارا تو وہ چونکیں۔

”ہوں، ہاں!“

”مما کا رنگ کتنا زرد ہو رہا ہے۔“

”ہوں، ٹھیک ہو جائے گا..... آپ اپنے کمرے میں چل کر آرام کرو۔“ وہ کچھ اور تو کہہ نہیں سکتی تھیں یہ

کہہ کر اس کا دھیان بانٹا۔

”میں رمان بھائی کو فون کروں.....“ اسے ایک دم رمان کا خیال آ گیا۔

”ارے نہیں، بلا وجہ بات بڑھ جائے گی، اسے بالکل کچھ نہیں بتانا۔“ ہوانے تاکید کی تو وہ اثبات میں سر ہلا کے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی..... ہوانے رابعہ کے اور قریب کرسی کر لی وہ سو رہی تھیں مگر ایک دم ہلکی سی کراہ منہ سے نکلتی جس پر ہوا بے قرار ہو جاتیں۔ نیناں نے ٹھیک کہا تھا ان کا چہرہ بالکل زرد ہو چکا تھا..... انہیں رابعہ کا کلرنگ چہرہ اچھی طرح یاد تھا..... ان کا گھونگٹ اٹھا کر انہوں نے ماشاء اللہ کہا تھا۔

☆☆☆

جب نبھانے کا ارادہ کر لیا جائے تو غم ہستی آدھا رہ جاتا ہے، اندھیری شب کا خطرہ ہو تو کسی جگنو کی ہانپوں کو سہارا کر لیا جائے۔ یہ دنیا عجب ہے یہاں کانٹے بھی اگتے ہیں اور کلیاں بھی کھلتی ہیں، انہی کے درمیان رہ کر گزارہ کرنا ہوتا ہے، بھروسے کے لائق تو یہاں کوئی انسان نہیں ہے اگر جینا شرط ہے تو لوگوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔

پڑھی لکھی رابعہ کے ذہن نے کئی روز کی کوشش کے بعد یہ بات جان لی تھی، چہرے پر غارے کی دبیز تہ اور ہونٹوں پر چمکیلی ڈارک لب اسٹیک کے پیچھے ہر تنازعہ، ہر کسک چھپا کر پلٹیں تو ریحان اختر کو پشت پر موجود دروازے سے اندر آتا دیکھ کر کسی قسم کا کوئی پرانا تاثر نہیں دیا..... اپنا چھوٹا سا پرس اٹھایا تو وہ قریب آ گئے۔

”خاموش جھیل میں جو حسن اور کشش ہوتی ہے وہ آج نظر آرہی ہے۔“ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”کہاں کی تیاری ہے.....؟“ انہوں نے جاننا چاہا۔

”مارکیٹ.....“ وہ بہت سادگی سے بولیں اور آگے بڑھیں۔

”مارکیٹ کیوں، نیناں کے بزنس ٹرانسفریٹر کے حوالے سے ہوٹل میں ڈنر ہے وہاں چلو.....“ وہ خاصی اپنائیت سے بولے..... بالکل مختلف سے انداز میں۔

”ہوں! دل چاہا تو آ جاؤں گی.....“ وہ صلح پسندی کی نہیں سمجھوتے کی راہ پر چل کر نظریں ملاتے ہوئے بولیں۔

”گڈ چنج.....“ وہ امپریس ہوئے۔

”نیناں میرا بھی عشق ہے، نیناں کی ماں تو ہوں.....“ وہ آئی لائنر کی آخری سی پرفارمنس کا جائزہ لیتے ہوئے بولیں۔

”اوہ! تھینک یو!“ وہ بالکل تبدیل سے لہجے میں بولے۔

”ایک ماں کو شکریے کی ضرورت نہیں ہوتی.....“ وہ یہ کہہ کر باہر نکلیں تو ڈرائیور نے گاڑی نکالنے کے لیے اجازت مانگی مگر انہوں نے اس کے ہاتھ سے چابی لے کر خود گاڑی نکالی..... جب گاڑی گیٹ سے باہر نکل رہی تھی تو ریحان اختر کمرے کی کھڑکی سے دیکھ رہے تھے..... انہیں نچلا ہونٹ چباتے ہوئے کچھ الجھن سی ہوئی مگر پھر پردہ برابر کر کے ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرنے لگے کہ طلال کمرے میں آ گیا..... اس کی آنکھوں میں بھی حیرت بھرا سوال تھا وہ بھی رابعہ ماما کی بدلی روش پر حیران ہو کر کمرے میں ماموں سے یہ پوچھنے آیا تھا کہ

یہ کیسی تبدیلی ہے؟

”طلال! سب مہمانوں سے کنفرم کرا لیا تھا کہ آرہے ہیں۔“

”ہاں جی! رشید نے سب کو ریما سنڈ کرا دیا ہے، تقریباً ڈیڑھ سو کی لسٹ فائنل ہے۔“ تلال نے اپنے پی اے رشید کی طرف سے بتایا۔

”نیناں کو بتا دیا تھا۔“ انہوں نے پوچھا۔

”جی فون کر دیا تھا مگر اس کا صبح پرچہ ہے وہ نہیں جا رہی۔“ تلال نے ناپسندیدہ سے انداز میں کہا۔

”اوہ! یہ تو یاد ہی نہیں رہا، اب کیا کیا جائے؟“ وہ الجھن کا شکار ہو گئے۔

”کچھ دیر کی تو بات ہے۔“

”نہیں، اس کا امتحان ضروری ہے، رمان نے پڑھانے آتا ہے۔“ انہوں نے تلال کا مشورہ رد کر دیا۔

”تو رمان صاحب کو منع کر دیتے ہیں۔“

”یار! رمان کو تو میں نے ڈنر پر بھی انوائٹ کیا ہے، میں دیکھتا ہوں۔“ انہوں نے تلال سے کہا۔

”آپ دیکھ لیں، نیناں کے بغیر کوئی فائدہ نہیں۔“ وہ اپنی دانست میں کہہ کر نکل گیا۔ اسے رمان کو انوائٹ کرنے والی بات اچھی نہیں لگی۔

ریحان اختر، نیناں کے کمرے کی طرف آ گئے۔ وہ سچ مچ کتابوں میں سر دے بیٹھی تھی۔ کچھ کہنے سے پہلے ہی رمان کے آنے کی اطلاع آ گئی تو وہ واپس مڑنے ہی والے تھے کہ فیضو نے کسی دلشاد کے آنے کی اطلاع دے دی۔ ان میں جیسے برقی رودور گئی۔

”کیوں؟ کیوں آیا ہے؟“

”یہ نہیں بتایا، بس آپ سے ملنا ہے۔“ فیضو نے ڈر کر جواب دیا اور ذرا سے فاصلے پر ہو گیا۔

”اس کو کہہ دو کہ میں خود آ کر بات کروں گا۔“ انہوں نے کہا اور رمان کے آنے کی وجہ سے مسکرا دیے۔ رمان نے مصافحہ کیا اور موڈ خوش گوار بنا کر بولے۔

”آؤ یار! آج ذہن سے بالکل نکل گیا اور ڈنر بہت امپورٹنٹ ہے، کیا کریں؟“

”ایسا کیا مسئلہ ہے؟“ وہ کچھ سمجھا نہیں۔

”نیناں کا کل پیپر ہے اور۔“

”اوہ! سمجھا۔“ مگر اس میں مسئلہ کچھ نہیں، ہم ٹھیک دو گھنٹے بعد پہنچ جائیں گے۔“ رمان نے نیناں کی انکار سے بھری نگاہیں بھی نظر انداز کر کے حتمی پروگرام دے دیا۔

”سچ۔“

”سو فیصد، نیناں کو صرف ڈھرانما ہے، تیاری پرفیکٹ ہے۔“ آپ اور رابی خالہ بے فکر ہو جائیں۔“ بے دھیانی میں رمان نے دونوں کا ذکر کر دیا۔ ریحان اختر خاموش ہو کر چلے گئے۔ وہ اسے بتانہ سکے کہ رابی تو نہیں جا رہی۔

”آپ نے کیوں کہا؟“ نیناں نے شکوہ کیا۔

”اس لیے کہ ہم جائیں گے، آپ کے تلال بھائی کو جلانے۔“ اس نے نوٹ بک کھولی اور ٹیکسٹ بک سے کچھ نوٹ کرنے لگا۔۔۔۔۔ نیناں کو تپسی آ گئی۔۔۔۔۔ رمان کو بہت اچھا لگا چند لمحے دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

”ہنستی رہا کرو، دل دھڑکنے لگا ہے۔“ وہ جزبزی ہوئی۔

”آپ نے بات ہی ایسی کی ہے۔“

”طلال کو چڑانے میں مزہ آتا ہے نا۔۔۔۔۔! اس نے کہا تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”طلال بھائی آپ کو کیوں برے لگتے ہیں؟“

”بتا دوں۔۔۔۔۔؟“ لکھتے لکھتے نظریں چار کرتے ہوئے پوچھا۔۔۔۔۔ تو وہ خود بخود کچھ سمجھ کر گلابی سی پڑ گئی۔۔۔۔۔ کچھ اور کہنے کا حوصلہ ہی نہ ہوا۔

☆☆☆

رابعہ نے تبدیلی کا آغاز اپنے پسندیدہ مشغلے سے کیا تھا۔۔۔۔۔ ڈھیر ساری خریداری کرنا ان کا مشغلہ تھا، تھکن، ماندگی دور کرنے کے لیے وہ ہمیشہ شاپنگ کا سہارا لیتی تھیں۔۔۔۔۔ آج واپسی کا سفر بھی من پسند مشغلے سے ہوا تھا۔۔۔۔۔ شاپنگ کے بعد بڑے بڑے شاپنگ بیگ اٹھائے باہر نکلیں تو پلازہ کے سامنے پاکستان میڈیکل اسٹور دیکھ کر یاد آیا کہ اپنی رات کے استعمال کی گولیاں بھی لے لی جائیں۔۔۔۔۔ سڑک کر اس کی، گاڑی لاک کر کے پرس سے گولی کی خالی پیکنگ نکال کر کاؤنٹر پر کھڑے سیلز مین کے سامنے رکھی تو اس نے پیکنگ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا۔

”میم! یہ شارٹ ہیں۔“

”اوہ! کہیں سے نہیں ملیں گی؟“ وہ متفکری ہو گئیں۔

”شاید والی بات ہے، ویسے آپ یہ استعمال نہ کیا کریں۔۔۔۔۔“ لہجہ آشنا اور انداز مخلصانہ تھا۔ رابعہ نے حیرت و انبساط کا تاثر دینا تھا مگر میڈیکل اسٹور کا مالک غور سے دیکھ رہا تھا، اس لیے وہ فقط اتنا ہی کہہ سکیں۔

”یہ میری ضرورت اور عادت ہیں۔“

”ضرورتیں اور عادتیں بدل بھی سکتی ہیں۔۔۔۔۔“ سیلز مین نے اور زیادہ دھیمہ لہجہ اختیار کیا۔

”نی الحال تو یہ میڈیسن مجھے چاہئیں پلیز۔“

”آپ گاڑی میں بیٹھیے، میں آگے سے پتا کر کے آتا ہوں۔“ اس نے کہا اور کاؤنٹر کے پیچھے سے باہر نکل کر دکان سے بائیں طرف چلا۔۔۔۔۔ وہ پرس سنبھالتے ہوئے گاڑی میں آ کر بیٹھ گئیں اور اسی سمت دیکھنے لگیں جس سمت سیلز مین گیا تھا۔۔۔۔۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ آیا اور ان کی کھڑکی کی طرف جھک کر بولا۔

”سوری میم! یہ یہاں نہیں ہے۔“

”اوہ گاڈ!“ وہ اس جواب پر پریشانی میں کہہ گئیں۔

”یہ آپ کے لیے بہت نقصان دہ ہے، پلیز آپ آج ان کے بنا سونے کی کوشش کیجیے۔“ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں خلوص بھری التجا کے ساتھ دیکھا۔۔۔۔۔ تو رابعہ کو اچھا لگا۔

”بہت مشکل کام ہے، عادت پرانی ہے، خیر کیا ہو سکتا ہے؟“ رابعہ نے بے بسی سے گولیوں کی پیکنگ

لیتے ہوئے کہا۔
 ”آج کوشش کیجیے اگر پر اہم ہو تو مجھے بتائیے گا، میں پاتال سے بھی میڈیسن ڈھونڈ لاؤں گا۔“ اس نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑے وثوق سے کہا۔
 ”تھینک یو! میں ڈرائیور کو مین مارکیٹ بھیج دیتی ہوں۔“
 ”کوئی فائدہ نہیں، یہ میڈیسن نہیں ملیں گی۔ ہمیں تازہ ترین رپورٹ معلوم ہے۔“ وہ بولا۔ انہوں نے گاڑی اشارت کی۔

”تو آپ کو کہاں سے ملیں گی.....؟“ گاڑی رپورس کرتے ہوئے سرسری سے انداز میں کہا۔
 ”نہیں ملیں گی کیونکہ آپ کو ضرورت نہیں رہے گی اور مجھے تلاش کرنے کے لیے آپ کہیں گی نہیں.....“ وہ مسکرایا۔

”واہ! اچھی بات کی ہے مگر اپنا مجھے پتا ہے۔“
 ”آپ اتنی حسین اور پربہار ہیں، یہ دوا آپ کے لیے نہیں ہے۔“ بڑی جرأت اور جسارت کا مظاہرہ کر کے وہ لوٹ کر اسٹور میں داخل ہو گیا اور عجیب سے تاثر کے ساتھ وہ گاڑی وہاں سے نکال لائیں۔
 عجیب سا اصرار تھا اس کے آخری جملے میں کہ وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کئی بار اپنا چہرہ بیک و فور میں دیکھتی رہیں اور وہ سچ کھوجتی رہیں اگر اس کے جملے کی بازگشت کانوں میں سنائی نہ دیتی..... وہ حد درجہ حسین اور دلکش آج بھی تھیں..... چہرے پر تازگی اور نکھار واپس لوٹ آیا تھا لیکن انہیں اس اجنبی سیلزمین پر حیرت تھی جو بھرپور نوجوان تھا، پڑھا لکھا دلکش لب و لہجہ، بولتی سوال جواب کرتی آنکھیں، دراز قامت اور پرتشویش انداز..... کیوں؟

گاڑی گیٹ سے اندر لاتے ہوئے وہ اس کے خیال سے آزاد ہوئیں اس کا کارڈ بڑھتے ہوئے گاڑی لاک کی۔ ذوالفقار نام پڑھ کر کارڈ پرس میں ڈالا اور اندر آ گئیں۔ ان کی منتظر صرف بوا تھیں۔ باقی سب ڈنر کے لیے جا چکے تھے..... وہ بڑے بڑے شاپنگ بیگ بیڈ پر ڈال کر چینیج کے لیے واش روم میں گھس گئیں..... فریش ہو کر باہر نکلیں تو بوا کی اطمینان بھری مسکراہٹ نے استقبال کیا۔
 ”آپ مسکرا رہی ہیں؟“

”بہت اچھی لگ رہی ہو، بس سدا یہ روپ روپ قائم رہے، آمین!“ بوانے جواب دیا۔
 ”بوا! میں نے جینا سیکھ لیا ہے، نہ محبت، نہ نفرت صرف سمجھوتا..... ریحان نے مجھے اس کرب سے آزاد کر دیا.....“ بالوں کو پونی میں جکڑتے ہوئے بولیں۔

”اچھا فیصلہ ہے، بس اچھا کھاؤ، اچھا پیو.....“ بوانے خوشی سے کہا..... وہ تو یہی چاہتی تھیں۔
 ”کھانا لگو آئیں، بہت بھوک لگی ہے۔“
 ”یہیں لے آتی ہوں سب تو باہر کھائیں گے۔“
 ”آپ اور میں کھائیں گے۔“
 ”ویسے رابعہ بیٹا، نیناں تمہارے بغیر جانا نہیں چاہ رہی تھی۔“

”پھر کیسے گئی.....؟“ انہوں نے فکر مندی سے پوچھا۔
 ”بس رمان کے قابو تو آ جاتی ہے لیکن میرا خیال ہے تم جانتیں.....“
 ”ابھی میں شاید ایسے فیصلے کرنے کے قابل نہیں ہوئی، کچھ وقت چاہیے۔“
 ”چلو، بس بھرپور طریقے سے جیو۔“
 ”ویسے مجھے رمان کو منع کر دینا چاہیے تھا۔“ وہ سوچ میں پڑ گئیں۔
 ”کیوں.....؟“

”طلال سے اس کی ہمتی نہیں، کوئی بد مزگی نہ ہو۔“
 ”رمان نبٹ لیتا ہے، تم فکر نہ کرو.....“ بوا خود آج بعد مدت کے ہشاش ہوئی تھیں۔

”اچھا اب کھانا لے آئیں، بہت بھوک لگی ہے۔“ بھوک کا احساس شدت سے انگڑائی لے کر جا گا تو انہوں نے نعرہ بلند کیا..... بوا باہر چلی گئیں تو رابعہ..... کچھ دیر کے لیے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے آج کے گزرے لمحات کو ذہن میں تازہ کرنے لگیں..... میک اور سے لے کر گاڑی ڈرائیو کرنے تک، خوب صورت مہین سی ریشم کی ساڑیوں سے لے کر جدید طرز کے شلوار سوٹ، پرفیومز کی بڑی سی ریج، ڈفرنٹ اسٹائل اور کلرز میں پرس اور کچر سب کی پسند اور خریداری میں کتنا انوکھا اور منفرد سا تازہ احساس تھا..... نیناں کے لیے خریدی گئیں جینز، شرٹس، کرتے، ہینڈ بیگز پونیاں کتنی مدت کے بعد پیار سے خریدی تھیں..... آزاد خالی دل اور دماغ کے ساتھ..... سب اچھا تھا۔
 آخر میں میڈیکل اسٹور، اس پر موجود سیلزمین نے دماغ پر دستک دی تو اس نوجوان کی اپنائیت اور اخلاق کو سوچ کر ہی لبوں پر مسکان کھیل گئی۔

”اتنے اچھے نوجوان ہماری قوم میں موجود ہیں یقین نہیں آتا، لوگ تو یہی کہتے رہتے ہیں کہ نوجوان نسل اخلاقی طور پر پست ہو گئی ہے، ہم تو ایسے تھے ویسے تھے، یہ ایسے ہیں۔“ بوا کی آمد سے پہلے انہوں نے خود سے جیسے گفتگو کی، بوانے ٹرے بیڈ پر ہی رکھی تو وہ بسم اللہ پڑھ کر تیزی سے کھانے میں لگن ہو گئیں..... بوا دیکھ رہی تھیں کہ وہ لوٹ آئی ہیں اس نفرت و بدگمانی کے جہاں سے جہاں تباہی اور وحشت تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں بوا.....؟“ نوالا منہ میں چباتے ہوئے پوچھا۔
 ”کچھ نہیں..... بس اچھا لگ رہا ہے۔“
 ”ارے بوا! اچھا تو مجھے بھی لگ رہا ہے، میں تو محبت کے چکر میں اتنے عرصے جلتی کڑھتی رہی، بلا وجہ کے ریحان پر حق جتاتی رہی، اب سر سے اترے بال کہیں بھی جائیں۔“
 ”ہو سکتا ہے ریحان ویسے نہ ہوں۔“

”چھوڑ دیں اب ریحان کو..... کیونکہ اب دل سے پھانس نکل چکی ہے۔“ کھانے کو آخری شکل پانی سے دی جاتی ہے سو انہوں نے بھی گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے کہا..... تو بوانے خاموشی سے ٹرے اٹھائی۔
 ”ارے آپ نے تو کھانا کھایا ہی نہیں.....“ انہیں یاد آیا۔
 ”تمہیں کھانا دیکھ کر میرا پیٹ بھر گیا۔“

”واقعی!“ وہ خوش ہو گئیں۔

☆☆☆

نیناں کے صبح کے پرچے کی وجہ سے ریحان اختر نے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ رمان کو ساتھ لیے ہوٹل کی لابی کی طرف بڑھی تھی کہ طلال اپنے دوست بلال کے ہمراہ سامنے آ گیا۔

”نیناں! میرے ساتھ آؤ.....“ طلال نے حق کا استعمال پورے جھاؤ سے کیا۔

”طلال بھائی، وہ مجھے کچھ سمجھنا ہے۔“ طلال کے دوست کا خیال کر کے اس نے دبی آواز میں کہا۔

”واؤ! طلال بھائی.....“ بلال نے تمسخرانہ ہنسی کے ساتھ نمک پاشی کی تو رمان کو مدخلت کرنی پڑی۔

”یار طلال! اگر تھس آپ کرا سکتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”آپ کو اعتراض ہونا بھی نہیں چاہیے، یہ میری کزن ہے اور.....“

”یہ فرسٹ کزن والا رعب تو نہیں چلے گا کیونکہ یہ حق تو میرے پاس بھی ہے۔“ رمان نے کافی شوخ

لگا ہوں سے نیناں کو دیکھتے ہوئے یاد دلایا۔

”اچھا..... اچھا چلو یہاں سے، دعوت میں بلانے کا مطلب یہ نہیں کہ گھر کے مالک بن جاؤ.....“ طلال

نے بدتمیزی سے مخاطب کیا تو نیناں کے اندر سے طوفان باہر آ گیا۔

”طلال بھائی! آپ کو کوئی حق حاصل نہیں ہے رمان کی توہین کا..... وہ بھی اپنے دوستوں کے

سامنے.....“

”واہ جی! یہ پڑھائی کراتے ہیں آپ، اپنا سبق ہی رٹو ادا کیا.....“ طلال نے طنز کیا۔

”دیکھو! آپ کو شاید تفصیلی بات کرنی ہے میرے آفس آجانا یا پھر کل میں آ جاؤں گا کافی الجال میری

مصروفیت ہے، چلو نیناں۔“ رمان نے اپنے مخصوص لب و لہجے کے ساتھ طلال کو دائیں آنکھ دبا کر پتنگے لگائے

اور نیناں کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گیا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی رمان نے تشکر آمیز نگاہوں سے نیناں کو دیکھا، وہ کافی ڈسٹرب تھی..... ہلکے ہلکے

کیکپار ہی تھی۔ ہونٹوں کو دانتوں میں دبائے بار بار پلکیں اٹھاتی گراتی، دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں

پیوست کیے خوف اور الجھن سے نجات کی کوشش کر رہی تھی۔ پارکنگ سے باہر گاڑی نکالتے ہی رمان نے اس

کی حالت کے حسب حال گنگنا شروع کر دیا۔

”ایک تھی لڑکی بھولی بھالی

کنول کٹورے نیناں تھے اس کے، دل تھا لیکن پیار سے خالی

ایک تھی لڑکی بھولی بھالی

روپ کی رانی نام تھا اس کا، ہر نی جیسی آنکھوں والی

ہوں، ایک تھی لڑکی.....“

سوری!“ اس کو گانے سے باز رکھنے کا یہی طریقہ تھا کہ ایک دم سوری کہہ دیا۔

”فارواٹ!“ پوچھا گیا۔

”طلال بھائی نے بدتمیزی کی.....“

”بدتمیز سے بدتمیزی کی ہی امید رکھنی چاہیے۔“

”ویسے بدتمیز ہیں نہیں کبھی ایسے ہو جاتے ہیں۔“

”انہیں بدتمیز کہنا برا لگا ہے تمہیں.....؟“ اس نے لطف لیا۔

”نہیں، نہیں تو.....“

”کوئی ویسے یہ خاندانی آدمی لگتا نہیں ہے۔“

”ایسے تو نہ کہیے، میری دسیمہ پھپھو کے بیٹے ہیں۔“ اسے اپنے خاندانی ہونے کا احساس ہوا۔

”اوہ سوری! آپ کو اچھا نہیں لگا.....“ رمان نے خاصے تکلف کا انداز اختیار کیا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“

”تو کیا مطلب ہے ڈیر بتا دو نا.....“ اوہ یکدم شوخ ہو گیا۔ نیناں شپٹا سی گئی۔

”آپ بے وجہ پریشان نہ ہوں۔“

”تمہارے لیے تو پریشان ہونا فرض العین ہے جناب.....“ ہنگلے کے گیٹ پر پہنچ کر وہ بولا تو وہ لجا سی گئی،

دل کی دھڑکنیں اودھم مچانے لگیں۔

☆☆☆

اس نے سچ ہی کہا تھا۔ اس رات وہ بنا ٹیبلٹ کے بھی سو گئیں، ریحان اختر نے سر اٹھا اٹھا کر تعجب سے

انہیں دیکھا تھا۔ آج وہ بدلی بدلی سی تھیں، صرف رات کے آخری پہر کو بے چینی سی بیدار ہوئیں تو دو تین کروٹیں

لے کر جاگ گئیں، کچھ دیر شدت سے دماغ میں کھنچاؤ پیدا ہوا گردن کی رگیں بھی تن گئیں تو انہیں دوانہ ہونے کا

احساس ہوا..... ہمت کر کے انہیں اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئیں، ٹی وی لاؤنج کی سامنے والی

دیوار پر لگے کلاک پر نظر ڈالی پونے چار ہو رہے تھے۔ بوا کے کمرے سے ان کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی

تو وہ ان کے پاس آ گئیں۔

”خیریت.....؟“ بوانے دروازہ کھولتے ہی پہلا سوال کیا۔

”بس سر میں درد ہو رہا ہے، گردن تک کھنچاؤ ہے۔“

”گولی نہیں کھائی اس لیے.....“

”ہاں شاید..... مگر ابھی ایسا ہوا ہے باقی تو میں سو گئی تھی۔“

”اچھا، یہ تو اچھی بات ہے۔“ بوا خوش ہو گئیں۔

”مگر اب دوا چاہیے۔“

”تو دو ابدل کر لے لو، فجر کا وقت ہونے والا ہے وضو کرو اور نماز پڑھو، ورد کرو اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے

صحت بھری نیند عطا کی۔“ بوانے ان کے دماغ کی چیخنی کھٹ سے کھول دی اور وہ ششدر سی بوا کو دیکھنے

لگیں..... یہ ان کی تسبیح اور نماز کا وقت تھا وہ مصلیٰ، بچا چکی تھیں جبکہ وہ سوچ رہی تھیں کہ کیا واقعی اس آدمی دوائی

کے تصور سے بھی سکون آ گیا ہے۔

پھر انہوں نے بوا کے کہنے کے مطابق خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھی، رب کائنات سے سکون و اطمینان کی دولت مانگی اور اپنی نیناں کی کامیابی کی دعا مانگی..... نیناں کا پرچہ تھا انہوں نے بڑی مدت کے بعد اس کو ممتا کے احساس کے ساتھ یاد کیا..... نیناں ٹھیک چھ بجے سو کر اٹھتی تھی، اس کے لیے فرنیچ ٹوسٹ تیار کیا..... نیناں کو ناشتے میں فرنیچ ٹوسٹ اور چیز آملیٹ پسند تھا انہوں نے سب تیاری کی، اپنے لیے بوا کے لیے چائے بنائی رس اور بسکٹ لیے ان کے پاس آگئیں، وہ بس ورد سے فارغ ہو کر ناشتے سے پہلے کی دوا کھا رہی تھیں۔

”یہ لیں بوا اگر ما گرم چائے اور آپ کی پسند کے نمکین بسکٹ...“

”یہ تم نے بنائی ہے؟“

”ہوں، اچھی بنائی ہے“ وہ منہ کر کے فرنیچ بسکٹ کا ٹکڑا ڈالتے ہوئے بولیں۔

”یقیناً اچھی بنائی ہوگی۔“ بوانے تاسیدی اور ان کے پاس بیٹھ گئیں۔

”کتنا سکون ہے اس وقت تمہارے چہرے پر۔“

”اچھا! اندر تو مجھے محسوس ہو رہا ہے۔“

”اور وہ سرد درد.....؟“ بوانے رس چائے میں ڈبویا۔

”ٹھیک ہو گیا ہے۔“

”نماز سے سب درد ٹھیک ہو جاتے ہیں۔“

”پہلی بار اتنی دیر بعد میں نے یہ جانا ہے، مجھے اپنے برابر سوئے ریحان پر نہ غصہ آیا نہ نفرت ہوئی، مجھے اس سے گھن بھی نہیں آئی۔“ انہوں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

”ریحان کے لیے اللہ سے ہدایت مانگا کرو۔“

”مجھے ریحان پر بات نہیں کرنی۔“

”نیناں کو جگانا ہے، میں آتی ہوں۔“ بوا بولیں۔

”آپ آرام سے چائے پیئیں میں خود دیکھتی ہوں، میں اس کا ناشتا بھی خود بناؤں گی۔“ وہ یہ کہہ کر باہر نکلیں تو ریحان جاگنگ کے لیے تیار ہو کر کمرے سے باہر آ رہے تھے۔ انہیں فریش اور تروتازہ دیکھ کر ذرا متحسسی مسکان لیے قریب آئے اور بولے۔

”اس غیر معمولی تبدیلی میں کس کا ہاتھ ہے مائی ڈیر؟“

”تمہارا.....“ مختصراً کہا گیا۔

”کیسے؟“

”تم نے اپنا اور میرا مقام واضح کر دیا، بہت شکریہ، بہت مہربانی.....“ وہ خاصی ادا سے اٹھلا کر یہ کہتے ہوئے نیناں کے کمرے میں چلی گئیں تو وہ پیچھے چلے آئے یہ کہنے کے لیے۔

”چلو اس بہانے تمہیں سابقہ پہلی محبت اور محبوب مل گئے۔“ ان کا اشارہ پروفیسر سحان کی طرف تھا.....
 رابعہ نے پلٹ کر دیکھا اور کہا۔

”کاش سبحان سے میں نے محبت کی ہوتی.....“

”وہ تو کرتا تھا.....“

”اب بھی کرتا ہے مگر میں تم سے یہ انتقام نہیں لینا چاہتی.....“ ان دونوں کی آواز پر نیناں کسماسی۔

”نیناں! بیٹا اٹھو.....“ وہ نیناں کی طرف بڑھیں اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں..... ریحان اختر چلے گئے تو وہ طویل سرد آہ بھر کے رہ گئیں۔

”مما! آپ، خیریت تو ہے.....“ نیناں انہیں قریب دیکھ کر پرتشویش انداز میں اٹھ کر بولی۔

”سوئٹ ہارٹ! بالکل خیریت ہے، آپ کو جگانے آئی ہوں۔“ رابعہ نے پیار سے کہا۔

”سچ.....“ نیناں کی خوشی دیدنی تھی۔

”اٹھو، تہا کرتیار ہو جاؤ، میں ناشتالاتی ہوں۔“

”مما جی! آپ ناشتالائیں گی.....؟“ وہ خوشی سے اچھل کر ان کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے بولی۔

”ناشتا اور وہ بھی میری نیناں کی پسند کا۔“

”تھینک یو ممما!“ وہ اٹھ کر سلپر پیروں میں ڈال کر واش روم کی طرف چلی گئی اور رابعہ نے کچن کا رخ کیا۔

☆☆☆

ذوالفقار سے اگلی ملاقات اتفاقی تھی۔ دادی کی طبیعت کی خرابی کے باعث وہ خود گاڑی لے کر نکلی تھیں..... فروٹ شاپ کے سامنے گاڑی روک کر لمحوں میں فیصلہ کیا کہ کیا لینا چاہیے..... گاڑی سے باہر نکل کر وہ دکاندار سے کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ وہ کان میں دھیرے سے بولا۔

”گڈ سائن میم!“ وہ چونک کر پلٹی تو وہ پشت پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”ارے، آپ یہاں.....“

”بس فروٹ چکھنے تھے.....“ اس نے عجیب سا جواب دے کر انگور کے ٹوکڑے سے ایک دانہ اٹھا کر منہ

میں ڈالا۔

”چکھنے کیا مطلب.....“

”میم! آپ جیسے لوگ خریداری کرتے ہیں اور ہمارے جیسے چکھنے کا تکلف کرتے ہیں۔“

”ایسی باتیں نہیں سوچتے.....“ انہوں نے مطلب سمجھ کر سادگی سے کہا۔

”بہر کیف! فروٹ کی شاپ پر آپ کا ہونا علامت ہے اس بات کی کہ اب اس گولی کی ضرورت آپ کو

نہیں رہی۔“

”اوہ! ہاں رات میں سو جاتی ہوں، بس کچھ تنگی ہوتی ہے مگر آئی ایم سوپہی۔“ وہ خوشی سے بتا کر دوسری

طرف شاپ کیپر کو کہنے لگیں۔

”سیب، کیلے، آڑو اور انگور گاڑی میں رکھوا دیں۔“

”واہ! کیا انداز ہے میم؟ کویشی بھی نہیں بتائی.....“ شاپ کیپر کے لبوں کی بات اس نے ادا کر دی۔

”ہاں! بس سب کچھ دو، دو کلو کر دیں..... اور ان کے لیے بھی یہی سب کچھ تول دیں۔“ اس نے اپنے

لیے اور ذوالفقار کے لیے آؤر سیم کر دیا۔

”نہیں میم! یہ میری قوت خریداری سے باہر ہے، آپ کو قیمتوں کا اندازہ ہی نہیں شاید.....“ وہ جلدی سے

مخاطب ہوا تو وہ ہنس دیں۔

”مجھے انسانوں کی قیمت کا اندازہ ہے، آپ فروٹ کی بات کر رہے ہو، میرے میاں انسانوں کو خریدنے

کا ہنر جانتے ہیں..... یہ میری طرف سے آپ کے خلوص کی نذر ہے۔“ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے

بولیں تو وہ پہلی مرتبہ کی طرح کھڑکی پر جھک گیا اور بے دھڑک کہہ گیا۔

”ایک شرط پر کہ آپ کی اور ہماری دوستی پکی۔“

”کیا مطلب.....؟“ ذوالفقار کو اس کی شرط بہت معصوم سی لگی۔

”آپ بہت اچھی ہیں۔“ اس نے سوال گندم جواب باجرہ والا کام کیا..... وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ

فروٹ پیک ہو کر گاڑی تک آگئے..... رابعہ نے پچھلا دروازہ کھولا ملازم لڑکے نے فروٹ کے تھیلے سیٹ پر رکھ

دیے اور بل انہیں تھما دیا۔

”یہ لو تین ہزار دو سو.....“ انہوں نے بل کھڑکی سے باہر ہی پھینک کر پیسے دیے۔

”تھنے کا شکریہ.....“ وہ بولا۔

”ذوالفقار آپ نے جو تھنہ دیا ہے، یہ اس کے مقابلے میں کچھ نہیں۔“

”آپ کو ایسے ہی جینا چاہیے۔“ وہ مسکرایا۔

”تھینک یو!“ رابعہ نے کہا اور کھڑکی کا شیشہ اوپر کر کے گاڑی اشارت کر دی۔

یہ ذوالفقار سے ان کی دوسری ملاقات تھی جو کہ دادی کے پاس پہنچنے کے کچھ دیر بعد تک یاد رہی اور پھر وہ

بھول گئیں..... دراصل دادی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی وہ ان کی پٹی سے لگ گئیں..... بخار کی غنودگی میں بھی

زیتون بیگم نے پوتی کے چہرے پر سکون دیکھ لیا تھا۔

”ایسے ہی جیو چندا۔“ وہ بڑبڑائیں۔

”ہوں، ہاں ایسے ہی جینا ہے.....“ وہ ان کے گرم ہاتھ لیوں سے لگا کر بولیں۔

”نیناں.....؟“ انہوں نے پوچھا۔

”وہ کالج گئی ہے، میں کچھ دیر تک ڈرائیور کو بھیج دوں گی، یہیں آجائے گی۔“ وہ مطمئن ہو گئیں..... رابعہ

نے وال کلاک کی طرف نگاہ ڈالی ابھی پورا گھنٹا باقی تھا۔

☆☆☆

ظہورہ بی بی کو طاہرہ ہر ماہ ہی اچھی خاصی رقم مناسب رشتہ لانے کے لیے دیتی تھیں..... مگر ہزاروں روپے

ایٹھنے کے سوا کچھ سامنے نہیں آیا تھا..... جب زبان ظہورہ بی بی جو کہ بی بی کے نام سے زیادہ مشہور تھی دعا کو ایک

آنکھ نہ بھاتی تھی۔ جب بھی وہ کسی لڑکے کے گھرانے کی تعریفوں کے پل باندھتی یا لڑکے کو پرستان کا شہزادہ ظاہر

کرتی تو دعا جل بھن کر کچھ نہ کچھ ضرور کہہ دیتی، جس پر بی بی کی پیشانی پر ہزار بل پڑ جاتے اور وہ ترخ کر کہتی۔

”طاہرہ بی بی! یہ لڑکی مشکل ہی کے کہیں بے گی، ارے اس کی ذمہ داری لے گا کون.....؟“

”ایسے تو نہ کہا کرو بی بی.....“ طاہرہ یا عارفہ میں سے کوئی ایک یہ کہتیں وہ چند اچھے رشتے لاپچی تھی مگر دعا کے روئے سے کوئی بھی دوبارہ نہیں آیا بی بی اس بات کا بھی کھلم کھلا اظہار کرتی۔

”اللہ جھوٹ نہ بلوائے بہت بڑھیا بڑھیا رشتے لائی ہوں مگر دعا کی حرکتوں سے سب بھاگ گئے۔ جوتیاں گھس گئی ہیں طاہرہ بی بی۔“

”تو اسی کا تو مواضعہ دیتے ہیں۔“ عارفہ یہ کہہ دیتیں تو وہ تاؤ کھا جاتی۔

”عارفہ بیگم! رکشے والے کیا لے رہے ہیں معلوم ہے تم کو اور بھی سو باتوں کی ایک بات میں بے عزتی کرانے کے پیسے نہیں لیتی.....“ وہ یہ کہتی تو طاہرہ اور عارفہ چپ ہو جاتیں۔

آج بھی بی بی کی آمد پر طاہرہ خوش ہو کر عارفہ کو بھی بلا لائیں، دعا کو چائے اور شامی کباب کے لیے کہا..... دونوں جو نمی ظہورہ بی بی کے پاس بیٹھیں تو کمپیوٹر کی طرح وہ اشارت ہو گئیں۔

”دیکھو طاہرہ بی بی..... اب کی بار جس لڑکے کا رشتہ لائی ہوں سمجھ لو ہیرا ہے، اس کو نہ گوانا ورنہ عمر بھر پچھتاؤ گی، چھوٹا کنبہ ہے ایک بہن، ماں اور پھوپھی بس سوکھا سودا، نہ رولانا نہ جھنجھٹ..... ہنس مکھ، کڑیل جوان، پڑھا لکھا.....“ دعا کو چائے لاتا دیکھ کر ان کی زبان رک گئی..... کیونکہ اس کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔

”تو وہ ہیرا جو ہری کی پھیلی پر رکھو..... یہاں کیا لینے آئی ہو؟“ ٹرے پٹختے کے انداز میں میز پر رکھتے ہوئے وہ بولی..... تو بی بی سے زیادہ طاہرہ کو غصہ آ گیا۔

”دعا! بکواس بند کرو اور اندر دفع ہو جاؤ۔“

”دیکھ لیا، یہ بیٹی کچھ اور ہی سوچے ہوئے ہے، یہ رشتہ چھوڑا تو سمجھ لو ظہورہ بی بی پھر کبھی نہ آئی۔“

”کیوں، رشوت کھالی ہے اُن سے؟“ دعا نے جل کر کہا۔

”ارے لڑکی! تمہارا دماغ چل گیا ہے، شادی نہیں کرنی یا کہیں اور دل اڑکا ہے۔“ ظہورہ بی بی نے دل کھول کر زہرا گل دیا..... عارفہ نے پہلو بدلا، طاہرہ نے ندامت سے گردن جھکالی..... مگر دعا کو جیسے پٹنگے لگ گئے۔

”ہاں! ہاں! بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔“

”تو بہ تو بہ، بھی تو بہ بھلی ایسی آفت کی پرکالہ کا رشتہ میں تو نہیں کر سکتی۔“ ظہورہ نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔

”دعا! دفعان ہو جاؤ.....“ طاہرہ کھول اٹھیں۔

”دعا بیٹا! جاؤ جا کر رمان کو جگاؤ، میں نے اس کے ساتھ مارکیٹ جانا ہے۔“ عارفہ نے توبات ٹالنے کے لیے دعا سے کہا لیکن ظہورہ بی بی کی گاڑی اُلٹے ٹریک پر چل پڑی۔

”ارے عارفہ بیگم! تمہارا تو اکلوتا جوان بیٹا ہے، اسے تم اپنی بہو کیوں نہیں بنا لیتیں؟“ عارفہ تو شرمندہ ہو گئیں، طاہرہ کو اشتعال آ گیا۔

”میری بیٹی کوئی فالتو اور گری پڑی نہیں ہے کہ گھر والوں کی منت کروں۔“

”منت کی کیا بات ہے، گھر کی بیٹی گھر والے ہی ڈھکتے ہیں۔“ بی بی نے اپنی ضد برقرار رکھی..... دعا پیر پٹختے ہوئے اندر چلی گئی..... عارفہ بڑی ہمت کر کے اٹھیں اور دعا کے پیچھے چلی آئیں۔

دعا غصے کی وجہ سے ناخن چبا رہی تھی عارفہ نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اسے مخاطب کیا۔

”مجھے شرمندہ کیوں کراتی ہو دعا.....؟“

”مامی! آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں.....؟“

”اس لیے کہ اب ایسا لگ رہا ہے دعا، یہ تمہارے سامنے ہی بی بی نے رمان کا حوالہ دیا ہے۔“

”تو کیا فرق پڑتا ہے، بی بی کو تو بولنے کی عادت ہے۔“

”طاہرہ کے اشارے کو کیا کہوں.....؟“

”مامی! انہیں بھی بولنے کی عادت ہے، میرا تماشا بنا رکھا ہے، مجھے نہیں کرنی شادی وادی.....“ وہ جھلا کر بولی۔

”محض رمان کی وجہ سے۔“

”شاید.....“

”یہی تو شرمندگی ہے کہ رمان ایسا کرتا نہیں، تم ہی سمجھ جاؤ کہ سب کچھ مرضی سے نہیں ملتا.....“ عارفہ نے حقیقت تسلیم کر کے حقیقت پسندی کا درس دیا۔

”نہیں ملتا تو نہ ملے، میں نے کب شکوہ کیا ہے۔“

”ضد چھوڑو، بی بی جو رشتہ بتا رہی ہے اسے دیکھنے دو.....“ انہوں نے کہا..... پشت سے رمان کی آواز آئی..... وہ ماں کو پکارتا وہیں آ گیا تھا۔

”ارے، یہ کیا مشکوک گفت و شنید ہو رہی ہے؟“

”کچھ نہیں چلو.....“ عارفہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”آپ چلیں، میں آتا ہوں۔“

”نہیں ساتھ چلو.....“ عارفہ نے تحکم سے کہا۔

”میں دعا سے چائے بنوا کر پیوں گا آپ چل کر تیار ہوں.....“ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا..... عارفہ چلی گئیں..... دعا منہ لٹکائے کھڑی رہی تو وہ شرارت سے باز نہ رہ سکا۔

”کس نے مارا ہے تمہیں.....“

”نیناں نے.....“ اس نے خلاف توقع گلا پھاڑ کر جواب دیا..... تو وہ ہونٹ رہ گیا۔

”واؤ! نیناں میزائل اتنا دور مار ہے۔“ وہ تہقہہ لگا کر ہنسا۔

”رمان! میرا موڈ خراب ہے۔“ وہ خاصی بیزار سی بولی۔

”اس کی ذمے دار بھی نیناں ہی ہوگی، ہے نا.....! وہ شوخ ہو گیا۔

”ہاں! میری بے بسی کی ذمے دار نیناں ہے جس کی وجہ سے میں ظہورہ بی بی کے لیے کھیل تماشا بنی ہوئی ہوں۔“

”اوہ! اب سمجھا ظہورہ بی بی پھر کسی کچھیر کو لے آئی ہوگی۔“

”رمان! جاؤ جا کر اپنا کام کرو.....“ دعا سے پہلے طاہرہ پھپھو نے جواب دیا۔ وہ بہت اکھڑی اکھڑی سی تھیں، رمان کو کچھ تا سلف سا ہوا، اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر چلا گیا۔

☆☆☆

کافی غصے کی حالت میں وہ عارفہ کے کمرے میں داخل ہوا۔

”کیا سمجھ رکھا ہے طاہرہ پھوپھو نے مجھے، اگر ان کی بیٹی کو پسند کر لوں تو ٹھیک ورنہ وہ مجھے گھر سے نکال دیں۔“ نان اسٹاپ وہ بولتا چلا گیا، عارفہ نے سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا، جو اس وقت شوخ شریر رہا کسی طور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”چلو گاڑی نکالو، مجھے دیر ہو رہی ہے، سورج سوائیز پر آ گیا ہے۔“ وہ اس کا اشتعال نظر انداز کر گئیں۔
”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ بھی ایسا ہی چاہتی ہیں۔“ وہ ترخ کر بولا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئیں، ہاتھ میں پکڑا پرس بیڈ پر شیخ کر اس کے بالکل سامنے آ کر بولیں۔

”پھوپھی ہے وہ تمہاری۔۔۔۔۔ پہلا حق اسی کا ہے تم پر، تم دعا کو پسند نہیں کرتے تو کوئی رابطہ بھی ضروری نہیں ہے، سمجھے تم۔۔۔۔۔“

”میں کوئی شے، کوئی جاگیر نہیں کہ حق کے طور پر استعمال کیا جاؤں، یہ دل کا معاملہ ہے، دل دعا کے لیے راضی نہیں۔۔۔۔۔“ وہ دو ٹوک الفاظ میں فیصلہ بنا کر جانے لگا تو وہ بے دم سی ہو کر صوفے پر گر گئیں، ان کا اختیار نہیں تھا کہ وہ اسے راضی کرتیں، ان کا حق طاہرہ پر بھی یہ نہیں تھا کہ وہ ان کے دل کی بدگمانی دور کر سکتیں بس شرمندگی کے ساتھ آگئی تھیں۔ انہوں نے طاہرہ کی آنکھوں میں چھپا ملال اور شکوہ بھی دیکھا اور ظہورہ بی بی کی دودھاری تلوار ایسی زبان بھی سنی، دعا کے اندر اتر ادا ہواں، اس کا طیش، بدتمیزی سب کچھ دیکھا اور یقین کر لیا کہ وہ یہ سب رمان کے لیے، اس کی خاطر کر رہی ہے۔

”اب آئیں، کیا سوچنے لگیں۔۔۔۔۔“ وہ باہر نکل کر پلٹا تھا۔

”رمان! برکت بھائی کے احسانات ہیں، فرقان کی وفات کے بعد انہوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔“

”تو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اُن کی بیٹی کو قبول کروں؟“ وہ اکھڑا سا بولا۔

”ہاں! اس کا یہی مطلب ہے۔“ وہ چڑ کر بولیں۔

”دعا میری کزن ہے، میری دوست ہے بس اور کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ وہ یہ کہہ کر چوٹکا، دعائی وی لاؤنج سے ہو کر وہیں آچکی تھی۔۔۔۔۔ شاید اس نے بھی سن لیا ہو تبھی تو وہ دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
”کاش! میں کچھ بھی نہ ہوتی۔“

”دعا! ایسی باتیں کیں تو تمہارا گلا دبا دوں گا۔“ وہ اس پر حملہ آور ہوا وہ اچھل کر پرے ہو گئی۔۔۔۔۔ عارفہ باہر نکل گئیں تب وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر بہت نرمی سے قریب ہو کر بولا۔

”دعا! تم میرے دل میں، میری زندگی میں جو مقام رکھتی ہو وہ مقام کسی اور کا نہیں ہے، وہ مقام محسوس کر کے تو دیکھو۔“

”میرے دل میں جو تمہارا مقام ہے اسے بھی تو محسوس کرو۔“ اس نے روبرو ہو کر اظہار کیا تو وہ لمحے بھر کو چپ رہ کر بولا۔

”دعا! اپنے دل میں دوست کی محبت کو شامل کر لو، جان لو یہ حقیقت کہ میں نیناں کی محبت کسی اور کو دے نہیں سکتی۔“

”تم بھی سن لو رمان، میں تمہاری جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتی۔“ وہ یہ دھماکا کر کے چھلاوے کے مانند چلی گئی۔

”اچھی ہٹ دھرمی ہے یا راسے مجھ سے محبت ہے، زبردستی کی محبت۔۔۔۔۔“ وہ خود سے ہمکلام ہو کر باہر نکلا۔۔۔۔۔ اپنی دانست میں تو اس نے دعا کو سمجھانے کی پوری کوشش کر لی تھی۔ وہ یہی کر سکتا تھا، نیناں تو اس کی ہستی کا ساماں تھی، اس کے لیے تو دل کا معاملہ یہ تھا کہ وہ چاہے یا نہ چاہے اسے چاہیں گے ہم۔۔۔۔۔ اب تو اس کی بڑی بڑی جاذب آنکھوں میں وہ اپنا عکس دیکھنے لگا تھا۔ بے شک کھل کر اظہار نہیں کیا تھا مگر اس اظہار سے پہلے کے موسم اتر رہے تھے اس کے وجود پر، اب وہ پلکیں گراتی بھی تھی، نگاہیں جراتی بھی تھی، مسکرا کر کچھ کہتی بھی تھی اور کچھ چھپاتی بھی تھی۔

☆☆☆

نیناں کی خوشی دیدنی تھی۔۔۔۔۔ آخری پرچہ دے کر وہ گھر پہنچی تو رابعہ کو باورچی خانے میں چائیںز بناتا پایا کروہ جھوم اٹھی۔

”مائی سوٹ ماما۔۔۔۔۔“

”پیر کیسا ہوا۔۔۔۔۔؟“ چاؤ من کو ڈش آؤٹ کرتے ہوئے رابعہ نے پوچھا۔

”اے دن مگر بس ڈسٹر ب رہی۔۔۔۔۔“ وہ بولتے بولتے ایک دم اداس سی ہو گئی۔ رابعہ نے چکن نکٹس کڑا ہی کے گرم تیل میں ڈالتے ہوئے اس کا جائزہ لیا۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”ماما! بدیچہ پیر دینے نہیں آئی، اس کی اتنی اچھی تیاری تھی اور پیر نہیں دیا۔“

”لیکن کیوں۔۔۔۔۔؟“

”پتا نہیں۔۔۔۔۔“

”چلو اللہ خیر کرے، اچھائی کی دعا کرو۔“

”بوا کہاں ہیں۔۔۔۔۔؟“ اس نے پوچھا۔۔۔۔۔ عمو بوا کچن میں ساتھ ہوتی تھیں۔

”اپنے کمرے میں ہیں، طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”خیریت۔۔۔۔۔؟“ وہ فکر مند ہو گئی۔

”بس بڑھاپا بذات خود ایک بیماری ہے، اسٹور میں گھسی صفائی کر رہی تھیں ایک دم ہلڈ پریشور ہو گیا۔“

”اوہ! میں دیکھتی ہوں۔“

”جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر ٹیبل پر آ جاؤ میں کھانا لگوانے لگی ہوں۔“ رابعہ نے فرائڈ رائس کو آخری مرتبہ کفگیر سے مکس کرتے ہوئے تاکید کی۔

”بابا آگئے ہیں کیا۔۔۔۔۔؟“ نیناں نے پلٹ کر پوچھا اس خیال سے کہ کھانا ان کے آنے پر لگتا ہے۔

”شاید نہیں۔۔۔۔۔“

”تو پھر۔۔۔۔۔“

”تو پھر جو جب آئے گا کھالے گا، بوا کو میں نے جوس پلایا ہے، فروٹ کاٹ کر دیا ہے۔“ رابعہ نے سرسری سے بھی سرسری انداز میں جواب دیا اور مسلسل اپنے کام میں مصروف رہیں۔۔۔۔۔ نیناں نے پھر کوئی

2010

سوال نہیں کیا چلی آئی..... بوا آنکھیں موندے لیٹی تھیں..... اس کے چھونے سے آنکھیں کھولیں۔

”کیا بات ہے.....؟“

”بس ذرا جی گھبرا گیا تھا۔“

”آپ اسٹور میں کیا کرنے گئی تھیں، ملازم چلے گئے ہیں کیا.....؟“

”بس ویسے ہی تمہارے بابا کو جانداد کے کاغذات چاہیے تھے۔“

”اچھا! اب طبیعت کیسی ہے.....؟“

”بہتر ہے، ویسے اس عمر میں طبیعت ٹھیک کہاں رہتی ہے.....“ ان کے نکاہت زدہ لہجے میں افسردگی کا عنصر بھی شامل تھا۔

”بوا بات کچھ اور ہے بتائیں مجھے.....“ استاد لی تعلق تھا کہ وہ اداسی بھانپ گئی۔

”کچھ بھی تو نہیں، اپنی ماما کو خوش دیکھ کر کتنی خوش ہوئی یہ بتاؤ۔“

”آپ پہلے وہ بات بتائیں.....“ وہ مصر ہو گئی۔

”کچھ بات نہیں، بس یہ دوپٹا دیکھ کر تمہاری دادی یاد آ گئیں، یہ بی بی کا دوپٹا تھا انہوں نے وسیعہ کے لیے رکھا تھا مگر وسیعہ نے رات کی تاریکی میں اپنی چادر بھی دہلیز کے پار چھوڑ دی تھی..... ساری رات بی بی سکتے کی سی حالت میں رہیں، بس جیتے جی سر گئیں۔“

”کتنا خوب صورت ہے.....؟“ سرخ سنہری کامدانی بھاری دوپٹا پھیلاتے ہوئے وہ بولی۔

”اب تو گل گیا ہے، کام بھی کالا پڑ گیا ہے، کتنے باریک باریک سوراخ ہو گئے ہیں۔“

”چھوڑیں، دفع کریں، مت کریں وسیعہ پھپھو کا ذکر، گھر سے بھاگ گئیں اور سب کو دکھ دیا۔“ اسے غصہ

آگیا، دوپٹا زور سے لپیٹ کر فرش پر پھینکا تو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے طلال کے اندر جیسے صدیوں سے سویا اثر دھما بیدا ہو گیا۔

”شرم نہیں آتی میری ماں اور اپنی پھپھو کے لیے اتنی غلیظ زبان استعمال کرتے۔“

”طلال بھائی! آپ کی ماں نے اور میری پھپھو نے اچھا کام نہیں کیا۔“ وہ بھی ضبط نہ کر سکی۔

”یہ تربیت کر رہی ہو بوا، ماما تو مدہوش رہتی ہیں، تم اسے میری ماں کے خلاف کر رہی ہو۔“ طلال نے

بہت بدتمیزانہ کے ساتھ بوا کو مخاطب کیا جو نیناں برداشت نہ کر سکی۔

”شٹ اپ! گیٹ آؤٹ، گیٹ آؤٹ، یہ حقیقت ہے وسیعہ پھپھو نے اس گھر کی عزت مٹی میں ملائی،

دادا، دادی کی موت کی ذمے دار ہیں وہ۔“ وہ اٹھ کر مدمقابل آ کر چلائی تو طلال کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے،

دایاں ہاتھ اٹھا اور نیناں کے گال پر نقش بنا گیا..... وہ پتھر کر فرش پر جا گری بوا ہونٹ سی رہ گئیں..... وہ آنا فانا

کمرے سے نکل گیا..... تب نیناں شدت غم سے روتے چلاتے ہوئے باہر بھاگی..... رقت زدہ آواز میں ماں

اور باپ دونوں کو پکارتی۔

”مما..... ممما! ممما! بابا! بابا!“

پر دراز ہو گیا۔ رابعہ کو بہت برا لگا..... یہ سراسر بدتمیزی تھی کہ وہ پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔
”تمہیں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں، اب آج میں ریحان اختر سے پوچھوں گی کہ تمہاری حد کیا ہے؟“ وہ
یہ کہہ کر باہر نکل گئیں تو طلال کی آنکھوں میں شیطانی رقص کرنے لگی۔

”رابعہ ماما! ایک بار نیناں کو میرے قبضے میں آنے دیں پھر بتاؤں گا کہ میری حد کیا ہے؟ اور آپ کی رسائی
تک کیا ہے؟ میں بھی اس گھر کا حقدار ہوں۔ میری ماں نے غلطی کی ہے میں نہیں کروں گا..... ہنہ..... نیناں کو
ایسا سبق سکھاؤں گا کہ عمر بھر یاد رکھے گی۔“ وہ مٹھیاں بھینچ کر جبرے مضبوطی سے دبا کر اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے
لگا۔ کافی دیر ٹہلنے کے بعد بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی بھرا اور غنا غٹ پی گیا۔

”آہ بے چاری نیناں! اسے تو اندازہ ہی نہیں کہ شراب پسندیدہ ہو تو کیسے پی جاتی ہے؟“ اس پر سوچ کر
ہی خمار طاری ہو گیا۔ خود بخود آنکھیں مخمور ہو گئیں اور ہولے ہولے ہنسنے لگا..... اسے کمرے کی ہر شے میں نیناں
دکھائی دینے لگی..... اپنے پسندیدہ گلابی رنگ کے لباس میں ملبوس، زلفوں کے آوارہ بادلوں میں چھپے گلابی
چہرے کے ساتھ..... اس نے بے تاب ہو کر اسے بانہوں میں بھر لیا..... رنگین شرارتوں میں ڈھیر سارا وقت
بتا دیا..... سرگوشیاں، ترنم اور غنائیت سے بھرے لفظ اس کے کانوں میں اتارتا رہا۔

کتنے پل، کتنے لمحے، کتنے گھنٹے اور کتنا وقت بیتا..... اسے یہ ہوش ہی نہیں رہا..... خمار تو خمار ہوتا ہے جب
چڑھ جائے تو اپنی مرضی سے اترتا ہے یہی حال اس کا تھا، جس کو تھپڑ مار کے رلا یا وہی حواسوں پر طاری تھی، یہ سچ
تھا کہ نیناں اس کی پسند اور ضد تھی..... مگر ماں سے متعلق جملے سن کر وہ ضبط نہ کر سکا۔ یہ بھی اسے اندازہ تھا کہ
ماموں کو اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ کیوں تھپڑ مارا؟ ریحان اختر نے اسے بیٹے کی طرح پالا تھا، وہ ان کے نزدیک
بہن کی آخری نشانی تھی، سب کچھ اس کے سامنے تھا، کاروبار، کاروباری معاملات سب میں وہ خود مختار تھا.....
اور اسے یقین تھا کہ نیناں اس کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔

”نیناں صرف طلال کی ہے..... صرف طلال کی، سن لیں سب۔“ اس نے خاصی اونچی آواز میں نعرہ سا
لگایا، اپنی دانست میں سب کو سنایا مگر کمرے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

ریحان اختر رات کافی دیر سے لوٹے تھے۔ رابعہ نے فون پر طلال کی بدتمیزی کی خبر دی تھی اس لیے وہ
سیدھے اس کے کمرے میں گئے۔ کچھ دیر بعد ڈائنگ روم میں آئے تو بواؤن کی ہمیشہ کی طرح منتظر تھیں.....
کھانا میز پر لگا ہوا تھا، ان کی کرسی کے سامنے پلیٹ صاف شفاف موجود تھی، باقی دو کرسیوں کے سامنے والے
خالی برتن یہ ظاہر کر رہے تھے کہ یہاں کھانا کھایا جا چکا ہے..... موڈ پہلے ہی خراب تھا، پیشانی پر ہزار ہا سلوٹیں
ڈال کر بواؤ سے پوچھا۔

”باقی لوگ کھانا کھا چکے ہیں؟“

”ہاں!“

”تو میز پر کھانا لگانے کی ضرورت کیا ہے؟“ کرسی کھینچ کر بیٹھے ہوئے چھبٹا ہوا طنز کیا۔

”طلال کو کچھ کہا کہ.....“ بواؤ ان کا طنز نظر انداز کر کے اصل مقصد کی طرف آ گئیں۔

”طلال ہاؤڈ پر یو.....“ رابعہ نے شدید غصے سے کہا۔

”مامی! آہستہ بولیں، میں بہر انہیں ہوں۔“ وہ بڑی بے پروائی سے کہہ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

”تم نہ صرف بہرے ہو، اندھے بدتمیز انسان ہو، تمہیں رشتوں کا احترام بھی معلوم نہیں۔“ رابعہ نے

اس کے پیچھے آ کر اور زیادہ بلند آواز میں کہا تو وہ ابرو چڑھا کر مقابل آ گیا۔

”جی ہاں! ہر الزام لگائیں مجھ پر کیونکہ میں ریحان اختر کا بھانجا ہوں، میری مرحومہ ماں نہ رہی تو اس کو جو

جی میں آئے آپ ماں بیٹی کہیں..... لیکن نہیں۔“ وہ ایک دم غرایا۔

”نہیں ماما! حضور! نیناں کو سمجھا دیں بلکہ تہذیب دیں کہ رشتوں کا احترام کیسے کرتے ہیں.....؟“

”وہ نادان نہیں، تم نے اسے تھپڑ مارا یہ انسانیت ہے۔“

”اس نے میری ماں کو برا بھلا کہا یہ انسانیت ہے؟“ وہ دوبارہ ہو گیا۔

”تمہاری ماں نے جو کیا وہ اگر تمہیں نہیں معلوم تو پوچھو اپنے چہیتے ماموں سے، نیناں نے جھوٹ نہیں

کہا۔“ وہ بہت کڑک آواز میں بولیں۔

”تو یہ ٹریننگ کر رہی ہیں آپ اپنی لاڈلی کی، کچھ سوچنا پڑے گا۔“ وہ بڑی ذومعنی مسکراہٹ کے ساتھ بیڈ

”سمجھا دیا ہے.....“ انہوں نے دھیمے اور نرم لہجے میں کہا۔

”صرف سمجھایا ہے یا تاکید کی ہے.....؟“

”کسی کی مری ہوئی ماں کی بے عزتی نہیں کرتے، طلال کو سمجھانے سے زیادہ رابعہ کو بتانے کی ضرورت ہے کہ وہ نیناں کے دماغ میں زہر نہ بھرے۔“ وہ اٹھے ہی طریقے سے بولے تو بوا کو غصہ آ گیا۔

”رابعہ کہاں سے آ گئی۔“

”نیناں کو اٹھے ٹریک پر نہ چلایا جائے.....“ وہ اپنی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے بولے۔ بوا کی سمجھ میں آ گیا کہ ریحان نے زیادہ سے زیادہ طلال کو کیا کہا ہوگا؟ یہی تضاد اُن کی شخصیت کو مشکوک بناتا تھا کہ ایک طرف نیناں اُن کی کل کائنات تھی دوسری طرف طلال کی نیناں کے ساتھ کی ہوئی ہر بد تمیزی کو وہ بڑے سلیقے سے برداشت کر جاتے تھے، اگر کچھ کہتے بھی تو بہت قریب سے یہی چھوٹ طلال کو خود سر بنانے کی بڑی وجہ تھی..... بوا نے طلال اور نیناں کے درمیان کبھی التفات نہیں دیکھا تھا مگر انہیں یقین تھا کہ ریحان طلال کے لیے کون سا فیصلہ بھی کر سکتے ہیں، نیناں کے لیے انہیں طلال سے زیادہ کون مناسب لگے گا، یہی فکر وقت کے ساتھ ساتھ رابعہ کے ذہن میں پختہ ہوتی جا رہی تھی۔

ریحان اختر خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف تھے، بوا کچن میں جا چکی تھیں، تبھی فیضو نے آ کر دلشاد صاحب کے آنے کی اطلاع دی..... ریحان اختر بھناٹھے، طیش میں آ کر غلیظ سی گالی دی اور کہا۔

”اے کہو تمہیں انسانیت کی زبان سمجھ نہیں آتی۔“

”جی.....“ فیضو خوف اور حیرت سے دیکھتا رہا تو وہ دھاڑے۔

”جاؤ نکالو اسے اور ہاں، کہنا کہ آئندہ یہاں نہ آئے.....“ فیضو جلدی سے چلا گیا تو وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے کمرے میں آ گئے..... تیمور بگڑے تھے... رابعہ کو طلال کی بد اخلاقی پر غصہ اور اشتعال تھا..... روٹین میں تو وہ واجبی سی موجودگی کا احساس دلاتی تھی لیکن آج بہت کچھ کہنے کی تیاری کے ساتھ منتظر تھی۔

”اوہ! آپ جاگ رہی ہیں، کھانا اکیلے کھالیا تھا تو سو بھی جاتیں۔“

”یہ موضوع غیر اہم ہے، میں کسی مشورے کی قائل نہیں۔“

”ہوں، تو پھر یقیناً طلال کے موضوع پر بات کرنی ہوگی.....“ وہ جوتے اتارتے ہوئے بڑے سرسری سے انداز میں بولے۔

”نہیں، مجھے اپنی بیٹی کی رسپیٹ کے لیے بات کرنی ہے۔“

”نیناں میری بیٹی ہے اور طلال بھانجا..... اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ بڑے سادہ اور روکھے سے تاثرات دے کر واش روم میں گھس گئے۔ رابعہ سلگ انھیں انہیں اندازہ تھا کہ ریحان، نیناں کے معاملے میں بہت ایکسٹریمسٹ ہیں وہ طلال کی اس بدتمیزی کا سختی سے نوٹس لیں گے مگر ایسا ہوا نہیں..... یہی کسک رابعہ کو جھنجھوڑ کر رکھ گئی..... مگر کچھ بھی پوچھنا اب غیر ضروری تھا۔ اندر ہی اندر زہر کا گھونٹ بھرا اور کروٹ لے کر لیٹ گئیں..... کچھ دیر بعد ریحان اختر باہر آئے لائٹس آف کیں اور ان کے برابر لیٹے ہوئے فقط اتنا کہا۔

”رمان سے کہنا کہ کل مجھے آفس آ کر ملے۔“ وہ چونکیں رمان کا تذکرہ اور اس وقت..... کچھ پوچھنا چاہا

مگر وہ کروٹ لے کر اجنبی سے بن گئے۔

پھر رات بھر غصے، اضطراب، ذہنی خلفشار اور اسرار نے انہیں سونے نہیں دیا نہ گولی تھی اور نہ کوئی طریقہ جس سے نیند قریب آتی..... انہیں رہ رہ کر گولی نہ ہونے کا افسوس ہوتا رہا..... اس اجنبی ہمدرد کی ہمدردی نے بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔

☆☆☆

اگلے دن ناشتا کرتے ہی رابعہ نے پرس سے ذوالفقار کا کارڈ نکالا..... کارڈ لیس پر اس کا نمبر ڈائل کیا..... کافی دیر تیل بجتی رہی لیکن فون ریسپونڈ نہ ہوا..... بار بار نمبر ملانے کی کوئی آٹھویں کوشش کامیاب ہو گئی۔

”ہیلو!“ دوسری طرف سے شمار آلود مردانہ آواز ابھری۔

”ہیلو، ذوالفقار!“ انہوں نے براہ راست پوچھا۔

”اوہ ہوں، جی بول رہا ہوں.....“ شاید نیند بھگانے کی کوشش کے ساتھ کہا گیا۔

”میری میڈ لسن ملیں۔“

”جی.....“ وہ مستقبل ہوش میں آ گیا۔

”میں مسز رابعہ بول رہی ہوں، آپ نے میری ٹیلیفون ڈسکوڈ نے کا وعدہ کیا تھا؟“ انہوں نے عجلت میں تعارف بھی کرایا اور وجہ بھی بیان کر دی۔

”اوہ اچھا، اچھا! لیکن میں نے ایک گزارش کی تھی.....“ وہ پہچان کر بڑی اپنائیت سے بولا۔

”چھوڑیں وہ گزارش، مجھے رات بھر نیند نہیں آئی، آپ پلیز وہ آرینج کر دیں ورنہ.....“

”ورنہ کیا.....؟“ بے تکلفی سے پوچھا گیا۔

”ورنہ میں خود تلاش کرتی ہوں۔“ وہ بیزار سی تھیں۔

”مسز رابعہ ریحان! آپ کوئی اور نشہ لگالیں۔“

”کیا مطلب؟ اور آپ کو میرا پورا نام کس نے بتایا؟“

”آپ کو کون نہیں جانتا؟ اتنے بڑے آدمی کی بیوی ہیں آپ، خیر یہ چھوٹا کام چھوڑ کیوں نہیں دیتیں.....؟“

”آپ پر مثل ہو رہے ہیں۔“

”سوری! گولیاں کہاں پہنچانی ہیں؟“ رابعہ کے خشک جملے پر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”میں ابھی تو اپنی سسٹر کی طرف جارہی ہوں واپسی پر آپ سے لے لوں گی۔“

”او کے!“

”شکریہ! اللہ حافظ.....“ رابعہ نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

رابعہ نے ناشتے کے وقت ہی اونچی آواز میں نیناں کو تیار ہونے کو کہا تھا تا کہ ریحان سن لیں، طلال اور ریحان دونوں نے ان کی طرف دیکھا مگر وہ نظریں جھکا کر ٹوسٹ کھانے میں مصروف رہی تھیں..... ریحان نے انہیں ناشتا ختم کر کے اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔

”کہاں کا پروگرام ہے؟“

”کہیں بھی.....“

”نیناں کے ایگزٹام ختم ہو گئے ہیں، میں چاہتا ہوں یہ آفس میں کام سمجھے۔“

”نیناں سے بات کریں، کیا اس میں مزید تھپڑ کھانے کا حوصلہ ہے؟“ انہوں نے براہ راست طلال پر دار کیا، وہ تلملا کر اٹھ گیا۔

”رائی کا پہاڑ مت بناؤ، جاؤ دونوں جہاں جی چاہے جاؤ.....“ وہ مشتعل سے ہو کر چلے گئے۔ نیناں بالکل تیار تھی..... وہ خود جلدی سے تیار ہوئیں اور پرس، گاڑی کی چابی لے کر باہر نکلیں..... نیناں بھی پیچھے آگئی۔

”مما! کسی طرح مدیحہ کا پتا کرنا ہے؟“

”رمان سے کہوں گی لے جائے گا۔“ گاڑی اشارت کرتے ہوئے جواب دیا۔

”گاڑی وہاں نہیں جاتی۔“

”رمان کے پاس موٹر سائیکل ہے وہ اس پر لے جائے گا۔“ انہوں نے تسلی بھرا جواب دے دیا تو وہ خاموش ہو گئی۔

”آئندہ کبھی طلال کے منہ نہیں لگنا، مت ذکر کیا کرو اس کی ماں کا۔“ مین روڈ پر گاڑی دوڑاتے ہوئے انہوں نے تنبیہ کی۔

”وہ اور برے لگنے لگے ہیں۔“

”آپ کے بابا کو تو پسند ہیں، کس طرح سپورٹ کرتے ہیں۔“ انہوں نے اندر کا غصہ دبا کر کہا۔

☆☆☆

ہوا کے گھوڑے پر سوار پینٹ کی ہیلٹ لگا تا وہ صحن میں آیا تو اکبری بیگم نے تنبیہ کی۔

”زلفی! پولیس پیچھے لگی ہے یا قیامت آگئی ہے، کاہے کی جلدی پڑ گئی؟“

”اماں! دیر ہو گئی ہے، بس اور کچھ نہیں۔“

”کوئی دیر نہیں ہوئی، ڈھنگ سے بات سنو بیٹھو، میرے پاس۔“

”اوہ جی! بولیں.....“ چارونا چاروہ پلنگ کی پٹی پر ٹپک گیا۔

”مدیحہ کو سمجھاؤ کہ اب آگے داخلہ نہیں لینا، بس جو پرچہ رہ گیا ہے وہ دے کر فارغ۔“

”آگے آگے بولیں۔“ وہ جلدی کے باعث موبائل کی اسکرین پر ٹائپ دیکھتے ہوئے بولا۔

”آگے کیا..... پہلی بات تو سنی نہیں.....“ اکبری بیگم کو غصہ آ گیا۔

”بھئی مدیحہ کو پرچہ تو دے لینے دیں پھر سمجھا دیں گے، ویسے آگے داخلے سے کیا مسئلہ ہے.....؟“

”میرا اور آپا کا خیال ہے کہ اس کی شادی کر دیں۔“

”یہ آپ دونوں کو کیا ہو گیا ہے.....؟“ اب کی بار وہ چونکا۔

”مدیحہ، آپا سے بہت پیار کرتی ہے ان کی وجہ سے دیکھا نہیں پرچہ تک چھوڑ دیا۔“ اکبری بیگم بہت سنجیدگی سے بولیں۔

”آپا سے تو میں بھی بہت پیار کرتا ہوں اور آپ بھی تو انہیں چاہتی ہیں۔“ زلفی نے جیسے یاد دلایا۔

”میں کب انکاری ہوں مگر مدیحہ لڑکی ہے وہ جس طرح اثر قبول کر رہی ہے، اس سے تو نفسیاتی مریض بن جائے گی، آپا پر تو جو گزری سو گزری مدیحہ کی حالت بہت عجیب ہو جاتی ہے۔“

”خون تو میرا بھی کھولنے لگتا ہے، بس برداشت کرتا ہوں۔“ زلفی نے دبے دبے لہجے میں اظہار کیا۔

”سانپ گزرنے کے بعد لکیر پٹنے سے حاصل، آپا کی عمر ساری کٹ گئی، مدیحہ ابھی کچی عمر میں ہے، چڑچڑی بد مزاج ہو جاتی ہے، آپا نے یہ مشورہ دیا ہے۔“ اکبری بیگم نے اٹھ کر بیٹے کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا.....

”ان کی تو عمر بھر کی کمائی یہ دو بچے ہی تھے انہیں داؤ پر لگانے کا ان میں حوصلہ نہیں تھا۔“

”لکیر پٹنی نہ بھی جائے تو لکیر پر چلا تو ضرور جاسکتا ہے، خیر آپ نے خود مدیحہ سے بات کرنی ہے.....“

وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ماں کے ہاتھ کا اثر تھا یا مصلحت پسندی کا تقاضا۔

”شادی کی بات تو اس سے کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے رشتے کرانے والی سے کہہ دیا ہے کہ

میرے بیٹے اور بیٹی کے لیے مناسب رشتے کرائے۔“

”کیا بیٹے کے لیے بھی کہہ دیا.....؟“ وہ ہنسا۔

”ہاں، مدیحہ کے بعد کوئی سہارا بھی تو ملے۔“

”گویا آپ کو بہو نہیں ملازمہ چاہیے.....“ اس نے شرارت سے کہا

”چل بدتمیز.....“ انہوں نے ڈانٹا۔

”اچھا، ٹھیک ہے پھر آپ کریں اپنی مرضی.....“ وہ وقت کا احساس کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

”پھر جلدی.....“

”اب کیا ہے.....؟“

”کچھ سبزی ترکاری کا بندوبست کر کے جاؤ، میرے گھٹنے میں بہت درد ہے، رازار نہیں جاسکتی۔“

”اوہ! کچھ بھی پکالیں مجھے دیر ہوگئی ہے۔“

”بھائی اتنی جلدی کیا ہے.....؟“ کمرے سے مدیحہ نے آکر ٹانگ اڑائی۔

”یہ تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں.....“

”اچھا آپا کے لیے بکرے کا گوشت لا کر دیں، بخنی بنا کر دینی ہے۔“

”ہیں، ہیں بکرے کا گوشت، معلوم ہے کس بھاؤ مل رہا ہے؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”آپا سے اتنی محبت ہے.....“ مدیحہ نے جذباتی بلیک میلنگ کی تو وہ گڑبڑا سا گیا۔

”ہوں! اچھا لیتا آؤں گا۔“

”آپا نے کہا ہے تم سے.....“ اکبری بیگم نے مدیحہ سے پوچھا۔

”نہیں، وہ تو بس گم صم سی لیٹی ہیں، بہت کمزور ہو رہی ہیں۔“ مدیحہ نے کہا۔ زلفی فوراً موٹر سائیکل لے کر

نکل گیا..... البتہ اکبری بیگم نے مدیحہ کو نرمی سے سمجھایا۔

”کچھ ہانڈی چولھا بھی دیکھا کرو، آپا کو آرام کرنے دو ہر وقت ان پر مسلط رہتی ہو۔“

”وہ تو بہت اکیلی ہیں، اماں آپ تو جانتی ہیں جب کئی کئی دن وہ چپ ہو جاتی ہیں۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ وہ خود اس چپ سے باہر نکلتی ہیں ایسے میں تم اپنے کام کا ج سیدھے کیا

کرو.....“ اکبری بیگم نے اپنی دانست میں اس قدر نرمی سے کہا کہ مدیحہ نے زچ ہو کر قطعاً بحث نہیں کی۔

☆☆☆

کافی دنوں بعد دونوں بہنیں ملی تھیں۔ عارفہ خوشی سے کھل اٹھیں..... رمان باہر جانے کے لیے پرتول رہا

تھا۔ انہیں دیکھ کر ارادہ ترک کر دیا۔

”میری نیناں بیٹی کیسی ہے، پرچے کیسے ہوئے؟“ عارفہ نے نیناں کو پیار سے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”اچھے ہوئے ہیں۔“ نیناں نے کہا۔

”آؤ بیٹھو یہاں میرے پاس.....“ عارفہ نے ڈالر سے کہا تو رمان شوخ ہو گیا۔

”واہ! آپ دونوں اپنی باتیں کریں، ہم اپنی گپ شپ لگائیں گے۔“

”شریر! نیناں کو مدیحہ کے گھر تلے جاؤ۔“ رابعہ نے رمان سے کہا..... عارفہ نے واضح طور پر بہن میں

تبدیلی محسوس کی..... دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔

”توبہ، توبہ..... مدیحہ کے گھر میں نہیں لے جاسکتا.....“ رمان نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”بھئی! اپنی موٹر سائیکل پر لے جاؤ.....“ رابعہ نے جھٹ انکار کی وجہ سمجھ کر مشورہ دیا تو اس کی باچھیں کھل

اٹھیں۔

”ہاں! یہ ٹھیک ہے، میں ذرا موٹر سائیکل اچھی طرح صاف کرتا ہوں۔“ رمان نے مشورہ قبول کرتے ہی

پورچ کا رخ کیا جہاں ایک کونے میں کھڑی موٹر سائیکل تقریباً مٹی مٹی ہو رہی تھی۔

”رابعہ کتنی اچھی لگ رہی ہو۔“ عارفہ نے تعریف کی۔

”اب اچھی ہی لگا کروں گی۔“

”ریحان سے صلح کر لی؟“ عارفہ نے ایسے ہی کہہ دیا۔

”ریحان نے سچ بول دیا۔“

”کیسا سچ.....؟“

”خوش فہمی کا سچ، اب مجھے ریحان سے کوئی شکوہ نہیں رہا، یہاں ستر، اسی فیصد عورتیں بنا محبت کے بیوی

بن کر گھروں میں رہتی ہیں، میں نے بھی یہی سمجھ لیا ہے۔“ وہ کچھ گھما پھرا کر کہہ گئیں مگر نیناں وہاں سے اٹھ کر

پورچ کی طرف آ گئی۔

طاہرہ پھوپھو کا دروازہ پورچ میں کھلتا تھا..... دعا جھاڑن کی آواز پر وہاں آ گئی..... رمان نے شرارت سے

منہ چڑایا..... وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ نیناں بھی وہیں آ گئی، جینز پر کمرے کٹ اپ پہنے، بالوں کی پونی ٹیل

بنائے..... دعا نے سنجیدہ سا چہرہ بنا کر اسے سر سے پیر تک دیکھا اور بات رمان سے کی۔

”خیریت ہے، موٹر سائیکل کیوں چمکا رہے ہو.....؟“

”دعا تم نے وہ فلم دیکھی ہے، پرانی فلم ندیم، شبنم کی.....؟“ بڑی سادگی سے پوچھا۔

”جی نہیں، میں پرانی نہیں ہوں۔“ دعا نے چڑ کر کہا۔

”معلوم ہے، ویسے پار کیا فلم ہے؟ موٹر سائیکل پر ندیم اور پیچھے شبنم سڑکوں پر، ساحل سمندر پر جھومتے

لہراتے ہیں گاتے ہیں۔“ وہ فلم کے سین کی بھر پور عکاسی کرتے ہوئے بولتا چلا گیا..... دعا جل بھن کے نیناں کو

گھورنے لگی، نیناں تو رمان کی اداکاری پر مسکرانے میں مصروف تھی۔

”فلم، فلم ہوتی ہے.....“ دعا نے کہا۔

”ہاں! لیکن دیکھنا ابھی یہ فلم، یہ موٹر سائیکل اشارت ہو رہی ہے، ہیرو نے ہارن بجا کر ہیروئن کو اشارہ

کیا..... وہ پیار سے ہیرو کی کمر میں بازو ڈال کر بیٹھ گئی اور.....“

”اور آنکھ کھل گئی.....“ دعا نے ہنس کر مذاق اڑایا اور اندر چلی گئی..... نیناں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”اے ہنسو نہیں، آؤ بیٹھو شبنم.....“ اس نے نیناں سے کہا تو وہ پیچھے بیٹھ گئی..... موٹر سائیکل گیٹ سے

نکلے..... سڑک پر پہنچی تو اس نے زور سے چلا کر کہا..... اور گنگناٹا۔

”اے اب وہ گانا بھی گاؤ، وعدہ کرو سا جتنا چھو کے مجھے تم ابھی، جیون کی ان راہوں میں، اے ہے اے ہے.....“

”اللہ بس چپ ہو جائیں.....“ نیناں نے قریب سے گزرنے والوں کو دیکھ کر پریشانی سے کہا۔

”خاموش! ذرا قریب ہو کر بیٹھو بالکل شبنم کی طرح، یا ر! تم بالکل ان رومینٹک لڑکی ہو.....“ وہ گردن موڑ

کر بولا۔

”پلیز! آپ ٹھیک سے موٹر سائیکل چلائیں.....“ وہ موٹر سائیکل لہرا رہا تھا جس کی وجہ سے وہ پریشان ہو

کر ڈری ڈری سی اس کی شرٹ پکڑنے پر مجبور ہو گئی۔

”چلو، بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی.....“ کمر کی جگہ شرٹ پکڑنے پر ہی اس کو اکتفا کرنا پڑا..... وہ تو پہلی

بار موٹر سائیکل پر بیٹھی تھی اس لیے کافی خوف زدہ سی تھی..... وہ انجوائے کر رہا تھا، جان بوجھ کر ڈر رہا تھا، اے

قریب کرنے کی مستی سی طاری تھی..... نیناں باقاعدہ رونے والی ہو گئی۔
 ”رمان! پلیز میں گر جاؤں گی۔“
 ”تو میں اٹھا لوں گا۔“

”اوہ گاڈ! وہ طلال بھائی تھے.....“ ایک دم ہی وہ چلائی تو اس نے جھٹکے سے موٹر سائیکل روک دی۔
 ”تو، سڑک ہے، یہاں کوئی بھی کہیں آ جا سکتا ہے، سارا موڈ کر کر کر دیا۔“ مصنوعی حلقی سے وہ منہ پھلا کر بولا۔

”آپ کو اپنی فکر ہے بس.....“ وہ زور سے چیخی..... رمان نے غصہ انجوائے کیا۔

”ایسے، ایسے بہت اچھی لگتی ہو۔“ وہ شوخی سے کہہ کر دوبارہ موٹر سائیکل چلانے لگا..... چارونا چاروہ چپ رہی..... کچھ دور پہنچ کر جونہی مدیحہ کے گھر کی گلی نظر آئی تو اس کا دل چاہنے لگا کہ موٹر سائیکل کہیں نہ رکے بس چلتی رہے، چلتی رہے..... کچھ دیر پہلے اسے رمان فلمی ہیرو جیسی چھوڑی حرکت کرنے والا لگ رہا تھا لیکن اب جانے کیوں بہت اچھا سا لگ رہا تھا..... اس کے دائیں بازو نے خود بخود پھیل کر اس کی کمر کو تھام لیا تھا..... وہ اس تبدیلی پر ہولے سے مسکرایا۔

☆☆☆

”میں اپنے دل کو کیسے روک کر رکھوں، یہ میرے بس میں نہیں ہے، یہ میرا کہنا نہیں مانتا.....“ بستر پر تڑپ کر اشک بہاتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔

یہ بات سچ ہے کہ دل محبوب کے حسن و جمال سے اس قدر متاثر ہو جائے کہ محبت کے میدان میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا، انسان اسے بار بار سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ باز آ جاؤ، محبوب بد عہد بھی ہے، بد خو بھی ہے، اس کا طرز عمل انتہائی ظالمانہ ہے، ایک بار اگر تم نے محبت کی دنیا میں قدم رکھ لیا تو پھر تجھے محبوب کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑے گا۔ تیرے لیے زندگی دو بھر ہو جائے گی، معمول کی بات غیر معمولی ہو جائے گی مگر کہتے ہیں ناکہ دل پر اختیار نہیں ہوتا..... دعا کو بھی دل پر اختیار کا حق حاصل نہیں تھا..... اس کی بے قراری کو قہر نہیں تھا، اس کا محبوب بے نیاز رہ کر اپنے محبوب کے پہلو میں سمٹ سمٹ کر دل جلا رہا تھا..... اس کی تمام تر بے نیازی اور لالچلی کے باوجود اسے بھولنے اور چھوڑنے پر دل آمادہ نہیں تھا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد سے وہ بستر پر بڑی اشک بہا رہی تھی..... اسے کسی سے گلہ شکوہ نہیں تھا، اپنی قسمت کو کوس رہی تھی..... رمان سے اس سرد مہری کی توقع اب تک نہیں ہوئی تھی۔

”میں نیناں سے کیا کہوں؟ رمان تم میری خوشیوں کے قاتل ہو، میرا دل تو تنہی نے ہاتھ میں لے کر مسل دیا، تم نیناں کی چاہت میں مجھے اور میری چاہت کو بھلا کیوں کر سمجھو گے؟“ روتے روتے اشکوں کے سیلاب نے تکیہ بھگو دیا۔ طاہرہ کسی کام سے اس کے کمرے میں آئیں تو بے چین ہو کر اس پر جھک گئیں۔

”دعا! وہ انسان جو تنہائیوں میں اپنے گناہوں پر روتا ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت ان آنسوؤں کو موتی سمجھ کر چنتی ہے، ایسے آنسو فطرت کا انمول تحفہ ہوتے ہیں..... انسانوں کے لیے انہیں ضائع نہیں کرتے۔“ وہ ماں سے لپٹ گئی۔

”میری بیٹی! اس میں رمان کا بھی کوئی قصور نہیں، نہ ہی عارفہ بھابی کی خطا ہے، بس کچھ معاملات میں انسان بے اختیار ہوتا ہے۔“ طاہرہ کی ممتا قطرہ قطرہ آنکھوں کے رستے اس کے چہرے پر برسے گی۔ دعا ممتا کے احساس سے پر سکون سی ہو گئی تو طاہرہ نے اس کی بھیگی پلکیں صاف کیں، بے ترتیب بال سنوارے۔

”رمان کو نیناں کے لیے چھوڑ دو، اپنا من صاف کر لو۔“ وہ بولیں۔
 ”نیناں بہت خوب صورت اور امیر ہے اس لیے رمان کو پسند ہے۔“ دعا نے تاسف سے کہا۔
 ”یہ وجہ اتنی یقینی بھی نہیں۔“
 ”میرا رمان پر زیادہ حق ہے۔“

”حق نہ مانگتے ہیں، نہ چھینتے ہیں، اٹھو منہ دھو کر باہر آؤ۔“ وہ ٹال کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔
 ”آپ جائیں، مشورے کا شکریہ.....“ اس کے دل نے صاف مسترد کر دیا۔

”میں نے گوشت پکھنے کے لیے رکھا ہے خیال سے بھونٹا، میں عارفہ بھابی کے پاس جا رہی ہوں، رابعہ آئی ہوئی ہیں.....“ وہ یہ کہہ کر چلی گئیں، تو اسے اٹھنا پڑا..... منہ پر پانی کے چھینٹے مار کے سیدھے کچن میں آ گئی..... اس کے علاوہ اور کچھ بھی کیا سکتی تھی، وہ ستم گر، دشمن جاں جس کے لیے وہ مایہ بے آب کے مانند تڑپ رہی تھی وہ تو اپنی محبوب ہستی کے ساتھ باہر تھا، اس کی ہر تڑپ سے بے نیاز..... پریشگر کی سیٹی پوری قوت سے بج رہی تھی، مسالا لگنے کی سی مہک بھی آ رہی تھی وہ تیزی سے چولہا بند کر کے وہیٹ اٹھا کر تیزی سے نکلتی بھاپ کو دیکھنے لگی۔

☆☆☆

رمان اسے مدیحہ کے گھر چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے چلا گیا تھا۔ اسے تسلی تھی کیونکہ وہ قریب کی مارکیٹ میں وزٹ کرنے گیا تھا..... جس کا تعلق اس کی ملازمت سے تھا۔ مدیحہ اس کے آنے پر بہت خوش تھی اسے ملوا کر سیدھی آپا کے پاس لے آئی تھی..... آپا نے اس کو گہری جامدی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور پھر ایک ٹک دیکھتی ہی رہیں..... نیناں کو کچھ عجیب سا لگا۔

”آپا! اٹھ کر بیٹھیں، باتیں کریں.....“ مدیحہ نے آپا سے کہا۔

”یہ بیمار ہیں۔“ نیناں نے پوچھا تو آپا نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”نہیں، بس کبھی کبھی بہت چپ ہو جاتی ہیں.....“ مدیحہ نے ہلکے سے کہا اور آپا کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگا لیا۔

”مدیحہ! آپا کے بچے وغیرہ.....“ وہ جھجک کر رک گئی۔

”آؤ باہر چلتے ہیں، اماں نے کھانا بنا لیا ہوگا.....“ مدیحہ نے ایک دم کہا تو آپا جلدی سے بولیں۔

”یہ میری بیٹی ہے اور زلفی میرا بیٹا ہے.....“ ان کے لہجے میں اچھی خاصی تلخی تھی..... نیناں کچھ جھل سی ہو گئی۔

”میرا مطلب تھا.....“

”چھوڑو اپنا مطلب۔“ وہ منہ موڑ کر ریٹ گئیں۔

”نیناں! آؤ باہر آؤ۔“ مدیحہ نے اس کا بازو پکڑا اور باہر نکل آئی۔ صحن میں اماں نے انہیں دیکھ کر کرسیاں چھاؤں میں رکھ دیں۔

”تم نے آخری پیپر کیوں نہیں دیا.....؟“ نیناں کو یاد آیا۔

”ہاں! یہ پوچھو اس سے۔“ اکبری بیگم نے نیناں کی بات سن کر کہا۔

”نیناں! آپا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔“

”ایسی طبیعت.....“

”ہاں! یہ طبیعت خاصی خراب ہوتی ہے، انہیں میں ہی سنبھالتی ہوں۔“ مدیحہ نے دھیرے دھیرے بتایا۔

”ارے بیٹا! پرانے زخم ہیں جو جب کھلتے ہیں ہرے ہی نظر آتے ہیں۔“ اکبری بیگم وہیں آ بیٹھیں۔

”آپا کے ساتھ کوئی حادثہ وغیرہ.....؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تو مدیحہ کی اپنی حالت متغیر ہو گئی.....

چہرہ تہمتا اٹھا۔

”ہاں! آپا کو ایک شخص نے اس حال کو پہنچایا ہے۔“

”کسی انسان کے من میں کیا ہے یہ کسے پتا، آپا کا شوہر بھی فریبی تھا۔“ اکبری بیگم نے کہا۔

”اوہ! کتنے برے لوگ ہوتے ہیں؟“ نیناں کے منہ سے درد بھری آہ نکلی۔

”دولت کی چمک اندھا کر دیتی ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ وہ کبھی لوٹ کر آئیں تو میں گولی مار دوں.....“

مدیحہ نے دانت کچکچائے۔

”چھوڑو، اب تک جانے کہاں ہوگا، شاید مر کھپ گیا ہوگا۔“ اکبری بیگم نے اسے مخاطب کیا۔

”بڑا افسوس ہوا۔“ نیناں دکھی ہو گئی۔

”ساری عمر آپا نے اسی دلہیز پر گزار دی، مدیحہ میں اُن کی جان ہے۔“ اکبری بیگم نے کہا۔

”میں سمجھ سکتی ہوں۔“ نیناں نے تائید کی۔

”وہ کردار میں نے اسی لیے نہیں کیا تھا۔“ مدیحہ نے یاد دلایا۔

”کردار تو فرضی ہوتے ہیں۔“

”حقیقت سے فرضی بنتے ہیں، میں آپا کی نقل نہیں اتار سکتی تھی.....“ مدیحہ نے چبا چبا کر خود کو تسکین دی۔

اسی اثنا میں موٹر بائیک کی آواز آئی اور زلفی دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

”اُخا! راجا صاحب کی پوتی اور راجا ریحان اختر کی صاحبزادی تشریف لائی ہیں۔“ زلفی نے خاصی

ترنگ میں آ کر کہا تو نیناں کے ساتھ ساتھ اکبری بیگم اور مدیحہ نے کچھ سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”آپ.....“ نیناں فقط اتنا ہی کہہ پائی۔

”جی میں اور یہ ہمارا غریب خانہ، آپا سے ملوایا انہیں؟“ زلفی بڑی موج میں تھا۔

”جی ملی ہوں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”یہ کیا ہے زلفی.....؟“ اکبری بیگم نے ایک سفید چھوٹا سا شاپرا اس کے ہاتھ میں دیکھ کر پوچھا۔

”یہ پاؤ بھر بکرا ہے۔“ اس نے مزاح پیدا کیا۔

”بھائی!“ مدیحہ نے نیناں کے سامنے ایسا بولنے پر کچھ شرمندگی ہی محسوس کی۔

”ارے، ان سے کیا چھپانا، انہیں پتا ہونا چاہیے کہ غریب کیسے جیتے ہیں۔“ وہ اٹھ کر واپس جانے لگا تو

مدیحہ نے پوچھا۔

”بھائی جا رہے ہو؟“

”ہاں! بس یہ گوشت دینے آیا تھا.....“ وہ یہ بتا کر باہر نکل گیا۔ نیناں نے اپنے پرس سے موبائل نکالا اور

رمان کے نمبر پر تیل دی۔

”ابھی نہیں جانا، کھانا کھا کر جانا.....“ مدیحہ نے اس کا ارادہ بھانپ کر کہا۔

”نہیں پھر سہی، بڑی خالہ انتظار کر رہی ہوں گی اور رمان کو بھی جلدی ہے۔“

”کیا، کیا رمان؟.....“ مدیحہ نے آنکھ دبائی تو وہ شرمائی۔

”جی رمان۔“

”اوکے، اوکے.....“ مدیحہ نے کہا۔

رمان نے موٹر سائیکل کا ہارن دیا تو وہ فوراً اجازت لے کر اٹھ کھڑی ہوئی..... اس کے اصرار پر مدیحہ

دروازے تک چھوڑنے آئی..... جونہی وہ چلی گئی تو آپا کی آواز آئی، وہ برآمدے میں کھڑی تھیں، وہ خوش ہو گئی

کہ آپا اپنے خاموشی کے فیر سے باہر نکل آئیں۔

”اس لڑکی میں کیا خوبی ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”میری فرینڈ ہے آپا۔“

”راجا گھر آنے کی فرینڈ، بہت مہنگی پڑتی ہے..... بچو اس سے.....“ وہ کافی گھور کر بولیں اور واپس اپنے

کمرے میں چلی گئیں۔

”اماں، یہ آپا کیا بول گئیں؟“ وہ حیرت زدہ سی ہانڈی پکاتی اماں سے بولی۔

”بس بہتر یہی ہے کہ نیناں سے ملنا ترک کر دو، آپا کی یادداشت اچھی ہے۔“ اکبری بیگم نے بھی نندگی

بات کی گہرائی جانچ لی تھی..... مدیحہ کچھ سمجھ اور کچھ نا سمجھی کے درمیان چکر کھانے لگی۔

☆☆☆

بھر پور دن گزار کے وہ سیدھی گھر پہنچیں۔ گپ شپ میں، رمان اور نیناں کی نوک جھوک میں بہت اچھا

وقت گزارا، رابعہ قہقہے لگاتی رہیں..... شام ہو رہی تھی جب وہ گھر پہنچیں۔

فیضو رات کے کھانے کی تیاری سے پہلے بوا سے مشورہ لیتا تھا..... بوا اس کے ساتھ مصروف تھیں، تبھی

چوکیدار نے انٹرکام پر ذوالفقار کے آنے کی اطلاع دی تو انہیں یاد آیا کہ گولیاں کتنی تھیں، یقیناً وہ انتظار کر کے

دینے آیا ہے۔

”اندر بھیج دو.....“ انہوں نے کہا اور خود جلدی سے باہر نکلیں ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور لائٹس آن

کیں..... ملازم اسے ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچا گیا۔

”ہوں.....“ اس نے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے گلا صاف کیا۔

”آئیں۔“ انہوں نے اخلاقاً کہا۔

”یہ آپ کے لیے۔“ اس نے خوب صورت پھولوں کا گلہستان کی طرف بڑھایا۔

”شکریہ مگر اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟“ انہوں نے گلہستان لے کر سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

”دوستوں میں اور تکلف، بات کچھ جی نہیں.....“ وہ خاصی بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”اوہ، ہاں، وہ۔ وہ ہکلائیں اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”آپ نے تو خود آنا تھا۔“

”ہاں..... لیکن میں بھول گئی۔“

”آپ بھولی نہیں بلکہ آپ کو ان گولیوں کی ضرورت نہیں رہی۔“

”شاید، میں نے بہت اچھا دن گزارا ہے۔“ وہ روانی میں بول گئیں۔

”گڈ! اسی لیے میں گولیوں کی جگہ پھول لایا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”بہت شکریہ، آپ کیا لیں گے چائے، ٹھنڈا۔“ وہ سادگی سے بولیں۔

”کچھ نہیں، یہ ادھار پھر کسی وقت اتار دیں گے، باہر کہیں۔“ وہ بڑی بے باکی سے کہہ گیا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“

”اجازت۔“ وہ بھی اٹھ گئیں۔

”یہ پھول آج سرہانے رکھیے گا، نیند ایسی آئے گی کہ آپ فریش ہو جائیں گی۔“ وہ ہلکا سا جھک کر دوثق سے بولا اور باہر نکل گیا۔ وہ کافی دیر وہیں کھڑی کچھ سوچتی رہیں پھر پھول اٹھا کر اپنے کمرے میں آ گئیں.....

دادی کا حال احوال فون پر پوچھا..... ریحان اختر آگے اپنا بریف کیس رکھتے ہوئے پہلی نظر تازہ پھولوں پر پڑی تو ضبط نہ کر سکے، ایک آنکھ کی ابرو چڑھا کر بولے۔

”خوشگوار تبدیلی لانے والے کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“

”نہیں، صرف یہ پوچھیں کہ کھانا تیار ہے، چائے مل سکتی ہے۔“ انہوں نے نرمی سے جواب دے کر نظریں چھت پر مرکوز کر لیں۔

”یہ میرا گھر ہے، ہوٹل نہیں۔“

”گھروں میں بیویوں سے یہی سوال کیے جاتے ہیں۔“

”رابعہ! میں نے صرف پھول لانے والے کا نام پوچھا ہے۔“

”لیکن کیوں.....؟“

”تا کہ میری بدگمانی دور ہو جائے۔“

”معاف کرنا ریحان! آپ کے اور میرے درمیان اب یہ حق باقی نہیں رہا۔“

”تو میں سمجھ لوں کہ تم اب کسی اور پر حق استعمال کر رہی ہو۔“ وہ بازوؤں کو تکیہ بنا کر آڑے تر جیسے بیڈ پر دراز ہو گئے۔

”فی الحال تو نہیں۔“

”چلو اپنی اصلیت دکھاؤ۔“

”اصلیت دیکھنے دکھانے کی اب کوئی خواہش نہیں رہی، یہ تو محبت کے اختیار رات تھے اور وہ آپ نے مجھ سے کی نہیں.....“ وہ مسکرا کر انتہائی نرمی سے بولیں۔

”تو اس کا مطلب ہے اب تم محبت کرنے والا یہاں بلاتی ہو۔“

”بات کو طول مت دیں۔“ وہ یہ کہہ کر روٹ لے کر سوتی بن گئی۔

وہ اندر ہی اندر سلگتے رہے اور پھر ہاتھ بڑھا کر پھولوں کو اٹھا کر ڈسٹ بن کی طرف پھینکا، نشانہ خطا ہو گیا

گلہستان ڈسٹ بن سے ٹکرا کر باہر ہی پھیر گیا..... تب ان کے دل کو تسکین ملی..... جانے کیوں وہ بھول گئے کہ یہ

رستہ ان کا اپنا دکھایا ہوا ہے..... وہ یہ سچ بول چکے ہیں کہ انہوں نے رابعہ سے کبھی محبت نہیں کی، اپنی بیٹی کی ماں

سمجھ کر مقام دیا..... بس یہ سچ ہی کافی تھا رابعہ کی زندگی کو بدلنے کے لیے۔

☆☆☆

تین روز سے اس کی کمپنی کے آڈٹ کی شدید مصروفیت تھی، وہ چونکہ ریجنل مینیجر تھا، براؤنچ آفس کی ساری

ذمے داری اس پر تھی..... آڈٹرا اپنے کام میں مجھوتھے مگر اس کی موجودگی آفس میں ضروری تھی..... نہ کھانے کی

فرصت تھی نہ گھر جانے کی..... عارفہ فون کرتی رہتیں مگر وہ معذرت کر لیتا..... عارفہ کو ماں ہونے کے ناتے

بہت فکر تھی، خاص کر کھانے کے حوالے سے کہ باہر کا کھانا کھانے سے وہ بیمار ہو جاتا ہے، اس لیے کھانا فٹن میں

بند کر کے اسے منگوانے کے لیے فون پر کہا تو وہ برس پڑا۔

”امی! سمجھا کریں، میں مصروف ہوں، فرصت ملے گی تو کھالوں گا۔“

”کیا کھالو گے؟ بازار کا گند بلا.....“ انہیں بھی غصہ آ گیا۔

”جو سب عملہ کھائے گا وہی میں بھی کھالوں گا، یہاں کوئی فارغ نہیں فی الحال۔“ اس نے دوسرا فون نبھنے

پر موبائل آن کر دیا۔

”ہیلو.....“

”جی..... جی۔“ وہ کچھ شناخت نہ کر سکا۔

”رمان! ریحان اخترا بات کر رہا ہوں۔“

”اوہ! سوری پہچان نہیں پایا.....“ وہ شرمندہ ہو گیا۔

”کوئی بات نہیں، پہچان کے لیے ہی رابطہ کیا ہے.....“ وہ بولے۔

”جی، خیریت تو ہے نا.....؟“

”ہاں! ہاں! رابعہ نے میرا پیغام تو نہیں دیا ہوگا۔“

”نہیں، میں دراصل آڈٹ ٹیم کے ساتھ مصروف ہوں۔“

”او کے! چلو جب فارغ ہو تو میرے آفس آؤ۔“

”خیریت.....؟“

”خیریت کے بغیر ہی ملنا چاہیے؟“
 ”میرا مطلب ہے کوئی ضروری کام.....“
 ”بیشک گے، بات کریں گے۔“
 ”ٹھیک ہے۔“

”او کے اللہ حافظ.....“ انہوں نے کہہ کر فون بند کر دیا تو وہ پیپر ویٹ سے کھیلتے ہوئے سوچ بچار میں پڑ گیا، دل و سوسوں کا شکار سا ہو گیا..... ریحان اختر کے حسن سلوک کے مناظر دیکھنے کے باعث رابی حالہ کا ہی خیال آیا..... حد درجہ مصروفیت کے باوجود اس نے ان کا فون نمبر ملایا کافی دیر کے بعد فون اٹینڈ ہوا۔

”ہاں! جان.....“ رابعہ نے مخاطب کیا۔
 ”آپ ٹھیک تو ہیں.....“

”ہاں! لیکن ریحان کو آپ سے کیا کام ہے؟“
 ”ملوں گا تو بتا دیں گے، اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“
 ”دراصل! ریحان کی شاطرانہ سوچ ہے، نیناں کو آفس بلوایا تھا، میں نے منع کر دیا۔“
 ”آفس لیکن..... کیوں.....؟“

”طلال نے نہیں بتایا۔“
 ”چلیں کوئی وجہ ہوگی، آپ فکر مند نہ ہوں.....“ اس نے تسلی دی۔
 ”کب ملنے جاؤ گے.....؟“

”فی الحال تو بہت مصروف ہوں دیکھیں کب فرصت ملے گی۔“

”او کے!“ رابعہ نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا مگر سوچ کا ایک نیا زاویہ سامنے آ گیا کہ ریحان نے آخر مان کو آفس کیوں بلوایا ہے؟ کیا بات کرنی ہے؟ ریحان سے تو کسی بھی بات کی توقع کی جاسکتی تھی۔

”خیر..... کوئی بات نہیں دیکھا جائے گا۔“ انہوں نے کندھے جھٹک کر خود سے کہا اور وارڈ روب سے لباس کا انتخاب کرنے لگیں..... آرٹس کونسل میں پینٹنگ کی نمائش تھی انہوں نے اخبار میں پڑھ کر پروگرام بنا لیا۔ نیناں سے چلنے کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ لہذا کچھ دیر سوچنے کے بعد انہوں نے تنہا ہی جانے کا فیصلہ کیا۔ موبائل فون کی گھنٹی بجی تو الماری کھلی چھوڑ کر فون ریسیو کیا۔

”کیسی ہیں آپ.....؟“ اس ٹپکاتی آواز ذوالفقار کی تھی۔

”آپ! آپ کو میرا موبائل نمبر کہاں سے ملا.....؟“ رابعہ نے تعجب کا مظاہرہ کیا۔

”آپ کا نمبر ملنا مشکل کام ہے کیا.....؟“ شگفتگی سے پوچھا گیا۔

”نہیں، دراصل میں نے خود آپ کو دیا نہیں.....“ انہوں نے یاد دلایا۔

”آپ کے ہز بینڈ سے لیا ہے۔“ بڑی سادگی سے کہا گیا۔

”وہاٹ! آپ نے ریحان سے نمبر لیا۔“ اسے ذہنی کوفت ہوئی تو تقریباً چلا اٹھی۔
 ”ہاں! کیوں کوئی غلط بات ہو گئی؟“

”چھوڑیں، کیسے زحمت کی.....؟“ وہ ٹال گئیں۔
 ”بس دل چاہا آپ کی خیریت معلوم کروں۔“
 ”شکریہ! میں نے تو خیریت سے رہنا سیکھ لیا ہے۔“
 ”یوں کہیے کہ آپ کو زندہ رہنا آ گیا ہے۔“
 ”شاید۔“

”آپ مصروف تو نہیں تھیں؟“

”مصروف ہونے جا رہی ہوں، مطلب مجھے باہر جانا ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”کہاں؟“ بے تکلفی سے پوچھا گیا۔

”بس آرٹس کونسل تک۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں کہنا پڑا۔

”اچھا! کاش میں بھی آپ کے ساتھ چلتا۔“

”آپ وہاں خود بھی جاسکتے ہیں۔“

”ہاں! لیکن.....“ وہ رک گیا۔

”کچھ مسئلہ ہے کیا.....؟“

”چھوڑیں، آپ تیار ہوں اور جائیں۔“

”او کے! ٹھیکس فار کالنگ.....“ انہوں نے اخلافا کہا اور فون بند کر دیا مگر فون کو دیکھتے ہوئے ریحان کے نمبر بتانے کی وجہ سے خاصی الجھن سی ہوئی حیرت کی بات تھی کہ ریحان نے اسے موبائل نمبر دے دیا۔
 ”کیوں؟“ اس سوچ میں کافی وقت گزر گیا، پھر ذہن سے نکال کر جلدی سے تیار ہونے لگیں۔

☆☆☆

تھکے نقوش والی دیہاتی لڑکی کنویں کی گہرائی میں جھانک کر جانے کیا اندازہ لگا رہی تھی، لمبی سی چٹیا بل کھا کر سامنے جھول رہی تھی، ڈوبتے سورج کی شگرتی کرنوں کے عکس سے نازک جسم پر پڑے کُرتے کی باریکی چھن چھن کر اس کے گندی رنگ کو ظاہر کر رہی تھی..... پس منظر میں سرسبز کھیت اور دور گھنے درخت تھے..... مجموعی طور پر تصویر نے انہیں کچھ دیر رکھنے اور دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

”بیوٹی فل!“ انہوں نے اپنے آپ سے بات کی..... مگر جواب پشت سے آیا۔

”کون تم یا تصویر.....؟“ وہ چونک کر پلٹیں..... تو متحیر رہ گئیں۔

”سبحان تم!“ ان کے لہجے میں آج حیرت بھری خوشی شامل تھی..... یہ چیز سبحان کے لیے تعجب انگیز تھی۔

”کسی اور کا انتظار تھا؟“ سبحان نے شوخی سے پوچھا۔

”نہیں تو لیکن تم کو دیکھ کر اچھا لگا۔“ وہ مسکرا کر بولیں۔ دونوں ایک ساتھ چلتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ سے ذرا دور نسبتاً کم بھیڑ والی جگہ پر آ گئے۔

”شکریہ! پورہ ہوا تھا سو آ گیا، تمہیں بتا ہے کہ مجھے مصوری سے دلچسپی ہے۔“

”اچھا کیا.....“

”لیکن تمہیں یہاں دیکھنا اور بھی اچھا لگا۔“ انہوں نے سر تاپا ان کا جائزہ لیا، وہ آج کافی حد تک پرانی والی رابعہ لگ رہی تھیں..... کپڑوں کے ہم رنگ جوتے اور پرس کے ساتھ، خوب صورت میک اپ میں بالکل وہی رابعہ جو یونیورسٹی میں ہر دل کی دھڑکن تھی لڑکیاں جس کے کپڑوں کی تراش خراش اور جدت کی نقالی کرتی تھیں، لڑکے اس کے ویل ڈریس ہونے پر فدا رہتے تھے..... خود سبحان کو عادت تھی کہ اس کے لباس اور میچنگ کی جی بھر کے تعریف کرتے تھے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو.....؟“

”رابعہ کی واپسی دیکھ رہا ہوں۔“

”ہوں! ٹھیک کہا تم نے میں نے سراب سے باہر نکل کر جینا ہے۔“ انہوں نے اعتراف کیا۔

”باہر چلیں، چائے پیتے ہیں؟“ سبحان نے لوگوں کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

”پہلے تصویریں تو دیکھ لو۔“

”تصویریں ہی تو دیکھ رہا ہوں.....“ سبحان بہت مدہم مگر شوخ لہجے میں بولے تو وہ ہنس دیں..... زندگی

سے بھر پور ہنسی..... اور باہر کے لیے ساتھ چل دیں..... چند قدم کے فاصلے پر کینٹین تھی..... سبحان نے دو کپ

چائے کا آرڈر کیا اور کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے..... رابعہ نے ایک طویل پرسکون سانس بھری۔

”سبحان! تم سچ کہتے تھے، سبحان کو مجھ سے محبت نہیں تھی.....“ وہ ایک دم بولیں۔

”کیا.....؟ کیا کہا.....؟“

”رابعان نے صرف تم سے دور رکھنے کے لیے جھوٹ بولا یا کچھ اور تھا، بس محبت نہیں تھی۔“ یکتخت

احساس تو ہیں سے ان کا چہرہ تہمتا اٹھا۔

”وہاٹ، جھوٹ کیسا جھوٹ اور تم نے تو اس سے محبت کی۔“ برقی رو مسلسل سبحان کے اندر سے گزر رہی تھی۔

”ہاں، میں نے کی تھی، اسی لیے تو اس حال کو پہنچ گئی تھی، اب سکون ہے، شانتی ہے، سبحان نے

اعتراف کر لیا ہے کہ میں ان کی محبت کبھی نہیں تھی.....“ چند یونیدی نمکین ان کی آنکھوں کے کونے بھگو گئیں۔

کینٹین والے لڑکے نے چائے کے کپ میز پر رکھے تو وہ ذرا دیر کو کپوں سے اٹھتی بھاپ دیکھنے لگیں۔

”تو پھر.....؟“

”تو سارا جھگڑا ہی اس کم بخت محبت کا تھا۔ اب جس گلی جانا نہیں اس کے راستے کی فکر کیا کرنی.....؟“

رابعان غیر اہم ہو گئے ہیں، میں نے وہ صدمہ، افسوس سب اپنی ذات سے الگ کر دیے ہیں۔“ وہ بولتی گئیں۔

”مطلب سبحان کسی اور سے؟“

”جنہم میں جائے وہ اور..... مائی فٹ اب مجھے کوئی غم ہی نہیں رہا.....“ وہ خاصی مضبوط آواز میں کہہ کر

چائے پینے لگیں۔

”محبت میں مقام بدل گئے، یہ کیا بات ہوئی.....؟“

”بس کچھ بھی سمجھ لو، میں صرف نیناں کی ماں اور سبحان کی بیوی ہوں۔“

”یہ چھوٹی بات تو نہیں رابعہ.....“

”ہوں مگر کیا کریں وہ کہہ چکا ہے کہ میں اس کی محبت نہیں، اب اور محبت کریں گے۔“ وہ مسکرا کر استہزاء سے انداز میں بولیں۔

سبحان چپ چاپ انہیں دیکھتے رہے..... کچھ دیر بعد ان کا موبائل فون بجا..... نمبر دیکھ کر پہلے انہوں نے کچھ سوچا اور پھر فون ساکنٹ کر دیا۔

”کس کا فون تھا.....؟“

”شاید ایک دوست کا۔“

”شاید ایک دوست.....“ وہ بڑبڑائے۔

”فی الحال.....“ ذو معنی جواب دیا گیا۔

”او کے! چلیں دیر ہو رہی ہے۔“ سبحان نے رسٹ واپج پر نگاہ ڈالی۔

”ہاں! چلو۔“

”امید رکھوں کہ میری دوست مجھے وقت دیتی رہے گی۔“ سبحان نے جھک کر پوچھا۔

”ہوں، ہاں۔“ رابعہ نے اثبات میں جواب دیا چلتے ہوئے سبحان کے دل میں ایک جذبے نے سراٹھایا۔

”اگر پھر سے محبت کرنی پڑے تو.....؟“

”تو تم پھر بھی اچھے دوست ہی رہو گے.....“ اس نے ادھورا جملہ اچک کر مکمل سا جواب دیا، سبحان بچھ

سے گئے..... مگر پھر فوراً ہی نارمل ہو گئے..... یہ حقیقت تو پہلے ہی تسلیم کر لی تھی۔

”جوان بیٹی کی ماں محبت کرے گی کیا.....؟“

”محبت ہوتے دیر نہیں لگتی جناب.....“ اس کے مذاق پر انہوں نے وثوق کی مہر ثبت کی۔

☆☆☆

کئی روز سے جو موضوع زیر بحث تھا اس پر آج مدیحہ نے اس وقت واویلا کیا جب رشتے کرانے والی کو

اکبری بیگم رخصت کر کے اندر آئیں۔

”یہ ڈراما ماں اب بند کر دیں، میں نے کہہ دیا ہے کہ آگے پڑھنا ہے۔“

”تو ہاں اسے کوئی جاگیر نام لکھوا لیتیں.....“ اکبری بیگم بھڑک اٹھیں۔

”مجھے کچھ نہیں سننا، یہ شادی واوی کا پروگرام نہیں ہے میرا.....“ وہ ہاتھ نچا کر بولی تو آپا کو مداحلت کرنی

پڑی۔

”مدیحہ! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

”آپا! میں نے یونیورسٹی جانا ہے، یہ شادی کریں بھائی کی۔“

”لڑکی اور غریب لڑکی، جانتی ہو کوئی بات کر کے خوش نہیں ہوتا وہ تو پھر معقول رشتہ ہے۔“

”ہونہہ! معقول رشتہ.....“ اس نے طنز یہ کہا۔

”اکبری! پڑھ لینے دوا سے، شادی کی عمر کون سی نکلی جا رہی ہے۔“ آپا کا دل اس کے لیے پھڑپھڑایا۔

”آپا! اتنا خرچہ کہاں سے آئے گا؟ ایک کمانے والا ہے، سنا نہیں ظہورہ کیا کہہ رہی تھی حمیدہ کو کہ انہیں کہو

اس محلے سے باہر نکلیں۔“ اکبری نے رشتہ کرانے والی حمیدہ اور اس کی ساتھی ظہورہ کا تذکرہ کیا۔

”کہتی تو وہ ٹھیک ہے، یہاں کون آئے گا؟“ آپا نے تائید کی۔

”پھر خود سوچو، گھریلیں، یونیورسٹی پڑھوائیں کیا کریں، زلفی کی شادی کر دوں تو سکھ ملے۔“ اکبری بیگم کے اندر سے الجھنوں نے سراٹھایا۔

”زلفی کے لیے کوئی رشتہ بتایا انہوں نے؟“

”ہاں! کہہ رہی تھی اچھی لڑکی ہے اگر بات بن جائے مگر اس محلے اور گھر میں نہیں۔“

”چلو، گھر بیچ کر باہر لے لیتے ہیں لیکن مدیحہ کو ابھی پڑھنے دو، میرے پاس سونے کے کڑے ہیں، وہ اس کی تعلیم پر خرچ کر دیتے ہیں۔“

”نہیں آپا! وہ آپ کی شادی کے ہیں۔“ مدیحہ تڑپ اٹھی۔

”جب شادی نہیں رہی تو کڑوں کا کیا کرنا۔“

”پھر بھی آپا، وہ آپ کے ہیں۔“ اکبری بیگم نے نند کا ہاتھ محبت سے دباتے ہوئے کہا۔

”اماں! ٹھیک کہہ رہی ہیں، میں پرائیوٹ پڑھ لوں گی۔“ مدیحہ نے فیصلہ بدل لیا۔

”نہیں، تم وہی کرو گی جو میں نے کہا ہے، زلفی سے کہو کہ فارم وغیرہ لائے۔“ آپا نے اس کا فیصلہ مسترد کر دیا۔

”اگر قسمت نے اچھا فیصلہ کر دیا تو۔۔۔۔۔“ اکبری بیگم نے کہا۔

”قسمت اچھی ہوئی تو ایسا ہوتا ہی کیوں۔۔۔۔۔؟“ آپا نے تاسف بھری سانس بھری۔

”آپا! میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کا خون پی جاؤں۔۔۔۔۔“ مدیحہ کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

”گندے خون کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔“ آپا نے کہا اور کمرے میں چلی گئیں۔

”آپا سے ایسی باتیں مت کیا کرو۔“ اکبری بیگم نے کہا اور اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چل دیں۔

”اماں! زلفی بھائی کی شادی کر دیں، بہت مزہ آئے گا۔۔۔۔۔“ وہ پیچھے چلی آئی۔

”وہ بھی جانے کن ہواؤں میں ہے، پورے پانچ سو روپے دیے ہیں حمیدہ کو مگر اس نے میری بات سن کر ہوا میں اڑا دی۔۔۔۔۔“ اماں نے چوٹا جلاتے ہوئے کہا۔

”بہر حال بھائی کو تو راضی کر لیں سچ بہت مزہ آئے گا۔“ مدیحہ کی آنکھوں میں سوچ کر ہی قندیلیں روشن ہو گئیں۔

”اور پیسہ درختوں سے توڑیں گے۔“

”بھائی ہیں نا۔۔۔۔۔“

”وہ اکیلا کیا کیا کرے گا، گھر بیچ کر نئے گھر میں جانا کوئی آسان کام نہیں۔۔۔۔۔“

اکبری بیگم سلور کی دیبگی میں گھی اور سفید زیرہ ڈالتے ہوئے بولیں۔۔۔۔۔ مدیحہ کی طرف انہوں نے چھری اور آلو بڑھائے تاکہ وہ چھیل لے۔۔۔۔۔ مدیحہ تو آگے پڑھنے کے تصور میں کھوئی ہوئی تھی انہوں نے کندھا ہلایا تو وہ چونکی۔

☆☆☆

فانکوں سے سراٹھایا ہی تھا۔ چیر اسی افضل نے اندر آ کر کسی کے آنے کی اطلاع دی۔۔۔۔۔ بے دھیانی میں انہوں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔۔۔۔۔ افضل باہر گیا تو انہوں نے پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ مگر ایک

دم ہی ان کی پیشانی پر ہزار ہا سلوٹیں ابھرا آئیں۔

”یہاں آنے کی جرات بھی کیسے کی تم نے.....؟“ وہ چلا اٹھے۔

”آہستہ بولیں سرکار! یا ہر آپ کا عملہ کیا سوچے گا.....؟“ آنے والے نے خاصے تحمل سے اپنے پہلے زرد دانٹوں کی نمائش کی۔

”تمہیں دیکھ کر بھی وہ بہت کچھ سوچ رہے ہوں گے۔“ انہوں نے اس کے حلیے کی طرف اشارہ کیا تو وہ اور بھی ڈھٹائی سے مسکرایا۔

”سرکار! ہم تو ایسے ہی تھے اور ایسے ہی رہیں گے۔“

”یہاں اور گھر آنے کی ضرورت نہیں ہے سمجھے.....“ انہوں نے چیک بک سے ایک چیک پھاڑ کر بھرا اور

اس کی طرف پھینکا۔

”خدا کی قسم پہلی بار یہاں آیا ہوں مگر اچھا لگا کافی بڑا کاروبار ہے۔“ وہ چیک جھاڑ کر جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

”اب جاؤ یہاں سے، آئندہ گھر بھی نہیں آنا۔“

”ٹھیک ہے پھر خود ہی زحمت کر لیا کریں۔“

”جاؤ یہاں سے۔“

”عجیب بڑے لوگ ہوتے ہیں کوئی چائے پانی نہیں.....“

”جاؤ، غیرت کا گھونٹ پیو.....“ وہ خاصی نفرت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”ٹھیک ہے سرکار.....“ وہ اٹھ کر باہر نکل گیا..... تب انہوں نے غصے سے افضل کو ڈانٹا اور تاکید کی کہ

آئندہ اسے دفتر میں گھسنے نہیں دینا افضل گیا تو طلال آگیا..... اس نے شاید اسے دیکھ لیا تھا۔

”یہ کون ہے.....؟“

”کون.....؟“

”دلشاد.....“ طلال نے کہا تو انہیں زوردار جھوٹا لگا۔

”آپ کیسے جانتے ہو.....؟“

”یہ اس دن گھر بھی آیا تھا، تب اپنا نام بتایا تھا۔“

”اور کچھ پوچھا تو نہیں تھا.....“

”نہیں، میں جلدی میں تھا مگر یہ کون ہے.....؟“

”بس ضرورت مند ہے.....“ وہ مسکرائے گئے۔

”اچھا! اب انھیں کافی دیر ہو گئی ہے۔“ طلال نے کہا۔

”آپ جاؤ، مجھے یہ سب فائلیں دیکھنی ہیں۔“

”تمناں کا آفس سیٹ کرا دیا ہے۔“

”اوہ! مگر وہ تو یونیورسٹی میں ایڈمیشن چاہتی ہے۔“ انہوں نے سرسری سے لہجے میں کہا تو طلال کو اچھا نہیں لگا۔

”اور آپ اس کی یہ فرمائش پوری کریں گے۔“

”یہ فرمائش سے مطلب، نیناں کی تو میں نے کوئی بات کبھی نہیں مانی.....“ انہوں نے بالکل واضح جواب دے کر طلال کو خاصا مایوس کیا..... وہ تو رات دن اس کے خواب دیکھ رہا تھا، اسے حاصل کرنے کی تمنا ماہی ہے آب کے مانند تڑپا رہی تھی۔ اس کی محبت تو طلال کی زندگی کا ارمان تھی۔

”ماموں! نیناں کی اب شادی کریں اور بس.....“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تو ریحان اختر نے یکبارگی اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ توقف کے بعد بولے۔

”اس موضوع پر نیناں سے بات ابھی کی نہیں.....“

”نیناں سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے.....؟“

”اس کی ہر ضرورت میری اور میری ہر ضرورت نیناں کی ہی ہے، اب جاؤ۔“ وہ قدرے روکھے سے لہجے میں بولے..... طلال تجل سا ہو کر چل دیا لیکن ریحان اختر کے ذہن میں ایک نیا باب کھل گیا..... نیناں کی شادی..... وہ خاصے ڈسٹرب ہو کر اس نئے موضوع میں الجھ گئے۔

”نیناں کی شادی، میری نیناں کی شادی.....“ بے اختیار ہی اُن کے لبوں سے نکلا۔

☆☆☆

سر میں شدید درد ہو رہا تھا..... بوا اپنے کمرے میں تھیں، بہت عرصے سے وہ کچھ تھکی تھکی اور تڑھال سی رہنے لگی تھیں..... نیناں نے کمرے میں جھانک کر دیکھا پھر خود ہی چکن میں آ کر اپنے لیے ایک کپ چائے کا بنایا..... کمرے میں آ کر خیال آیا کہ سردرد کی گولی کھا لینی چاہیے، ڈرائیو میں ہاتھ ڈال کر گولی کی تلاش مقصود تھی مگر ہاتھ میں رمان کی تصویر آگئی نیوی بلو ہائی نیک میں مسکرائی آنکھوں اور پرتیم لبوں کے ساتھ وہ قابل دید لگ رہا تھا، گولی بھول کر وہ ایک ٹک تصویر دیکھتی رہی، دل میں جانے کیا ہونے لگا تھا، نظریں جم سی گئی تھیں، پہلی بار اس انداز میں دیکھتے ہوئے اسے دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی..... جانے کیوں لبوں پر شرارت کھیل گئی، تصویر کی پشت پر لکھا جملہ پڑھ کر تو آج خود بخود دہنسی آ گئی..... طبیعت پھلنے لگی کہ فون کر کے آج یہ اعتراف کر ہی لے کر تصویر کیسی ہے؟ بے اختیار ہی بھولا بسر انغم لبوں پر چل گیا۔

”جو بات تجھ میں ہے

تیری تصویر میں نہیں

تصویر میں نہیں“

چائے کا کپ اس کی عدم توجہی کی نذر ہو گیا..... دھڑکتے دل کے ساتھ فون نمبر ملایا..... دوسری طرف کئی روز کی شدید مصروفیت اور تھکن کے باعث وہ بے سدھ سو یا ہوا تھا..... فون کی مسلسل آنے والی آواز پر عارفہ نے دعا کو فون سننے کا اشارہ کر دیا..... وہ موبائل لے کر ڈریسنگ روم میں آ گئی۔

”ہیلو.....“ نیناں نے کہا۔

”ہیلو.....“ دعا اس کی آواز پر بولی۔

”کون.....؟“ میرا مطلب ہے رمان سے بات کرادیں.....“ نیناں کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ دعا ہی ہو سکتی ہے۔

”آپ کون.....؟“ دعائے دانستہ پوچھا۔

”میں نیناں بول رہی ہوں.....“ اس نے سادگی سے تعارف کرایا۔

”اوہ ارمان تو گھر پر نہیں ہیں.....“ اس نے جھوٹ بولا۔

”لیکن فون.....“ نیناں کو خاصی مایوسی ہوئی..... فون اس کا دعا کے پاس یہ سوال ذہن میں جا گا۔

”وہ فون میرے پاس رہ گیا، میرا مطلب ہے وہ گھر ہی بھول گیا ہے۔“ دعا کو مزید جھوٹ بولنا پڑا۔
نیناں نے افسردہ ہو کر فون بند کر دیا، یہی دعا کا مقصد تھا مگر ارمان نے کسمسا کر کروٹ لیتے ہوئے اس کا سایہ ڈرینک روم میں دیکھ لیا تو پوری کی پوری آنکھیں کھول لیں..... وہ باہر نکلی تو اس کو جاگتا دیکھ کر گھبرا گئی۔
”اگر بھول کر اس نے فون کر ہی لیا تھا تو تم نے رقیب کا اچھا خاصا کردار نبھایا۔“ ارمان نے کہا تو وہ فون اس کے پیڈ پر اچھال کر بولی۔

”تمہیں نیناں کے خواب آتے ہیں۔“

”خواب مجھے آتے ہیں اور دیکھتی تم ہو۔“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”کتنی بد تہذیبی کی بات ہے کہ تم نے جھوٹ بولا ہوگا۔“

”ہاں بولا ہے۔“

”تو میں تمہیں جھوٹی کے علاوہ کیا کہہ سکتا ہوں؟“ وہ فون کی ریسولٹ دیکھنے لگا۔
”مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم سونے کی ایکٹنگ کر رہے ہو۔“

”نہیں، میرے دل نے دھڑک کر مجھے بتا دیا تھا کہ تمہاری جان بہار کا فون ہے..... اب مجھے ملنے جانا پڑے گا۔“ وہ شوخی سے کہتا ہوا اٹھ کر تیار ہونے چل دیا۔ دعا کی آنکھیں بھر آئیں..... تو وہ داش روم کے دروازے سے پلٹ کر بولا۔

”ارے لمبی لڑکی، وہ دیکھو کتنا بڑا جالا چھت پر لگا ہے وہ ہی اتار دو۔“ اتنا غیر متوقع مذاق وہ بھی اس وقت..... وہ تکلا کر مارنے کو بھاگی تو اس نے داش روم میں گھس کر دروازہ بند کر لیا..... وہ دروازے پر گھونٹے کے برساتی رہی..... اور چلاتی رہی۔

”بلاؤ اپنی نیناں کو..... یہ لمبی لڑکی تمہاری نوکر نہیں ہے۔“

”ارے وہ تو محبوبہ ہے، جان ہے، پیار سے دیکھنے کے لیے ہے..... کام تو تمہیں کرنے ہیں۔“ اندر سے بھی چڑانے سے وہ باز نہیں آیا تو وہ بل کھاتے ہوئے باقاعدہ رونے لگی جبکہ وہ گنگنا نے لگا۔

”جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا

روکے زمانہ چاہے روکے خدائی، تم کو آنا پڑے گا

ہم کو آنا پڑے گا روکے چاہے دعا قاطمہ ہم کو آنا پڑے گا

وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر گانے لگا تھا..... وہ جل کر انکارہ بن گئی..... مگر وہ اسے ستا کر مزہ لیتا رہا۔

خان جی کی اگلی لاڈلی بیٹی ڈاکٹر مہ جیس کولاکھ خواہش اور فرمائش کے باوجود نہ ملازمت کی اجازت ملی اور نہ ذاتی کلینک اور اسپتال بنانے کی اجازت ملی۔ راجا صاحب متوسط طبقے کے بیرونگار نو جوان تھے۔ خان صاحب نے جانے کیا سوچ کر اگلی بیٹی ان سے بیاہ دی تجویزوں کے منہ کھول کے جھوٹے اور بگڑے گاڑی، خدمت کے لیے مہ جیس کی ہم عمر ملازمہ سکھاں بھی ساتھ میں رخصت کر دی۔ سکھاں کے والدین نے رقم لے کر بیٹی ساتھ ہی لے گئی۔ بیٹی کے ارماتوں کا ذرا خیال نہیں کیا۔ ڈاکٹر مہ جیس کو راجا صاحب نے میٹھی زبان سے رام کہا ان کی خواہش پر بنگلے کے وسیع کشادہ لان میں چھوٹا سا اسپتال نما کلینک بنادیا یوں مہ جیس کی خواہش کو راجا صاحب نے ناجائز کمائی کا ذریعہ بنادیا۔ دولت بڑھتی گئی مگر مہ جیس بستر سے لگ گئیں۔ دوسرے باپ کی دی ہوئی آزادی اور ناجائز دولت کی ریل جیل سے ماہ پورا آزاد ہوئی۔ بیٹا ریحان اختر بھی اپنی ڈگر پر چل پڑا۔ دوسرے گھر سے بھاگ کر شادی کی حادثے کا شکار ہوئی اپنا بیٹا لاوارث چھوڑا۔ پولیس نے بچہ راجا صاحب تک پہنچایا۔ جس کا نام طلال رکھا گیا۔ مہ جیس کے والدین اور سکھاں کے والدین اپنے آبائی علاقے میں خان جی کے سوتیلے بھائی کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ راجا صاحب اور ڈاکٹر مہ جیس کے انتقال کے بعد ریحان اختر نے بھانجے کی بہت لاڈ پیار سے پرورش کی مگر سقم رہ گئے۔ طلال ایک ضدی، ہٹ دھرم نو جوان تھا۔ ریحان اختر نے امیر کبیر گھرانے کی رائجہ سے محبت کی شادی کی، اس سے بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام نینا رکھا گیا۔ نینا میں ریحان اختر کی جان تھی۔ اچانک رائجہ کو کچھ ایسا ثبوت دیکھنے کو ملا کہ وہ ریحان اختر سے نفرت کرنے لگی۔ دونوں کے درمیان فیصل قائم ہو گئی۔ نینا کی گولیوں اور اعصابی تناؤ سے کمی کے لیے رائجہ تقریباً اپنی مریضہ بن گئی مگر ریحان نے وہ ثبوت غائب کر دیے۔ طلال کی نینا پر نظر تھی جبکہ رائجہ کی بیٹی بہن عارفہ کا اگلا بیٹا رمان احمر جو کہ ملٹی پل پلچٹل میں رچنل میجر ہے وہ اور نینا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں مگر رمان کی بچپن کی بیٹی دعا فاطمہ، رمان سے جنون کی حد تک عشق کرتی ہے لیکن وہ اسے صرف دوست سمجھتا ہے۔ دعا بار بار رمان سے کھلم کھلا نینا کی وجہ سے دو بدو ہوتی ہے مگر رمان کے دل میں صرف نینا ہے۔ عارفہ، رائجہ ان کی دادی زچون بیگم ہاربا اس موضوع پر بات کر چکی ہیں۔ عارفہ کو نینا پیاری ہے تو دعا بھی عزیز ہے مگر رمان نہیں مانسک۔ نینا کی سبکی مدد پر جو کہ اس کی کالج فیلو ہے اس کا تعلق غریب گھرانے سے اس کے گھر میں بڑا بھائی رگزی، اماں اکبری اور چچو موجود ہیں چچو کو وہ آپا کہتے ہیں آپا کی زندگی سنگین حادثے کا شکار ہے اس لیے مدد پر اور رگزی ان سے بہت پیار کرتے ہیں۔ آپا مدد کو امیر کبیر سے دور رہنے کی تاکید کرتی ہیں، ریحان رائجہ کے بہترین دوست ہیں مگر ان سے انہوں نے محبت نہیں کی جبکہ ریحان نے اپنی پیاری دوست کے بعد نہ شادی کی نہ اپنے تایا ابابا کی بات مانی۔ بیرون ملک ملازمت کر لی اب وہ واپس آئے ہیں یہاں سے سب کچھ وائسٹاب کر کے باہر ہی مستقل سیٹ ہونے کے لیے۔ جس پر تایا ابابا راضی نہیں ان کے خیال میں ریحان کو سعدیہ سے شادی کر لینی چاہیے۔ جس کے لیے وہ راضی نہیں۔ کہانی میں نیا موڑ آیا ہے کہ رائجہ کی ملاقات میڈیکل اسٹور پر سیلز مین ذوالفقار سے ہوئی ہے جس نے دواؤں کے شارٹ ہونے اور نہ کھانے کا مشورہ دیا۔ رائجہ نے اس ہمدردی کی بات مان لی۔ رائجہ میں آنے والی خوش آئند تبدیلی سے نینا بوا بہت خوش ہیں۔ ریحان اور طلال تھیں۔ طلال کی اور نینا کی ریح کی کلامی ہوتی ہے۔ طلال، نینا پر ہاتھ اٹھا لیتا ہے جس پر رائجہ بہت غصہ ہوتی ہیں اور ایمان اختر کو بتاتی ہیں لیکن ایمان اختر کوئی رسا نہیں دیتے۔ رائجہ کی ذوالفقار سے اچھی دوستی ہو جاتی ہے جس پر ریحان اختر چیلس ہوتے ہیں۔ رمان، رائجہ کے کہنے پر نینا کو مدد کے گھر لے کر جاتا ہے بائیک پر جو دعا کو اچھا نہیں لگا۔ ریحان اختر، رمان کو آفس ملنے کے لیے بلاتے ہیں تو وہ آنے کا وعدہ کرتا ہے۔ ایک ایگزیکٹو میٹن میں رائجہ کی ملاقات ریحان سے ہوتی ہے تو ریحان رائجہ کو پہلے والے انداز میں دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ رشتے کرانے والی کے مشورے پر اکبری بیگم، ذوالفقار سے گھر تبدیل کرنے کو کہتی ہیں۔ طلال اور ریحان اختر چاہتے ہیں کہ نینا آفس جو ان کے لیے لیکن وہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہتی ہے۔ نینا رمان کو فون کرتی ہے لیکن دعا اس سے بات نہیں کرائی۔ (اب آگے پڑھیں)

سرگرمی کے کش لگاتے وہ جانے کس جہاں میں گم تھے۔ ڈھلتی شام میں لان کی سرسبز مچلی گھاس پر بنگے پاؤں چلنا اچھا لگ رہا تھا۔ جلتے ذہن کو شاید سکون مل رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے پھولوں کی خوشبو اڑ رہی تھی مگر بعد مدتوں وہ گہری جامد خاموشی کی قید میں تھے۔ نینا یونیورسٹی کی بات کر گئی، بوائے گھر کے راشن کی لسٹ تھما دی، طلال کو گاڑی کی خرابی کے باعث ان کی گاڑی کی چابی چاہیے تھی۔ رائجہ کو ان سے ویسے ہی کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی، وہ گاڑی نکال کر جانے کہاں گئی تھیں؟

اس سے تو خاص کیفیت اور خاص حالت تھی۔ چلتے چلتے تھک گئے تو کین کی صوفہ کم کرسی پر بیٹھ

جئے۔ پلکیں موند کر خود سے ہمکلام ہوئے۔

”ہر ایک لمحہ شب غم ہے، امید صبح بھی بہت کم ہے کیا کروں؟ کسی کی یاد میں سب گنوا دیا ہے، گناہ گار محبت سہی مگر گناہ محبت کون نہیں کرتا یہ تو فطرت آدم ہے، ریحان اختر۔ لیکن یہ تقصیر اکبر بھی ہے۔“ اپنے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑتے ہوئے اپنے آپ کو ہی جواب دیا۔ عین اس وقت گیٹ پر گاڑی کا ہارن بجا اور جو کیدار نے گیٹ کھول دیا۔ رمان کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر وہ نارمل ہو گئے۔ وہ گاڑی سے اتر کر سیدھا ان کے پاس آ گیا حالانکہ آیا تو نیناں سے ملنے تھا۔

”اسلام علیکم؟“ رمان نے کہا اور ہاتھ ملایا۔

”وعلیکم السلام۔۔۔۔۔“ وہ متانت سے بولے، وہ ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

”آج خلاف توقع آپ شام انجوائے کر رہے ہیں۔“

”بس بہت دنوں بعد ایسے بیٹھنے کا موقع ملا ہے۔“ وہ اندر کا اضطراب چھپا کر مسکرائے۔

”آپ نے بلایا تھا، فرمائیں۔۔۔۔۔“ رمان نے یاد دہانی کرائی۔

”ہوں، بات کرتے ہیں، پہلے یہ بتاؤ کیا سوچ گئے؟“ ریحان اختر یکدم ہشاش بشاش سے ہو گئے۔

”چائے۔۔۔۔۔ لیکن باقی سب بھی آجائیں۔“

”باقی سب میں میرے لیے تو نیناں ہی سب ہے وہ شاید کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی ہے۔“

اور رابی خالہ۔۔۔۔۔ اس نے دانستہ ان کا ذکر کیا۔

”میں بھی کچھ دیر پہلے نہیں گئی ہیں شاید کسی سے ملنے۔“ عجب سا طنز تھا ان کے جملے میں جس پر وہ چبھتا ہوا سوال کر بیٹھا۔

”آپ رابی خالہ کا ذکر ایسے کیوں کرتے ہیں جیسے وہ قابل ذکر ہی نہ ہوں؟“

”ہاں میں اور کیا کہوں وہ فائنو اسٹار ہوٹل میں رہتی ہیں، نہ میں کچھ پوچھتا ہوں اور نہ وہ کچھ بتانے کی

ضرورت سمجھتی ہیں۔۔۔۔۔ ویسے بھی آج کل وہاں رہتی ہیں جہاں اپنی خبر نہیں آتی۔۔۔۔۔“ انہوں نے مفصل جواب دیا لیکن اسے قطعاً ان کا جواب اچھا نہیں لگا۔

”کچھ تو زندگی پر ان کا بھی حق ہے۔“

”اس حق کا وہ خوب استعمال کر رہی ہیں، آپ فکر نہ کرو، اپنی سناؤ۔“

”جی بس اللہ کا شکر ہے۔“ انہوں نے اس کا مختصر جواب سن کر اندازہ لگا لیا کہ وہ انہیں اچھا نہیں سمجھ رہا۔

”یار ایہ آپ کی کمپنی آپ کو کیا دے رہی ہے، آئی ٹین جو آپ کی صلاحیت ہے اس کے مقابلے میں۔۔۔۔۔؟“

”اچھا ہے بلکہ بہت اچھا ہے۔“

”دیکھو نا! اتنی محنت کے بعد چھوٹی گاڑی ہے اسی سے سیلری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔“ وہ بولے اور پورچ میں کھڑی اس کی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

”انکل! میری پرموشن ڈیو ہے، ویسے میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔“ اس کے نزدیک ریحان اختر کی یہ باتیں فضول تھیں۔

”لیکن آپ بہت زیادہ ڈیزرو کرتے ہو، چھوڑو اس کمپنی کو۔“

”اور پھر نئی جگہ، نئے لوگوں کو متاثر کرنے کی جدوجہد شروع کر دوں۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”بھئی، ہم آپ سے متاثر ہی متاثر ہیں، ہمارے پاس آ جاؤ، ہمارے کاروبار کا حصہ بنو۔“

”سوری انکل! کاروبار جس کا ہوتا ہے اسی کو مبارک ہو، میں کارکن کی حیثیت سے ہی وابستہ رہنا پسند کرتا ہوں۔“

”چلو پونہی سہی، ہمارے لیے کام کرو۔“

”لیکن کیوں.....؟“

”تاکہ آپ کو آپ کی محنت کا درست صلہ ملے۔“

”وہ مجھے مل رہا ہے، میں بہت مطمئن ہوں۔“

”ارے مطمئن ہوں تو گیٹ پر کھڑا چوکیدار بھی کہتا ہے مگر ہم سمجھتے ہیں اس کی ضرورت کیا ہے؟“

”اچھی بات ہے آپ اس کی ضرورت سمجھیں، مجھے اجازت دیجیے میں چلتا ہوں۔“ وہ خاصی بیزارگی کا شکار ہو گیا تھا۔

”رمان! انکچولی کاروبار نیناں کے نام منتقل کر کے ہمیں کوئی اچھا اور دیا نندرا آدمی چاہیے جو میری نیناں کو کبھی دھوکا نہ دے۔“ وہ خاصے کمزور سے پڑ گئے۔

”دھوکے سے ڈرتے ہیں آپ.....؟ اس نے پوچھا۔

”نہیں، نیناں کی وجہ سے کہہ رہا ہوں.....“ انہوں نے نرمی سے کہا۔

”فی الحال تو میں آپ کی آفر پر غور نہیں کر سکتا۔“ اس نے سادگی سے کہا۔

”مگر ہم تو مستقبل میں کچھ اور دیکھ رہے ہیں۔“

”مستقبل کی مستقبل میں دیکھیں گے، ابھی میں ذرا نیناں سے مل لوں۔“

”ہاں، ہاں! بلکہ اندر چلو وہیں چائے پیتے ہیں، میں تو بھول ہی گیا۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے.....

نیناں کو دیکھنے کی خواہش نے اسے اندر جانے پر مجبور کر دیا ورنہ وہ اچھا خاصا بور ہو چکا تھا..... اسے پہچان انکل کی گفتگو سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوا تھا..... جانے وہ کیا چاہتے تھے.....؟ ایک طرف وہ ڈرے ہوئے تھے، دوسری طرف اسے لالچ دے رہے تھے..... جانے کیوں؟

☆☆☆

اس نے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اپنے مخصوص انداز میں ہانک لگائی ”نیناں، نیناں!“ مگر جواب میں ایک چیخ سنائی دی..... پہچان صاحب کال سننے شاید کچھ دیر کے لیے اسے کمرے میں گئے تھے..... وہ جو اس باختم ہو کر بچن کی طرف بھاگا، کیونکہ وہیں سے کانچ کے برتن ٹوٹنے اور اسٹیل کے برتن گرنے کی آواز آئی تھی..... ساتھ میں نیناں کے چلانے کی آواز تھی۔

بچن بزدل جنگ کا میدان بنا ہوا تھا..... وہ آنکھیں بند کیے مسلسل چلا رہی تھی، اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ بازیک شیفون کے دوپٹے میں آگ لگی ہوئی ہے اور نرم و نازک دوپٹا تیزی سے جل رہا ہے وہ تو جانے اور کس خوف سے تھر تھرا رہی تھی..... رمان نے جلدی سے دوپٹا کھینچ کر دور پھینکا تو اس نے جھٹ آنکھیں کھول دیں اور ہاڑی۔

”تم نے میرا اوپٹا اتارا؟“
 ”ہاں..... اگر مجبوری ہوتی تو یہ کُرتہ بھی نوچ پھینکتا۔“ وہ سنک کے ساتھ دیوار سے چپکی نیناں پر آنکھیں نکال کر غرایا۔

”وہاٹ؟ آپ نکل جاؤ.....“ سینے پر بارِ حیا کے باعث دونوں بازو پھیلا کر وہ اور دیوار سے چپک گئی۔
 ”اے ازیا وہ اٹھ راشی میٹ کرنے کی ضرورت نہیں، دوپٹے کو دیکھو اگر نہ اتارتا تو اب تک روسٹ بن چکی ہوتیں اور پھر یہ زمان بے چارہ کیا کرتا؟“

”آگ، اوہ مائی گاڈ.....!“ اب کی بار سچ محج خوف سے اس کی پتلیاں پھیل گئیں۔
 ”جی ہاں آگ، ویسے یہ تم کو ہوا کیا تھا، یہ ساس پین، ٹوٹے ہوئے کپ.....؟“
 ”وہ، وہاں کوکنگ رینج میں ایک چوہا ہے بس میرے ہاتھ سے چائے کا ساس پین گرا، ٹرے الٹی.....“
 اس نے شرمندگی سے بتایا۔

”واہ! نیناں نے چائے بنائی یہ تو کہانی بن گئی، ویسے جو کام آپ کو آتا نہیں وہ کرتی کیوں ہیں؟“
 ”بوا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، فیضو بازار گیا ہے، میں آپ کے لیے چائے بنانے آئی تھی۔“
 ”کیا ہوا بھی؟“ ریحان اختر بھی وہیں آگئے۔
 ”شکرا ادا کریں انکل نیناں محفوظ ہیں۔“ زمان نے کہا تو وہ متفکر سے ہو گئے۔

”کیا مطلب.....؟“ انہوں نے نیناں کو بازوؤں میں بھر لیا۔
 ”کچھ نہیں..... بس چوہا دیکھ کر ڈر گئیں، ابلتی چائے گر گئی، برتن ٹوٹ گئے اور دوپٹے کو آگ لگ گئی۔“
 زمان نے دلچسپ سے انداز میں منظر کشی کی۔

”لا حول ولا، آپ کو کیا ضرورت تھی، اوہ میرے خدا!“ ریحان اختر تو دیوانوں کے مانند اس کی پیشانی چومنے لگے، ٹٹول ٹٹول کر اس کی خیریت کا یقین خود کو دلاتے رہے۔ زمان کچن سے باہر نکل آیا..... وہ بھی اسے لیے باہر آ گئے۔

”اس عورت کو بیٹی کی بھی فکر نہیں، بوا اب بوڑھی ہو گئی ہیں، رابعہ کو خود سب کچھ دیکھنا چاہیے مگر جی..... نہیں تو عشق سے فرصت نہیں۔“ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھتے ہوئے وہ زمان کو سنانے کے لیے بولتے چلے گئے۔

”بابا!“

”انکل.....“ زمان اور نیناں ایک ساتھ بول اٹھے۔
 ”چپ رہو نیناں، آپ پر بھی ماں کا اثر آئے گا۔“ انہوں نے دانستہ نیناں کو خلاف معمول سنجیدگی سے کہا جس کا مقصد زمان کو جتلاتا تھا..... وہ ضبط نہ کر سکا تو بد تمیزی کے ساتھ اٹھ کر باہر نکل گیا..... ریحان اختر نے ایک آواز دی وہ نہ رکا تو وہ خاموش ہو گئے..... نیناں کی آنکھیں بھر آئیں..... زمان کا جانا تڑپا سا گیا۔

”کوئی بات نہیں میری جان..... یہ پھر آ جائے گا۔“ ریحان اختر نے اس کی آنکھیں اپنے ہاتھ سے صاف کر کے نہایت پیار سے کہا تو وہ دھیرے سے اٹھی اور اپنے کمرے کی طرف چل دی..... ریحان اختر کو اچھی طرح یقین آ گیا کہ نیناں کے دل میں زمان کی کیا حیثیت ہے؟ زمان تو انہیں خود بھی اچھا لگتا تھا، اس میں

وہ سب خوابوں میں موجود تھیں جو وہ اپنی پیاری بیٹی کے شوہر میں دیکھنا چاہتے تھے۔

☆☆☆.....☆☆☆

گھر پہنچنے تک اس کا دباؤ کی طرح پک چکا تھا، چہرہ تپتا ہوا تھا، ٹی وی لاؤنج میں سے گزرا مگر نہ اسے ماں دکھائی دیں اور نہ دعا پر نگاہ ڈالی..... جتنے خوشگوار منوڈ میں گیا تھا، اس کے بدلے غصہ، اضطراب لے کر لوٹا تھا..... کمرے کا دروازہ کھٹ سے بند کر کے بیڈ پر آڑا تر چھالیت کر ریحان انگل کے دھکتے ہوئے جملوں پر غور کرنے لگا۔

”شٹ اپ! کتنے گندے خیالات ہیں آپ کے اپنی بیوی کے لیے۔“ وہ شدید غصے میں بڑبڑایا، اس کے سامنے دانشہ ریحان اختر نے رابعہ کے کردار پر کیچڑ اچھالا تھا۔ اس کی پیاری رابی خالہ جنہوں نے طویل عرصے کے بعد مسکراتا شروع کیا تھا..... ایک دم ہی اس نے موبائل فون اٹھا کر رابی خالہ کا نمبر ملا لیا..... دوسری گھنٹی پر فون ریسیو ہو گیا۔

”ہیلو جان.....“ رابعہ نے پیار سے پکارا۔

”رابی خالہ! آپ کہاں ہیں.....؟“ اس نے ذہن میں کلیلا تا سوال ہی پوچھا۔

”اس وقت ایک دوست کے ساتھ۔“ بڑے نارمل اور سادہ سے انداز میں جواب آیا۔

”دوست.....“ وہ دھیرے سے ڈہرا کے رہ گیا۔

”زمان خیریت تو ہے؟“ وہ پریشان سی ہو گئیں۔

”ہوں، ارے نہیں، بس ویسے ہی۔“ وہ گوگو کی سی کیفیت میں ٹال گیا مگر کچھ عجیب سی بات تھی۔

”اوکے! میں گھر جا کر بات کرتی ہوں، عارفہ آپ تو ٹھیک ہیں؟“

”جی بالکل ٹھیک ہیں، آپ اپنا خیال رکھیے، اللہ حافظ۔“ یہ کہہ کر بے دلی سے فون بند کر دیا۔

”کتنے گھامڑ ہو، پوچھ لیتے کون سے دوست کے ساتھ۔“

”پاجی! سجان انگل کے علاوہ کون ہو سکتا ہے؟“ خود سے تکرار کر کے کچھ بے چینی کم ہوئی۔

”سجان انگل تو بہت ناکس ہیں، ریحان انگل ان سے جیلس ہیں، سیدھی سی بات ہے..... فکر کی کوئی بات

نہیں۔“ یہ بات سوچ کر اسے شدید بھوک کا احساس ہوا۔ بیڈ سے اٹھا تو عارفہ وہیں آ گئیں۔

”کہاں سے آئے ہو.....؟“

”آپ کو دعائے بتا دیا ہوگا۔“

”مگر اتنے عجیب سے موڈ میں وہاں سے تو نہیں آ سکتے۔“

”چھتیس سو مسائل ہوتے ہیں، کسی بھی وجہ سے موڈ خراب ہو سکتا ہے۔“ وہ پہلی بار ماں سے نظریں جراتے ہوئے بولا۔

”کھانا کھانا ہے یا.....؟“

”کھانا ہے بلکہ بہت بھوک لگی ہے۔“

”پھر ایسا کرو ظاہرہ پھپھو کے پاس آ جاؤ وہیں کھاؤ۔“

”وہ کیوں.....؟“

”پھپھو نے لاڈ لے لے بھینچے کے لیے کشمیری پلاؤ اور ہرے بھرے کباب بنائے ہیں۔“

”تو یہاں لے آئیں نا.....!“

”بھئی ظاہرہ کی طبیعت بھی کچھ ناساز ہے وہاں چل کر خیریت پوچھو، ایک ہی پھپھو ہیں ان کا تو خیال رکھا

کرد۔“ عارفہ نے اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔

”جی ہاں! اور ایک ہی بیٹی ہیں ان کی بانس جیسی انہیں سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔“ وہ شرارت سے ہنستے ہوئے بولا۔

”بکومت فوراً آ جاؤ.....“ عارفہ نے ڈپٹ کر کہا اور چلی گئیں..... مجبوراً وہ بھی ہاتھ منہ دھو کر ان کے پیچھے

ہی باہر نکل آیا..... اس میں کوئی شک و شبہ کی بات ہی نہیں تھی کہ اپنی پھپھو سے اسے بے حد پیار تھا، دعا بھی

اسے بہت پیاری تھی، ظاہرہ ایک گھر میں کھیل کود کر جوان ہوئے تھے..... بس دعا نے اس انس اور پیار کو

دوسرے معنی دے دیے جبکہ اس کے لیے وہ بہت پیاری دوست اور اچھی سی بہن تھی اس کے علاوہ کچھ نہیں.....

وہ بھی ایسا اس کے لیے سوچ ہی نہیں سکا، ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ من کی میت نہیں تھی، من میں اس کے

صرف اور صرف نیناں ہی بسی تھی..... آج بھی ڈری سہمی، روتی چلاتی کس قدر معصوم اور پیاری لگ رہی تھی کہ

دل نے گستاخی پر اکسایا مگر موقع مناسب نہیں تھا..... اس لیے ضبط کر گیا۔

☆☆☆.....☆☆☆

بڑی بڑی ہرے نیلے نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر..... جانماز پر بیٹھی اکبری بیگم کو حیرت و مسرت کے احساس

نے چھو لیا، انہیں شاید اتنا قوی یقین اب تک دعاؤں کی قبولیت پر نہیں آیا تھا..... اس وقت تو ایسا لگا جیسے اللہ

پاک نے کان لگا کر دعا سنی اور وہیں بیٹھے بیٹھے جھولی بھر دی..... انہوں نے نوٹ رکھنے کے بعد شان بے

نیازی سے کرسی پر بیٹھے پاؤں ہلاتے زلفی کو دیکھا اس کے چہرے پر فاتحانہ سی مسکراہٹ تھی۔

”اماں! یقین کر لیں یہ پیسے آپ کے ہی ہیں۔“

”یقین ہی تو نہیں آ رہا.....“ وہ نوٹوں کی گڈیاں اٹھا کر..... جانماز تہہ کرتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھیں۔

”کیوں، اللہ ہم پر مہربان نہیں ہو سکتا.....؟“

”ارے وہ تو مہربان ہی مہربان ہے، اس کی مہربانی کے سہارے ہی تو وقت گزرا ہے۔“ اکبری بیگم کو

شوہر کی وفات کے بعد سے لے کر اب تک گزرا وقت یاد آ گیا..... پلکیں نم سی ہو گئیں۔

”اب سامان باندھ لیں، ہم نئے خوشیوں بھرے گھر میں رہیں گے۔“

”یہ پیسے کہاں سے آئے.....؟“ اکبری بیگم نے پوچھا۔

”اس، اس گھر کا بیانہ ہے، پورے پانچ لاکھ ہیں۔“

”بیانہ بھی مل گیا اور نیا گھر.....؟“ اکبری بیگم خوش ہو گئیں۔

”ہاں، ہاں سب کچھ مل جاتا ہے..... بس جلد نئے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے.....“ وہ بڑے وثوق سے کہہ

کر اٹھنے لگا، عین اسی وقت آپا باہر آ گئیں..... وہ ان کے گلے کا ہار بن گیا۔

”اب ہماری آپا ٹھانڈ سے زندگی بسر کریں گی۔“

”زلفی! میری زندگی تو بسر ہو گئی، بس اللہ تمہیں خوش آباد رکھے۔“ انہوں نے پیار سے اس کے بالوں میں

انگلیاں پھیریں۔

”مدیحہ کہاں ہے.....؟“ اس نے پوچھا۔

”سورہی ہے؟“ آپا نے بتایا۔

”ہیں! یہ اس کے سونے کا وقت تو نہیں ہے۔“ وہ متفکر سا ہو گیا۔

”اسے یونیورسٹی سمجھے کا یقین دلا دو۔“ آپا نے وجہ بیان کی۔

”تو ٹھیک ہے..... لیکن پہلے جو پیر رہ گیا ہے وہ تو دینا ہے۔“

”اس کو پر سچے کی تیاری کے لیے سہیلی کی مدد چاہیے، اس کا کیا کروں.....؟“ اکبری بیگم نے دوسری وجہ

بھی بیان کر دی۔

”یقیناً راجا رحمان کی بیٹی کے پاس..... یہ ذرا مشکل کام ہے۔“ وہ ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا۔

”ہاں! میں نے سمجھایا ہے مگر وہ جتنی ہے کہ اسے اچھا کمپیوٹر آتا ہے۔“ آپا نے بھی کھڑا لگایا۔

”تو اسے یہاں بلا لیا کرے۔“

”یہاں وہ بے چاری اس دن ہی موٹر بائیک پر مشکل سے آئی تھی..... پھر نہ اچھا ماحول اور نہ کمپیوٹر.....“

آپا نے لے جانے پر دباؤ ڈالا۔

”آپا..... وہ.....“ وہ ہکلا یا۔

”میرے خیال میں کچھ دیر کے لیے چھوڑ دیا کرو۔“ آپا کی آواز کسی سناٹے سے آئی۔

”چلیں ٹھیک ہے، گیٹ پر چھوڑ دیا کروں گا، واپسی پر لے لیا کروں گا..... دیر سویر ہو سکتی ہے۔“ وہ بولا۔

”بس کوشش کرتی ہے کہ جلد واپس لے لو۔“ آپا بولیں۔

”ویسے بھی چند دن کی بات ہے۔“ اکبری بیگم نے کہا۔

”چلیں، اب مجبوری ہے، اسے بتا دیجیے گا، مجھے کام ہے۔“ وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”کچھ تو خیال کیا کریں، بوانے ہی آپ کو اتنا بڑا کیا ہے۔“ میناں نے احساس دلایا۔

”اماں! پہلے گھر شفقت کر لیں اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔“ وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ اور آپ اپنے چہرے پر آئے فکر کے سائے دور کر کے وضو کرنے کے لیے صحن میں لگی ٹوٹی کے پاس چلی گئیں۔

☆☆☆

جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا کبھی بوا کو یوں بستر سے لگا نہیں دیکھا تھا..... نیناں تو بالکل تنہا ہی ہو گئی تھی۔ ماما کی روزانہ کی مصروفیت میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ رزلٹ آنے تک اس کے پاس کوئی مصروفیت تھی نہیں بس وہ بوا کے ارد گرد تھی..... وہ اسے نیم وا آنکھوں سے دیکھتی رہتیں..... کمزوری کے باعث پوری طرح آنکھیں بھی نہیں کھول پاتی تھیں..... رابعہ نے دھیرے دھیرے ان سے بھی عدم توجہی کا برتاؤ کر لیا تھا۔ سب کام کاج پہلے ان کی نگرانی میں ہوتے تھے، اب صرف اور صرف ملازمین کے ہاتھ میں تھے..... بوا اس پر بھی بستر پر پڑی کڑھ رہی تھیں۔

”یو آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں، میں بور ہو گئی ہوں۔“ اس نے پکارا اور دل کی بات کہہ دی۔

”بالکل یہی کہا تھا میں نے بھی۔“ یوانے دھیرے سے کہا۔

”کیا.....؟“ نیناں کچھ نہ سمجھی۔

”تمہاری داوی کی پٹی سے لگ کر۔“ وہ ادا اس ہو گئیں۔

”پھر وہ بولیں کہ عادت بنا لیا کیلئے رہنے کی۔“ یوا کی آنکھوں سے اشک ٹوٹے اور تکیے میں جذب ہو گئے۔

”اچھا آپ اداس نہ ہوں، میں ہوں آپ کے پاس.....“ نیناں نے پیار سے ان کے ماتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”اللہ تمہیں نظرِ بد سے بچائے، خوش رکھے۔“

”بوا، ممّا کو کیا ہو گیا ہے؟“ پہلے یہی سوال وہ ماما کے لئے کہا کرتی تھی۔

”بدلاؤ ہے، ٹھیک ہے یا غلط یہ نہیں پتا.....“ انہوں نے جواب دیا۔

”بوا! بوا!..... یہ میرے کمرے میں ہر چیز کے ترتیب سے، نہ جراب پر

کہاں الٹ پلٹ ہیں۔“ اسی اثنا میں طلال چوتھا چلاتا ان کے کمرے میں آگیا۔

”طلال بھائی، آپ دیکھ نہیں رہے ہو اکی طبیعت ٹھک نہیں رہی۔“ غلام کو

آگیا۔

”آپ اپنی چونچ بند رکھو، یہ بیمار ہیں تو یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ طلال نے اچھی خاصی بدتمیزی کا مظاہرہ

[illegible]

”تو کیا کریں، باہر نکال دیں۔“ نیناں کو جیسے پتنگے لگ گئے۔

”اوہ ہو! چڑیا کے بھی پر نکل آئے ہیں۔“ وہ تمسخرانہ انداز میں بولا۔

”طلال! طلال!.....!“ بوائے کچھ کہنا چاہا۔

4 3 2 1

ماہنامہ پاکیزہ 120 دسمبر 1977ء

”اتنے ڈشنگ اور ہینڈسم شخص کو برا کہنا بہت بری بات ہے۔“ مدیحہ نے طلال کی تعریف میں انتہا پسندی کی حد کر دی۔

”کیا ڈشنگ اور ہینڈسم ہونا خوبی ہے، تمہیں اندازہ ہی نہیں یہ کیا ہیں؟“ نیناں نے تعجب اور حیرت کے ملے جلے تاثرات دیے۔

”خیر، پسند اپنی، اپنی خیال اپنا اپنا.....“ مدیحہ کے دل نے نیناں کی رائے مسترد کر دی۔

”اب یہ بتاؤ، کیا کھاؤ، کیا پیو گی؟“ نیناں نے مہمان نوازی کے لیے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”جو تم چاہو..... لیکن مجھے بوا سے ملو اور تمہاری ماما؟“ وہ اپنے مخصوص تیز رفتار انداز میں بولتی گئی۔

”ماما باہر گئی ہیں اور بوا کی طبیعت کچھ خراب رہتی ہے وہ اپنے کمرے میں ہیں۔“ نیناں نے کہا۔

”تمہاری ماما تو یقیناً ہوں گی ہی خوب صورت.....“ مدیحہ نے نیناں کو اس طرح کے سوالوں سے بچ کر دیا تو اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”سب حسین ہیں، سب خوب صورت ہیں یا، اب جان چھوڑو۔“

”ہا..... ہا..... ہا.....“ مدیحہ کھٹکھٹا کر ہنس دی۔

”تم بیٹھو میں کچھ لانے کا فیصلہ کو کہہ کر آتی ہوں۔“ نیناں یہ کہتے ہوئے باہر چلی گئی۔ تو وہ سیدھی اس کی کمپیوٹر ٹیبل کی طرف آ گئی۔ نئے ماڈل کا کمپیوٹر فل ایسسریز کے ساتھ رکھا تھا، ڈیل کا لیپ ٹاپ رکھا تھا، پین، کاغذ، ڈائری سب کچھ ٹیبل پر موجود تھا۔ وہ دیکھنے میں محو تھی کہ پشت سے کسی کے کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ وہ چونک کر پلٹی تو بوکھلا گئی۔

”کمپیوٹر دیکھنے میں دلچسپی ہے یا چلانا بھی آتا ہے؟“ طلال نے خاصی بے تکلفی سے بات کی۔

”وہ، جی آتا ہے لیکن پرچے کی تیاری کے ساتھ کچھ نیناں سے سیکھنا ہے۔“ وہ بولی۔

”واہ! نیناں چڑیا کسی کو سکھا بھی سکتی ہے؟“ وہ کندھے اچکا کر بولا۔

”نیناں آپ کی بہت تعریف کرتی ہے۔“ بوکھلاہٹ میں وہ یہ کہہ گئی تو طلال کی آنکھیں آخری حد تک پھیلیں اور پھر وہ تہقہ لگا کر ہنستا چلا گیا۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی، یہ تھا تو سفید جھوٹ جو وہ بول گئی تھی..... نیناں کی جگہ خود اس کی تعریف کرنا چاہ رہی تھی۔

”آپ تو بہت جھوٹ بولتی ہیں۔“ وہ بے باکی سے کہہ گیا۔

”یہ جھوٹ نہیں ہے۔“ وہ جزبزی منمنائی۔

”وہ میری تعریف کبھی نہیں کر سکتی۔“ وہ اڑ گیا۔

”ہاں! میں نے کبھی طلال بھائی آپ کی تعریف نہیں کی۔“ پیچھے سے نیناں نے آکر بہت تلخ لہجے میں کہا۔

”یہی تو میں مس مدیحہ سے کہہ رہا ہوں، یہ مانتی ہی نہیں۔“ وہ بڑی معصوم سی ادا کے ساتھ گھوم کر بولا۔ نیناں کے چہرے پر سخت ناگواری کے تاثرات تھے۔

”آپ پلیز جائیں..... کسی بے تکلفی کی ضرورت نہیں ہے۔“ نیناں نے رخ موڑ کر کہا تو وہ واپسی کے لیے ایریڈیوں کے بل گھوم گیا۔ اس کے جاتے ہی نیناں مدیحہ سے بولی۔

”میں کب تعریف کرتی ہوں؟“

”تو کیا کرونا، اتنے اچھے تو ہیں۔“ مدیحہ نے شوخی سے کہا۔

”پلیز! چھوڑو اس فضول بات کو، بیٹھو کام کرتے ہیں۔“ نیناں نے کمپیوٹر کا تار الیکٹرک سپلائی بورڈ میں لگایا اور بیٹھ کر اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا..... مگر مدیحہ کا دل اور دماغ تو جیسے اس کے پاس تھا ہی نہیں۔

☆☆☆

جب سے وہ نیناں کے گھر سے لوٹی تھی زبان مسلسل تعریفوں میں مصروف تھی۔ اس کی باتوں سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ کوئی خواب بیان کر رہی ہو..... جب رات تک یہ سلسلہ جاری رہا تو آپا نے عشا کی نماز پڑھتے ہی ٹوکا۔

”بس کرو مدیحہ..... وہ باتیں کر رہی ہو جو دوسروں کی ہیں۔“

”نہ یہ بتاؤ تم وہاں کمپیوٹر کے سپر کی تیاری کرنے گئی تھیں یا راجا صاحب کا بنگلا دیکھنے؟“ وی پر نظریں جمائے جمائے زلفی نے بھی طنز اور مذاق کو اکٹھا کر دیا۔

”بھائی! تیاری اپنی جگہ مگر کسی کے گھر کی تعریف کرنے میں حرج ہی کیا ہے.....؟“ مدیحہ نے جواب دیا۔

”ہے حرج..... کسی کا گھر جو ٹھہرا، اپنے گھر آگن تک نگاہ رکھتے ہیں۔“ اکبری بیگم رات کا کھانا ٹرے میں رکھے وہیں آ گئیں۔

”جانے آپ سب کیسی باتیں کرتے ہیں.....؟“ وہ جھلا اٹھی۔

”بھی سیدھی سی بات ہے، بڑے دروازوں سے ہم جیسے لوگ گزریں تو بونے دکھائی دیتے ہیں۔“

اکبری بیگم نے فلسفیانہ انداز اختیار کیا تو مدیحہ اچھل ہی پڑی۔

”اوہو اماں! میری سہیلی بہت اچھی ہے، وہ مغرور نہیں ہے۔“

”اب چپ کر جاؤ..... پہلے سب اچھے ہی لگتے ہیں، چلو کھانا کھاؤ اور کمرے میں آ جاؤ۔“

”بھائی! ہمارا گھر؟“ اس کا جملہ سوالیہ تھا۔

”جلدی خریدیں گے مگر سہیلی کے بنگلے جیسے گھر کے خواب نہ دیکھ لینا۔“ زلفی نے اپنی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

”بس ذرا کشادہ ہو، گلیاں تنگ نہ ہوں۔“ اماں نے مشورہ دیا۔

”ایسا ضرور ہو جہاں گاڑی آ سکے۔“ مدیحہ نے ہانک لگائی تو اندر سے آپا کی آواز آئی۔

”مدیحہ! عشا کی نماز ضرور پڑھنی ہے۔“

”سن لیا، آپا کا اشارہ اس طرف ہے کہ خواب سے حقیقت میں آ جاؤ۔“ زلفی نے ٹکڑا لگایا۔

”اچھا آ جاؤ.....“ زلفی کی بات نظر انداز کر کے اس نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

”زلفی! لڑکی دیکھنے جاؤں.....؟“ اماں نے اپنے مطلب کی بات کی۔

”اماں! کیا ہو گیا آپ کو، گاؤں تو بسنے دیں، گھر تو پہلے لے لیں۔“ وہ بولا۔

”دراصل لڑکی کی ماں نے بار بار کہلوایا ہے، انہیں جلدی ہے۔“ وہ بولا۔

”تو پھر انہیں کہیں لڑکی بھیج دیں۔“ اس نے تمسخر اڑایا۔

”بہت بری بات کی تم نے۔“

”تو اور کیا کہوں؟“ بھی ان کی لڑکی بھاگی جا رہی ہے کیا.....؟“ پانی پینے کے بعد وہ بڑے تھکنے سے بولا۔
”حمیدہ بتا رہی تھی لڑکی خوب صورت ہے، اکلوتی ہے، کھاتے پیتے لوگ ہیں۔“

”آپ حمیدہ سے کہہ دیں جب ہم چاہیں گے تب بات ہوگی۔“ وہ لالچ سا ہو کر پھر سے ٹی وی دیکھنے میں مچھو ہو گیا..... مدیحہ نے آپا کے کہنے کے مطابق وضو کا ارادہ کر کے صحن کا رخ کیا..... آپا صرف اس سے نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے ہی ناراض ہوتی تھیں۔ انہیں ناراض کرنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور ہوش سنبھالنے سے اب تک کبھی آپا کو نماز قضا کرتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کی دنیا صرف اور صرف باقاعدگی سے نماز کی ادائیگی تک محدود تھی..... یہی تاکید وہ مدیحہ اور زلفی کو کرتی تھیں مگر زلفی تو کبھی اس پر عمل پیرا نہ ہو سکا البتہ مدیحہ پوری کوشش کرتی تھی، بس کبھی کبھار عشا کی نماز سستی کی نذر ہو جاتی جس پر آپا تھکا ہوا کرتا کہتیں۔
”رات کوئی زندگی لے کر سونا اچھی بات ہے، عشا کے بعد انسان نیا ہو کر سوتا ہے۔“

”آپ تو پرانی کی پرانی ہی رہتی ہیں، وہی بال، وہی ایک طرح کے کپڑے۔“ وہ دانستہ شرارت سے کہہ دیتی تو گھٹنوں کی چپ ان پر طاری ہو جاتی..... مدیحہ شرمسار ہو کر انہیں بہلانے کی کوشش کرتی مگر شاید چپ توڑنے پر ان کو اختیار نہیں تھا، تب وہ لاڈ سے ان کے گلے میں بازو ڈال کر سو جاتی..... وہ سو جاتی اور وہ جانے رات کے کس پہر مان جاتیں..... اس کی پیشانی چوم کر ڈھیروں دعائیں دیتیں۔

وہ عشا کی نماز پڑھ کر سیدھی بستر پر گر گئی..... لیکن طلال پوری وجاہت کے ساتھ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا..... مدیحہ نے اس کے تصور میں کروٹ لے کر آنکھیں موند لیں تو آپا نے اس کے سامنے کی طرف آ کر پیشانی چوم کر دھیرے سے کہا۔

”اپنے کمرے میں سما جانے والے خواب دیکھنا.....“ انہوں نے جانے کیسے اس کی بند آنکھوں میں بھی سب کچھ پڑھ لیا..... وہ ٹھنکی مگر بند آنکھیں نہ کھول سکی۔

☆☆☆

کمرے کی مدھم روشنی میں وہ ڈرینگ ٹیبل کے سامنے ٹائٹ کریم چہرے پر لگانے میں مچھو تھیں کہ اچانک پشت سے دیکھتے ریحان اختر پر نظر پڑی تو چونکیں..... وہ جب کمرے میں آئی تھیں ریحان سوئے ہوئے تھے، واش روم میں چنچ کے لیے گئیں، باہر نکلیں تب بھی وہ سوئے ہوئے تھے..... لیکن اب وہ پوری آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”کیا بات ہے رابعہ بیگم تمہاری اداؤں میں.....“ انہیں متوجہ پا کر زبردستی جملہ کہا گیا..... وہ نشو و نما سے ہاتھ صاف کر کے ہیر برش سے بال سنوارتے ہوئے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئیں۔
”اچھا تو آپ کو یاد ہیں۔“

”کیا.....؟“ نا جھی سے پوچھا گیا۔

”ادا میں.....“ وہ ادا سے بولیں۔

”مجھے کبھی یہ ضرورت نہیں پڑی، تمہاری ادا میں تو دوسروں کے لیے تھیں اور اب بھی ہیں۔“

”ٹھیک کہا آپ نے، آپ نے تو جھوٹ بولا تھا، کسی پری وٹس سے محبت کرتے تھے۔“ وہ سپاٹ سے انداز میں چبا چبا کر بولیں۔

”تھے تو غلط خیال ہے تمہارا۔۔۔۔۔“ وہ طنز یہ مسکرائے۔

”میری بلا سے کرتے رہیں۔“

”بوا بہت کمزور اور ضعیف ہو گئی ہیں، انہیں توجہ چاہیے، نیناں کو بھی نظر انداز کرنے لگی ہو۔“ وہ یکسر موضوع بدل گئے۔

”نیناں آپ کی جان ہے، بوا کو آپ کی توجہ بھی چاہیے۔“

”پھر دستبردار ہو کر جاؤ نیناں سے۔“ وہ چڑ گئے۔

”میں بیکار بحث کے موڈ میں نہیں۔“

”میں نے رمان سے کچھ کہا تھا۔“ وہ پھر نئے موضوع کے ساتھ مخاطب ہوئے۔

”تو پھر۔۔۔۔۔“

”اس نے کچھ بتایا نہیں؟“

”تو پوچھ لیں۔“

”پوچھ کر بتاؤ۔“

”اس نے مجھے کچھ بتانا ہوتا تو آج بتا دیتا، میں دادی سے مل کر آ رہی ہوں، وہ بھی وہیں تھا۔“

”مجھے وضاحت مت دو کہ کس سے مل کر آ رہی ہو۔۔۔۔۔؟“

”مجھے کیا ضرورت ہے وضاحت دینے کی۔۔۔۔۔“ وہ بہت سنجیدگی سے بولیں۔

”مجھے ویسے ہی سب کچھ معلوم ہے، عورت کی ایسی تبدیلی کا بڑا مشہور نام ہے مگر میں وہ کہنا نہیں چاہتا۔“

”پلیز! مجھے نیندا آ رہی ہے۔“ وہ بیڈ پر اپنی ساڈ پر کروٹ لے کر لیٹ گئیں۔

”غلط کہا رابعہ بیگم! اب تو تم سوتے میں بھی جاگ رہی ہو، اب تمہیں نیند کی گولیاں بھی نہیں کھانی پڑتیں۔“ وہ طنز بھرے تیر چلا کر خود بھی کروٹ لے کر لیٹ گئے۔ رابعہ نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔۔۔۔۔ بس ہلکا سا تبسم لبوں پر چل گیا۔۔۔۔۔ ریحان کے طنز سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ جیلس ہو رہے ہیں۔

”چلو کسی بھی وجہ سے تمہیں تکلیف تو ہونے لگی ہے ریحان اختر!“ وہ ہولے سے زرب لب بڑبڑائیں۔ ان کا خیال کچھ بھی تھا، ریحان اختر بخوبی جانتے تھے ان میں انقلابی تبدیلی آ چکی تھی۔

☆☆☆

رمان ایک ہفتے کے لیے ریجن کے ٹور پر چلا گیا تو عارفہ تنہائی سے بچنے کے لیے اور موقع غنیمت جان کر دادی سے ملنے چلی آئیں۔۔۔۔۔ دادی گلو کی درد سے اسٹور سیٹ کر رہی تھیں۔۔۔۔۔ شہناز اور صفو بھی دونوں تیزی سے سامان ان کے کہنے کے مطابق دائیں بائیں رکھ رہی تھیں۔

”دادی! ہماری زوجہ ماجدہ کہتی تھیں کہ اسٹور کے کام تو عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔“ گلو نے موقع پاتے ہی فرمایا تو شہناز اور صفو جل گئیں۔

”اسی لیے وہ جلدی اوپر چلی گئیں۔“

”ارے، ایسے نہیں کہتے۔“ زیتون بیگم نے ان دونوں کو ڈپٹا۔۔۔۔۔ اسی وقت آٹو رکشا گیٹ پر رکا تو وہ سمجھ گئیں کہ عارفہ یا رابعہ ہیں لیکن زیادہ گمان عارفہ کا ہی تھا، رابعہ تو اب گاڑی خود ہی چلاتی تھیں، عارفہ رمان کی محتاج تھیں۔ عارفہ ہی تھیں۔۔۔۔۔ وہ خوش ہو کر وہاں سے ٹی وی لائونج کی طرف آ گئیں۔

”السلام علیکم!“ عارفہ نے گلے کر کر کہا۔

”وعلیکم السلام! جیتی رہو، اپنے بچے کی ہزاروں خوشیاں دیکھو۔“ انہوں نے پیشانی چوم کر دعا دی۔

”آمین ثم آمین، اللہ وہ وقت تولا لے۔“ عارفہ نے ٹیٹھتے ہوئے کہا۔

”کیوں، بھئی، وقت کو کیا کہیں سے لا کر لانا ہے، ماشاء اللہ فرما شہر دار پر سر روزگار بیٹا ہے بس جب چاہو سہرا سجادو۔“ زیتون بیگم نے بڑی سادگی سے کہا تو عارفہ خاموش ہو گئیں۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔“

”مشکل کیا ہے؟“

”آپ نہیں سمجھ سکتیں، ڈہری الجھنیں ہیں۔“ عارفہ نے گول مول کے کہہ کر ٹالا۔

”کیسی الجھنیں۔۔۔۔۔؟“ وہ متفکر سی ہو گئیں۔

”بس کچھ سمجھ میں نہیں آتا، دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔“

”پہیلیاں بھجوا رہی ہو؟“

”دادی! دعا، رمان کو جی جان سے چاہتی ہے اور رمان، نیناں کو پسند کرتا ہے۔“

”اور تم کیا چاہتی ہو۔۔۔۔۔؟“

”میں دعا کا دل نہیں دکھانا چاہتی اور میں رمان کو بھی دکھی نہیں کر سکتی، طاہرہ بہت اچھی اور پیاری نند بن کر رہیں، ان کا چہرہ دیکھتی ہوں تو شرمندگی ہوتی ہے۔“ عارفہ نے الجھن واضح کر دی۔

”یعنی ایک انار سو بیار والی بات ہے۔“

”ہاں، اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں۔۔۔۔۔؟“

”دیکھو! کرنا تو وہی پڑے گا جو رمان چاہتا ہے۔“

”نیناں مجھے بہت عزیز ہے لیکن دعائیں دن میری نظروں کے سامنے رہتی ہے۔“ عارفہ بہت پریشان تھیں۔

”کیا، کیا جائے۔۔۔۔۔؟“

”یہی تو فکر دامن گیر ہے، دعا کے لیے رشتے آتے ہیں تو وہ دوڑا دیتی ہے۔“

”اے سمجھاؤ کہ جب رمان ایسا نہیں چاہتا تو یہ خیال چھوڑ دے۔“

”دادی! یہ دل کی لگی یوں کب بچھتی ہے؟ مجھے دعا پر ترس آتا ہے۔“

”اور نیناں کی مرضی معلوم ہے۔۔۔۔۔؟“

”یقیناً وہ بھی رمان کو پسند کرتی ہے۔۔۔۔۔ بس کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتی۔۔۔۔۔“ عارفہ نے اپنی دور رس نگاہوں سے جہاں تک دیکھا تھا کہہ دیا۔

”ہمارا خیال ہے پھر نیناں کے لیے رابعہ سے بات کرلو۔“

”رابعہ سے یا ریحان سے؟“

”ایک ہی بات ہے۔“ انہوں نے تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں ان دونوں میں تو ویسے ہی معاملات سرد ہیں، یہ بھی الجھن ہے، رابعہ سے ہی مشورہ کروں گی کہ کیا کرنا چاہیے؟“ عارفہ بیگم نے خود ہی فیصلہ کیا۔ اسی وقت گلوچائے کی ٹرے لے آیا۔

”میں ہفتہ بھر رہنے آئی ہوں گلو صاحبہ.....“ عارفہ نے گلو کو واضح کیا کہ کمر اصاف کروائے۔

”اچھا زبجہ ماجدہ کہتی تھیں بیٹیوں کا گھر میں آنا جانا رحمت ہوتا ہے جی۔“ گلو خوش ہو کر بولا۔

ان دونوں کو ہنسی آگئی..... اتنے بڑے گھر میں گلو کا وجود بہت غنیمت تھا، اسی کی وجہ سے زندگی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ کام کاج سے فارغ ہو کر گھنٹوں زیتون بیگم کے پاس بیٹھ کر دکھ سکھ بانٹتا تھا۔

☆☆☆

بے ترتیب دھڑکنوں اور ہلکے ہلکے جذبات کے ساتھ سبک ریزی سے اندرونی داخلی دروازے سے اندر داخل ہوئی تو دلی طور پر اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی، جی چاہا کہ کسی کو اس کے آنے کی خبر نہ ہو، نیناں بھی نہ دیکھ سکے پہلے وہ کہیں سے آجائے، مگر آجائے..... اس کی یہ خواہش پوری ضرور ہوئی مگر ایک طرف سے طلال آیا اور دوسری طرف سے بوا آگئیں، ان کی طبیعت کچھ سنبھلی تھی تو چلنے پھرنے لگی تھیں۔

”آپ! آئیں بیٹھیں.....“ طلال نے بے تکلفی سے کہا..... مگر مدیحہ جزبزی تھی کہ کیا کرے؟ بوائے اس کی مشکل حل کی۔

”مدیحہ ہو۔“

”جی جی ہاں۔“ وہ بولی۔

”تو آؤ نیناں ٹیرس پر ہے۔“ انہوں نے طلال کو نظر انداز کر دیا۔

”بوا! نیناں کو اطلاع دے دیں۔“ مگر وہ مصر ہو گئیں۔

”نہیں، نیناں نے وہیں بھیجے کو کہا تھا۔“

”جی، چلیے۔“ مدیحہ کو بادل نا خواستہ بوا کی ہم رکابی اختیار کرنی پڑی مگر دل پھر سفید کڑکڑاتے شلوار سوٹ میں ملبوس طلال پر انکارہ گیا..... بس اتنا قرار دل بے قرار کول گیا کہ وہ دیکھائی دے گیا۔ ٹیرس پر نیناں خود کو پرسکون محسوس کرتی تھی..... احمد فراز کی کتاب اس کے ہاتھ میں تھی..... وہ محو تھی۔

”ہیلو!“ مدیحہ نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو وہ چونکی..... نظریں اٹھائیں تو اسے غور سے دیکھنے لگی..... سو فٹ پنک شلوار سوٹ میں بہت لائٹ سی لپ اسٹک لگائے، بالوں کو سلیقے سے باندھے سانولی سلونی سی مدیحہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

”واؤ! بیوٹی فل یار۔“ نیناں بولی۔

”کون، میں یا یہ احمد فراز کی کتاب.....“ مدیحہ نے بن کر پوچھا۔

”یار! تم، احمد فراز تو احمد فراز تھا..... اس کی شاعری کی تو میں تمہارے جیسی بد ذوق سے بات نہیں کر سکتی۔“

”نہیں آج کرو، اچھی سی کوئی غزل سناؤ..... کوئی نظم سناؤ.....“ مدیحہ چپکی تو نیناں کو حیرت نے آگھیرا۔

”ہیں، ہیں! خیریت تو ہے نا؟“

”بس سناؤ، دل چاہ رہا ہے۔“

”یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے

وہ بت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے“

نیناں نے لہک لہک کر شعر پڑھا۔

”واہ!“ مدیحہ محسوس اٹھی۔

”ویسے تمہیں کیا ہو گیا ہے.....؟“ نیناں نے کریدا۔

”کچھ نہیں بس تمہیں وہم ہو گیا ہے۔“

”کیسا وہم.....؟“

”میرا مطلب ہے، میرا مطلب کہ تم غلط سوچ رہی ہو۔“ مدیحہ کچھ سے کچھ بول گئی۔

”اس کو کہتے ہیں چور کی داڑھی میں تنکا..... بھی میں تو کچھ نہیں سوچ رہی۔“ نیناں نے حیران ہو کر کہا تو وہ خفت سے بولی۔

”اچھا چلو، اب مجھے چپٹر ون کی باقی ایکسرسائز کرا دو۔“ مدیحہ نے بات کا رخ بدلا۔ نیناں اٹھ کھڑی ہوئی مگر اسی وقت طلال کافی کے بھاپ اڑاتے دوگ لیے وہیں آگیا۔ نیناں کا ہاتھ ٹھنکا جبکہ مدیحہ کے دل کی گلی کھل اٹھی۔

”طلال بھائی! میرا خیال ہے مدیحہ میری فرینڈ ہے۔“ نیناں نے جل کر کہا۔

”تو ایسا کہاں کوئی ہوگا جو تمہاری فرینڈ کا بھی اتنا ہی خیال رکھے۔“ وہ چہکا۔

”پلیز! آپ صرف اپنا خیال رکھیں، آؤ مدیحہ.....“ نیناں نے کہا اور مدیحہ کا ہاتھ پکڑ کر چل دی۔

”چڑیا! یہ کافی میں نے بنائی ہے، یہ تو پیتے دو۔“

”آپ پیئیں.....“

”نیناں! بری بات ہے۔“ مدیحہ نے کہا۔

”کوئی بری بات نہیں ہے.....“ نیناں یہ کہہ کر اسے کھینچے لیے چلی گئی۔

”نیناں! تمہاری اپنے کزن سے لڑائی کیا ہے؟“ مدیحہ نے اس کے کمرے میں پہنچ کر پوچھا۔

”چھوڑو، بیٹھو اور کمپیوٹر آن کرو۔“ نیناں نے نال دیا۔

”مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔“

”تمہیں کیوں اچھا نہیں لگ رہا، وہ میرے کزن ہیں مجھے معلوم ہے کیسے ہیں.....؟“ نیناں نے اچھے

خامے کڑک انداز میں کہا..... مدیحہ چپ ہو گئی لیکن اس کے دل اور دماغ دونوں نے نیناں کی بات قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

☆☆☆

گھر کا بیاند وصول کرنے کے بعد انہوں نے ضروری ساتھ لے جانے والا سامان الگ کر کے پیک کرنا شروع کر دیا تھا..... باقی موٹے موٹے سامان سمیت گھر کا سودا کیا تھا۔ اس وقت وہ اپنی بک شیلٹ سے کتابیں نکال کر میز پر رکھ رہے تھے..... رابعہ نے ہولے سے دروازے پر دستک دی تو انہوں نے پلٹ کر دیکھا..... رابعہ کو خلاف توقع اپنے سامنے دیکھ کر وہ خوش ہو گئے۔

”زبے نصیب.....!“

”کیا کر رہے ہو، کمرے میں کیسے سامان پھیلا رکھا ہے؟“ انہوں نے کمرے میں چاروں طرف پھیلے سامان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بے ترتیب زندگی کو ترتیب دینے کی تیاری ہے۔“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب میز پر رکھ کر جواب دیا۔

”یہ ترتیب تو بہت پہلے دے لیتی چاہیے تھی۔“

”ہاں! لیکن دل نے پسند نہیں کیا۔“

”سبحان! آج یہ بتاؤ کہ کیوں تم نے خود کو ادھورا اور ناکمل رکھا؟“ صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے پوچھ لیا۔ وہ چند لمحے رابعہ کو غور سے دیکھتے رہے پھر بالکل سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”تمہارے ہوتے ہوئے میں کب ادھورا ہوں؟“

”میں..... میں تو تمہاری مخلص دوست ہوں، محسوس کر کے پوچھ رہی ہوں۔“ وہ گڑبڑائیں پھر سنبھل کر بولیں۔

”چھوڑ دو دوست! یہ گزرے وقت کی باتیں ہیں، تم سناؤ کیا ہو رہا ہے؟“ وہ یکسر ٹال گئے تو وہ صوفے کی

پشت سے سرٹکا کر بولیں۔

”بس رنگوں اور رونقوں کے پیچھے بھاگ رہی ہوں۔“

”یعنی سزاب کے پیچھے؟“

”شاید۔“

”لیکن کیوں کیوں حقیقت پسندی کا راستہ چھوڑ دیا؟“

”سبحان! میری زندگی میں صرف نیناں ہے، باقی کچھ نہیں..... سبحان اور میرے بیچ صرف طویل اور تاریک فاصلہ ہے۔“

”تو ختم کرو فاصلہ، نیناں کی خاطر ہی سہی۔“

”پلیز! سبحان! سب نیناں کی خاطر ہی سہہ رہی ہوں، اس موضوع پر بات مت کرو۔“ وہ ہنسنے لگیں۔

”اور اس موضوع پر.....؟“ وہ دانستہ جملہ روک کر دیکھنے لگی۔

”وہ ٹھیک ہے، اس کا وجود خوشگوار احساس ہے۔“ انہوں نے سمجھ کر کہا۔

”مجھ سے زیادہ.....“ انہوں نے بے ساختہ پوچھا تو وہ بھڑک اٹھیں۔

”یہ کیا بات کی تم نے، کمپیر یزن، تم کیا ہو، نہیں جانتے، وہ کچھ اور ہے، سب ایک جگہ کیسے قیام کر سکتے ہیں۔“

”مجھے اپنے بارے میں پتا ہے، بات تو اس کی ہے۔“ کچھ اور طرح کے رنگ اکٹھے ہو کر ان کی آنکھوں

میں بکھر گئے۔

”کافی پلو او، تم سب کچھ بھول گئے ہو۔“ انہوں نے فرمائش کی تو وہ مسکرا کر کافی بنانے یا ہر چلے گئے۔ وہ انہیں اور ان کی الماری کھول کر دیکھنے لگیں..... کارڈز، کی رنگز، خشک پھول، پرفیومز کی خالی بوتلیں سب محفوظ

تھیں، سب ان کے دیے ہوئے تھے تھے جنہیں زمانے گزرنے کے بعد بھی سبحان نے محفوظ رکھا تھا۔ اس کے دل میں کچھ ارتعاش سا پیدا ہوا۔ وہ گزرے دن یاد آ گئے۔ آزادی کے، بے فکری کے اور دوستی کے دن۔

سارے زمانے سے بھاگ کر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنے میں لطف آتا تھا اور پھر جانے کیوں وہ سبحان اختر کی فریب زدہ محبت کا شکار ہو گئیں۔

”سبحان! تم میرا قیمتی سرمایہ ہو، مجھے فخر ہے تمہاری دوستی پر..... خدا کرے کہ تم کو خوشیاں ملیں۔“ وہ سوچ رہی تھیں کہ وہ آ گئے۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“

”سبحان! تم جارہے ہو؟“

”ہم جارہے ہیں، لیتی ہیں اور بڑے ابا.....“ انہوں نے کافی کا لگ انہیں پکڑا لیا۔

”خوشی سے؟“

”نہیں۔“

”تو پھر.....“

”پھر یہ کہ جانا تو ہے۔“

”پلیز مت جاؤ۔“ وہ بے ساختہ کہہ گئیں۔

”کیا؟“

”سبحان! مجھے دوستوں کی ضرورت ہے۔“ وہ بے بس سی دکھائی دیں۔

”رابعہ! سب دوست ہیں، مجھے تو جانا ہے۔“ وہ بولے۔

”اچھا، ٹھیک ہے۔“ کافی کی چسکی لیتے ہوئے لہجہ مدہم تھا۔

پھر بہت سادقت دے قدموں سرک گیا۔ سبحان سوچتے رہے کہ زندگی کیسے بنا عنوان کے گزر گئی..... رابعہ کے لیے وہ اب سراپا دعا تھے۔

☆☆☆

”نیناں! نیناں!“ رمان آوازیں دیتا ہوا اس کے کمرے میں آ گیا۔ وہاں سبحان اختر پہلے سے موجود تھے..... وہ اسے قائل کر رہے تھے کہ آفس آیا کرے لیکن اس نے اپنی عدم دلچسپی واضح کر دی تھی۔ اسے صرف یونیورسٹی کے داخلے سے دلچسپی تھی۔ سبحان اختر بیٹی سے ضد تو نہیں کر سکتے تھے۔

”السلام علیکم! ارمان نے سنبھل کر سلام کیا۔“

”وعلیکم السلام! آؤ جوان کیسے ہو؟“ وہ بہت اپنائیت سے بولے۔

”جی میں بالکل ٹھیک، آپ کیسے ہیں؟“

”یار! ہم تو ٹھیک ہیں لیکن آپ نے لفٹ ہی نہیں کرائی۔“

”دراصل مصروفیت بہت رہی، آج رات کمپنی نے میوزیکل شوارچ کرایا ہے، اس کے لیے نیناں کو کہنا تھا۔“

”سچ، کون سا گروپ ہوگا؟“ نیناں نے خوش ہو کر پوچھا۔

”پتا نہیں۔“

”آپ نے جانا ہے؟“ ریحان اختر نے براہ راست نیناں سے پوچھا۔

”جی۔“

”رمان! بھئی ہماری بیٹی کو خود لے کر جانا۔“ وہ بولے۔

”جی، میں اسی لیے حاضر ہوا ہوں، ابھی لے جاؤں گا پھر رات کو گھر سے تیار ہو کر چلے جائیں گے۔“

اس نے تفصیل بتائی۔

”ٹھیک ہے، نیناں! فیضو سے کہو کہ جوس لے کر آئے۔“

”اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔“ رمان نے کہا مگر وہ مضرت تھی، نیناں باہر چلی گئی تو وہ پھر اسی موضوع پر آ گئے۔

”رمان! آپ نے سوچ کر بتانا تھا۔“

”انکل! میں نے پہلے بھی عرض کی تھی کہ میں الحمد للہ سیٹ ہوں۔“

”خاک سیٹ ہو یا رات دن مارا ماری کرتے ہو۔“ انہوں نے استہزائیہ سا انداز اختیار کیا۔

”وہ تو میری تعلیم اور ملازمت کی ضرورت ہے۔“

”ہاں تو اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ اچھے مقام پر ہونا چاہیے۔“

”سوری! اچھے مقام سے کیا مراد ہے آپ کی؟“ اس نے ناپسندیدگی کے ساتھ کہا۔

”میرا مطلب ہے آپ کو اور اچھا عہدہ ملنا چاہیے، ہمارے ساتھ۔“ وہ بولے۔

”میں سمجھا نہیں۔“

”رمان! ہمارے کاروبار کا بوجھ بانٹ لو تا کہ ہم نیناں کے لیے فیصلہ کریں۔“ دانستہ ذمہ داری بات کر کے

وہ موبائل فون میں مصروف ہو گئے۔ وہ کچھ نہ کچھ سمجھ گیا لیکن چاہتے ہوئے بھی خوشی اس سے دور رہی۔ کچھ

بھی کہے بغیر معذرت کر کے باہر آ گیا۔ ریحان اختر کو یہ معذرت بالکل پسند نہ آئی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ خوش

ہو کر رضا مند ہو جائے گا مگر اس نے جانے میں بڑی عجلت اختیار کی۔ موبائل فون مٹھی میں دبائے وہ اپنے

کمرے میں آ گئے۔ رابعہ کے پاس رمان کو دیکھ کر وہ پیشانی پر چند سلوٹیں ڈال کر لائے قدموں باہر نکل گئے۔

”رابی خالہ! نیناں سے کہیں کہ جلدی آ جائے، مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ ریحان انکل کے ساتھ ہونے

والی گفتگو پر پردہ ڈال گیا۔

”میں بتاتی ہوں مگر تم بیٹھو ابھی کہاں جانا ہے۔“ رابعہ یہ کہہ کر نیناں کو بلانے چلی گئیں۔ تو وہ تنہائی

پاتے ہی خود ابھمن کا شکار ہو گیا۔ اسے ریحان انکل کی سوچ اچھی نہیں لگی بھلا کوئی ایسے بھی سوچتا ہے۔

رشتوں کی بنیاد میں سودا گری کہاں سے آگئی؟ وہ سوچ میں گم تھا کہ نیناں نے اس کی آنکھوں کے سامنے اپنا

ہاتھ لہرا کر متوجہ کیا۔

”ہیلو! ہیلو!“ وہ چونکا تو نظریں اس کے خوب صورت چہرے پر ٹپک گئیں۔

”کیا دیکھ رہے ہیں؟“

”میں حسن کی معصوم ادا دیکھ رہا ہوں۔“ وہ شوخ ہو گیا تو وہ پرے ہو گئی۔

”چلیں۔“

”رابی خالہ؟“

”ان کا فون آیا ہے، وہ مصروف ہیں۔“

”اور ریحان انکل؟“

”وہ چلے گئے ہیں۔“

”نیناں! تمہارے بابا عجیب و غریب باتیں کرتے ہیں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا، وہ کچھ نہ بولی اپنا مختصر سا

سامان والا بیگ اٹھا کر اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ البتہ ذہن میں اس کے جملے نے کافی ہلچل مچا دی۔ صین

اسی وقت رابعہ سامنے آ گئیں۔

”واپسی کتنے بجے ہوگی؟“

”رات لیٹ ہو جائیں گے، صبح چھوڑ دوں گا۔“

”کہاں جانا ہے؟“ انہوں نے پوچھا تو اس نے تفصیل سے بتا دیا۔

”مما! آپ بھی چلیں؟“ نیناں نے کہا۔

”نہیں، مجھے کہیں جانا ہے بلکہ بوا کے دوٹیٹ ڈاکٹر صاحب نے لکھے ہیں وہ بھی کراہے ہیں۔“ اس

نے کہا۔

”میں کرا دیتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”ارے نہیں، آپ لوگ جائیں۔“ رابعہ نے مسترد کر دیا۔

”آپ کچھ پریشان ہیں۔“

”نہیں، ایسی خاص بات نہیں، میں دادی کی طرف رات ٹھہروں گی۔“

”مما! بوا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ نیناں نے یاد دلایا۔

”ہاں، بالکل بس میں گھر پر ہی ہوں۔“ انہوں نے پروگرام بدلا۔

”اوکے، اللہ حافظ۔“ رمان نے کہا اور باہر نکل گیا، کچھ بھی بتائے بناتے

”بائے ممما!“ نیناں نے ان کی پیشانی پر لب رکھ کر کہا اور باہر نکلی۔ رابعہ متذبذب کا شکار بنی کچھ دیر

وہیں کھڑی رہیں پھر کچھ سوچ کر اپنے کمرے میں آئیں اور تیار ہونے لگیں۔

☆☆☆☆

جانے کیسی ادا اس اور خاموش سی شام ڈھلی تھی کہ وہ اپنے اندر اور باہر گہرا جامد سا محسوس کر رہے

تھے۔ آج گئے دنوں کا سراغ لے کر چاند ابھرا تھا، تاروں کی ضیا پر بھی حسرت دیاں کے عکس قابض تھے۔ وہ

اکیلے تنہا یو الونگ چیئر پر بیٹھے پیپر ویٹ سے کھیلے کھیلے تھک گئے تو کھڑکی کا شیشہ سرکا کر باہر دیکھنے لگے۔ بلند

عمارت کی تیسری منزل سے شہر کی رونقیں صاف نظر آتی تھیں مگر جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ سب کچھ میں دھند لا گئی ہیں..... تا حد نظر خوفناک بے نوری ہے..... دل پھڑ پھڑایا، قفس میں بند ہے بس پرندے کے مانند۔
لیوں پر اپنے لیے تازیانے بیدار ہو گئے۔

”واہ ریحان اختر! کیسی جاہلانہ حکومت ہے تمہاری کہ تم تنہا قفس میں ہو، تمہارے ساتھ احساسِ عدمت، احساسِ شرمندگی کے سوا کوئی نہیں..... تمہاری حکومت کے منہ پر تھوک کر جس نے تم پر حکومت کی وہ تمہاری یادوں کا حصہ ہے..... تم ناکام اور بزدل انسان ہو۔“

”نہیں، شاید میں ناکام تو ہوا ہوں مگر اپنی مرضی سے نہیں، کوئی نہیں جانتا دل کو ریزہ ریزہ کر دینا حسرت تھی کسی کی..... یہ تم کیا جانو کہ کیا فطرت تھی کسی کی، مجھے تو ان آنکھوں میں آنسو دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ پر ہم کو رلا دینا یہ عادت تھی کسی کی۔ اس کی ضد نے ہمیں ناکام بنا دیا..... دل وحشی کی یہ حسرت بھی نکل گئی کہ چاندنی جتنی بھی ممکن ہو چالی جائے، عشق تو نام ہے آدابِ پزیرائی کا، حسن کے سامنے بس آنکھ جھکا لی جائے، محبت کے تقاضے معلوم تھے ہمیں کیسے اس در پر کوئی بن کے سوا لی جائے، ہمیں معلوم نہیں تھا۔ اب تو اسے یاد کرنا ہماری مجبوری ہے جس میں کیوں ناز و تازہ ہوا کھالی جائے..... وقت نے دکھلادیا کہ وہ خود ہی بکھر گیا۔ ایسے پھول کے مانند جس کی خوشبو نہ سنبھالی جائے وہ پھول بکھر گیا، ریحان اختر کی ضد پر، محبت پر نہیں کیونکہ محبت پر شاید ضد غالب آگئی۔“

ریحان اختر کی بند آنکھوں سے دو موتی ٹوٹے اور کوٹ کے کالر میں سما گئے وہ کھڑکی سے ہٹ کر دوبارہ کرسی پر آ کر گر سے گئے..... آنکھیں موند لیں..... جانے کتنی دیر اسی حالت میں رہتے کہ موبائل فون بج اٹھا تو ان کی سوچ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

”ہیلو جی۔“ وہ بولے دوسری طرف سے کسی نے ایسا کچھ کہا کہ وہ خوشی سے اچھل پڑے۔
”تھینک یو، تھینک گاڈ۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے فون بند کر دیا..... گاڑی کی چابی نکالنے کے لیے ٹیبل کی پہلی دراز کھولی تو نظر کپکپا اٹھی..... یادیں پھر دامن گیر ہو گئیں..... دل پھر کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔
یادیں بھی ہیں کچھ ایسی

ترے نام سے وابستہ

لاکھوں ہیں تمنائیں

پر یہ میری دعا ہے

بس نام رہے میرا

ترے نام سے وابستہ!

وہ دراز بند کر کے باہر نکل رہے تھے تو چاروں طرف موجود رونقوں نے بڑھ کر اُن کا استقبال کیا..... ایک دم ہی سب کچھ اپنی اصلی حالت میں دکھائی دینے لگا تھا۔
”نیناں امائی ڈیر، مائی لو.....“ بے اختیار اُن کے لبوں سے نکلا۔

”رابعہ جی! ہم تو آپ کے پاس بیٹھ کر دنیا بھول جاتے ہیں۔“ مخمور لہجہ تھا، شریر اشارے رابعہ کو پہلو بدلتا پڑا۔

”ذوالفقار! آپ کی باتیں مجھے احساس دلاتی ہیں کہ میں آپ سے عمر میں کتنی بڑی ہوں۔“
”ارے، یہ کیا بات کی آپ نے، آپ کیا ہیں یہ ہم سے پوچھیں۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا مگر رابعہ کو کچھ اچھا نہیں لگا۔

”ذوالفقار! آپ میرے اچھے دوست ہو، مجھے زندگی میں آپ کا ملنا اچھا لگا ہے، میں واپسی کے سفر میں آپ کے تعاون کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“ وہ اس کی بے باک لگا ہوں سے کتراتے ہوئے بولیں۔
”صرف تعاون کو۔“

”آپ کا مجھ پر احسان ہے ورنہ میں آج بھی بستر پر ہوتی۔“
”تو احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے۔“ وہ خاصی بدتمیزی سے مسکرایا۔
”معلوم ہے مجھے، خیر آج کیا مسئلہ ہے بولو؟“ انہوں نے نارمل ہو کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔
”ایکچولی! مکان مالک کو باہر جانے کی جلدی ہے اور ہمارے گھر کا کوئی خریدار نہیں۔“ ویٹر نے کافی کا

لگ دو براؤنی سامنے میز پر لا کر رکھے۔
”ہونہہ، اچھا.....“ وہ فوک سے براؤنی کا چھوٹا سا ٹکڑا اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بولیں۔
”پھر کیا، بس ذہن الجھا ہوا ہے۔“
”آپ کا گھر کتنے کا ہے؟“
”یہ تو خریدار کی حیثیت پر منحصر ہے۔“ وہ بہت ہوشیاری سے کہہ گیا۔
”بیچنے والے کی ڈیمانڈ کیا ہے؟“ وہ بولیں۔

”بس وہ تمہیں پینتیس لاکھ کا تو ہے۔“ وہ شاطرانہ ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
”تیس پینتیس لاکھ..... اگر میں خرید لوں تو.....“ بڑی سنجیدگی سے انہوں نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

”آپ! آپ رابعہ جی ہمارے چھوٹے سے گھر کا کیا کریں گی.....؟“ خاصی بناوٹ اس نے خود پر طاری کی۔
”کچھ نہیں، وہ میرے لیے غیر اہم ہے مگر آپ کے احسان کے سامنے بہت اہم ہے۔“ وہ غیر معمولی سنجیدہ ہو گئی تھیں۔

”رابعہ جی! آپ، آپ تو ایسے نہ کہیں، آپ اتنی خوب صورت ہیں کہ.....“
”مجھے پتا ہے..... ویسے بھی آپ سے ایسے جملے سننے کی عمر نہیں ہے۔“ انہوں نے ہلکے سے طنز کا سہارا لیا مگر وہ خاصا چرب زبان تھا اس کی باتوں میں مطلب پرستی کی مہک موجود تھی۔ شاید وہ جان چکی تھیں مگر ان کے ذہن میں ایک ہی تاویل موجود تھی کہ کسی کی مدد کرنے سے بھی ذہنی سکون ملتا ہے اور اپنے حصے کی دولت پر تو اپنا حق ہوتا ہے۔ ذوالفقار نے کچھ نہ کچھ تو ان پر توجہ دی ہے انہیں توجہ چاہیے تھی جو انہیں پھر سے زندگی کی طرف لے آئی تھی۔ ورنہ وہ ریحان اختر کے محبت نہ کرنے کے اعتراف کے بعد صدمے سے ہی مر جاتیں۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

خان جی کی اکلوتی لاڈلی بیٹی ڈاکٹر مہ جیس کو لاکھ خواہش اور فرمائش کے باوجود ملازمت کی اجازت ملی اور نہ ذاتی کلینک اور اسپتال بنانے کی اجازت ملی۔ راجا صاحب متوسط طبقے کے بیروزگار نو جوان تھے۔ خان صاحب نے جانے کیا سوچ کر اکلوتی بیٹی ان سے بیاہ دی تجویروں کے منہ کھول کے جہیز اور بنگلہ گاڑی، خدمت کے لیے مہ جیس کی ہم عمر ملازمہ سکھاں بھی ساتھ میں رخصت کر دی۔ سکھاں کے والدین نے رقم لے کر بیٹی ساتھ بھیج دی۔ بیٹی کے ارمانوں کا ذرا خیال نہیں کیا۔ ڈاکٹر مہ جیس کو راجا صاحب نے میٹھی زبان سے رام کیا ان کی خواہش پر بنگلے کے وسیع کشادہ لان میں چھوٹا سا اسپتال نما کلینک بنا دیا یوں مہ جیس کی خواہش کو راجا صاحب نے ناجائز کمائی کا ذریعہ بنا دیا۔ دولت بڑھتی گئی مگر مہ جیس بستر سے لگ گئیں۔ ویسے باپ کی دی ہوئی آزادی اور ناجائز دولت کی ریل پٹل سے ماو پدرا زاد ہو گئی۔ پیٹار ریحان اختر بھی اپنی ڈگر پر چل پڑا۔ ویسے نے گھر سے بھاگ کر شادی کی جادوئے کا شکار ہوئی اپنا بیٹا لاوارث چھوڑا۔ پولیس نے پھر راجا صاحب تک پہنچایا۔ جس کا نام طلال رکھا گیا۔ مہ جیس کے والدین اور سکھاں کے والدین اپنے آبائی علاقے میں خان جی کے سوتیلے بھائی کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ راجا صاحب اور ڈاکٹر مہ جیس کے انتقال کے بعد ریحان اختر نے بھانجے کی بہت لاڈ پیار سے پرورش کی مگر قسم رہ گئے۔ طلال ایک خندی، ہٹ و ہرم نو جوان تھا۔ ریحان اختر نے امیر کبیر گھرانے کی رابعہ سے محبت کی شادی کی، اس سے بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام نیناں رکھا گیا۔ نیناں میں ریحان اختر کی جان تھی۔ اچانک رابعہ کو کچھ ایسا ٹھوٹ دیکھنے کو ملا کہ وہ ریحان اختر سے نفرت کرنے لگی۔ دونوں کے درمیان فیصل قائم ہو گئی۔ نیناں کی گولیوں اور اعصابی تناؤ سے کسی کے لیے رابعہ تقریباً ذہنی سریشہ بن گئی مگر ریحان نے وہ ثبوت غائب کر دیے۔ طلال کی نیناں پر نظر تھی جبکہ رابعہ کی بڑی بہن عارفہ کا اکلوتا بیٹا رمان احمر جو کہ ملٹی پٹیکل کمپنی میں ریجنل منیجر ہے وہ اور نیناں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں مگر رمان کی پھوپھی بیٹی دعا فاطمہ، رمان سے جنون کی حد تک عشق کرتی ہے لیکن وہ اسے صرف دوست سمجھتا ہے۔ دعا با رمان سے کھلم کھلا نیناں کی وجہ سے دبدو ہوتی ہے مگر رمان کے دل میں صرف نیناں ہے۔ عارفہ، رابعہ ان کی دادی زیتون بیگم بارہا اس موضوع پر بات کر چکی ہیں۔ عارفہ کو نیناں پیاری ہے تو دعا بھی عزیز ہے مگر رمان نہیں مانتا۔ نیناں کی لکھی مدد جو کہ اس کی کالج فیلو ہے اس کا تعلق غریب گھرانے سے اس کے گھر میں بڑا بھائی زلفی، اماں اکبری اور بچپن میں بچپن کو وہ آیا کہتے ہیں آیا کی زندگی سنگین حادثے کا شکار ہے اس لیے مدد اور زلفی ان سے بہت پیار کرتے ہیں۔ آپا مدد بچہ کو امیر کبیر سے دور رہنے کی تاکید کرتی ہیں، ریحان رابعہ کے بہترین دوست ہیں مگر ان سے انہوں نے محبت نہیں کی جبکہ ریحان نے اپنی پیاری دوست کے بعد نہ شادی کی نہ اپنے تایا ابا کی بات مانی۔ بیرون ملک ملازمت کر لی اب وہ واپس آئے ہیں یہاں سے سب کچھ وائٹنڈ اپ کر کے باہر ہی مستقل سیٹ ہونے کے لیے..... جس پر تایا ابا راضی نہیں ان کے خیال میں ریحان کو سعدیہ سے شادی کرنی چاہیے۔ جس کے لیے وہ راضی نہیں۔ کہانی میں نیا موڑ آیا ہے کہ رابعہ کی ملاقات میڈیکل اسٹور پر سیلز مین ذوالفقار سے ہوئی ہے جس نے دواؤں کے شارٹ ہونے اور نہ کھانے کا مشورہ دیا۔ رابعہ نے اس ہمدرد کی بات مان لی۔ رابعہ میں آنے والی خوش آئند تبدیلی سے نیناں بوا بہت خوش ہیں۔ ریحان اور طلال متحیر ہیں۔ طلال کی اور نیناں کی رنج گلاہی ہوئی ہے۔ طلال، نیناں پر ہاتھ اٹھا لیتا ہے جس پر رابعہ بہت غصہ ہوتی ہیں اور ایمان اختر کو بتاتی ہیں لیکن ایمان اختر کوئی رسائس نہیں دیتے۔ رابعہ کی ذوالفقار سے اچھی دوستی ہو جاتی ہے جس پر ریحان اختر جیلس ہوتے ہیں۔ رمان، رابعہ کے کہنے پر نیناں کو مدد بچہ کے گھر لے کر جاتا ہے بائیک پر جو دعا کو اچھا نہیں لگتا۔ ریحان اختر، رمان کو آفس ملنے کے لیے بلاتے ہیں تو وہ آنے کا وعدہ کرتا ہے۔ ایک انگریزی ٹیشن میں رابعہ کی ملاقات ریحان سے ہوئی ہے تو ریحان رابعہ کو پہلے والے انداز میں دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ رنجتے گرانے والی کے مشورے پر اکبری بیگم، ذوالفقار سے گھر تبدیل کرنے کو کہتی ہیں۔ طلال اور ریحان اختر چاہتے ہیں کہ نیناں آفس جوائن کرے لیکن وہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہتی ہے۔ نیناں رمان کو فون کرتی ہے لیکن دعا اس سے بات نہیں کرانی۔ ریحان اختر، رمان کو اپنے ساتھ بزنس میں شامل کرنا چاہتے ہیں لیکن رمان راضی نہیں ہوتا۔ ذوالفقار اپنے گھر تبدیل کرنے کے لیے کوششیں کر رہا ہے، ریحان اپنا گھر بیچ کر بڑے ابا کو بھی اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔ (اب آگے پڑھیں)

کافی شاپ کے پرسکون ماحول میں ذوالفقار کی نگاہوں کا کیمرا ان کے چہرے پر فکس تھا۔ وہ بوا کی وجہ سے بہ مشکل تمام وہاں آئی تھیں۔ اب ذہن گھر میں تھا۔
”ذوالفقار! کہو کیا ضروری بات کرنی تھی، مجھے ذرا جلدی ہے۔“
”آپ کو میرے پاس سے جانے کی جلدی ہے۔“ اس نے کمال حیرت سے پوچھا۔
”کیا مطلب.....؟“ انہوں نے بیباک لہجے میں کہا۔

”آپ کیا سوچنے لگیں.....؟“ کافی لمحات انہوں نے کہیں دور جا کر گزارے تو ذوالفقار نے پوچھا۔
 ”کچھ نہیں، بس اپنے بارے میں غور کر رہی تھی۔“
 ”میرا خیال ہے اب تو آپ کو میرے بارے میں غور کرنا چاہیے۔“ کافی بڑی بات وہ آسانی سے کر گئے۔
 نگاہوں میں خمار لاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ ناقابل یقین حد تک چونکیں..... اور بولیں۔
 ”ذوالفقار! شاید آپ نہیں سمجھ سکے کہ کیا کہہ رہے ہو؟“
 ”میں سب سمجھ کر ہی کہتا ہوں، مجھے آپ کے علاوہ کوئی سوچ نہیں رہی۔“
 ”کمال کرتے ہو، بالکل غلط سوچتے ہو۔“ وہ متغیر چہرے کا رنگ دکھا کے اٹھنے لگیں تو وہ اطمینان سے

بولے۔

”رابعہ جی! پلیز بیٹھ جائیں، سوچ پر تو اکتیا نہیں ہوتا۔“
 ”سوچ کا مقام ضرور ہوتا ہے۔“ وہ سنجیدہ ہو چکی تھیں۔
 ”کیا آپ کو محبت کی ضرورت نہیں؟“
 ”اس محبت کی نہیں جو آپ کے دماغ میں ہے۔“ انہوں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔
 ”چلیں اس پر غور کریں، میں تو آپ کو بہت خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے بہت سلیقے سے ان کی دکھتی
 رگ پر ہاتھ رکھا تو وہ نظریں جرا کر اٹھیں اور بولیں۔
 ”میں چلتی ہوں، پھر بات ہوگی۔“
 ”اور وہ گھر.....“

”ہاں، وہ کمر بنائوں گی۔“ ان کا موڈ خاصا اپ سیٹ ہو چکا تھا۔ وہ تیز قدموں سے باہر نکلیں۔ وہ پیچھے ہی
 رہ گیا..... گاڑی تک پہنچی نہ تھیں کہ رمان نے اپنی گاڑی ان کے پاس جا کر روکی۔
 ”رابی خالہ!“

”ہوں، ہاں!“ وہ بوکھلا سی گئیں۔

”آپ یہاں، خیریت..... اور موڈ کیوں خراب ہے؟“ رمان نے کچھ چبھتا ہوا سوال کیا۔

”وہ بس کافی پیٹنے آگئی تھی۔“

”اکیلے یا.....؟“

”کیا مطلب.....؟“

”اچھا خیر جائیں، آپ ڈسٹرب ہیں۔“ وہ کچھ سوچ کر بولے۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے نکال لے گئیں تب
 کافی دیر رمان بہت سنجیدگی سے بہت کچھ سوچتا رہا۔ ذہن میں اٹھل پھٹل سی جگہ گئی۔ ریمان انکل کے جملے
 چٹکیاں لینے لگے تو اس نے سر جھٹک کر ان جملوں کی لٹی کی۔

”نہیں، یہ ممکن نہیں، رابی خالہ کے لیے سجان انکل صرف دوست ہیں۔“ سجان کے خیال کے ساتھ ہی
 وہ لپک کر کافی شاپ کے اندر گیا چاروں طرف دیکھا مگر وہاں کہیں سجان نظر نہ آئے تو کچھ تسکین ملی۔

☆☆☆

اسی رات وہ کسی کام سے رابعہ خالہ کے گھر کے قریب گیا تو دل غیناں سے ملنے کے لیے پھل اٹھا مگر آسمان

پریا ہادلوں کی گڑگڑاہٹ سن کر بارش کے متوقع ہونے کا یقین ہو گیا۔ ایک دل چاہا کہ جائے اور ایک دل چاہا
 کہ موسم کے تیور کڑے ہیں۔

”یار! ایسے موسم میں دلبر کا دیدار ہی تو ہونا چاہیے۔“ یہ خیال آتے ہی اس نے گاڑی کا رخ اس طرف
 موڑ لیا..... مگر گیٹ سے گاڑی اندر داخل ہوتے ہی موٹی موٹی بوندیں گریں اور پھر گرتی چلی گئیں۔ وہ گاڑی
 لاک کر کے اندر آ گیا تو ریمان صاحب ہاتھ میں گاڑی کی چابی اور موبائل پکڑے باہر نکل رہے تھے۔ اسے
 دیکھ کر مسکراتے مسکراتے سنجیدہ ہو گئے، پیچھے آتے فیض کو گردن گھما کر دیکھا اور کہا۔

”نیگم صاحبہ سے کہو کہ رمان صاحب کو سمجھائیں.....“ رمان ہٹکا ہٹکا سا کھڑا رہ گیا کچھ نہ سمجھا، کچھ نہ
 جانا..... وہ گاڑی میں بیٹھ کر باہر نکل گئے تو اسے ہوش آیا۔ اس وقت تک غیناں کو ٹیس پر اس کے آنے کی خبر
 ہو چکی تھی۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگی نیچے آ گئی۔ وہ گم صم سارابعہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ غیناں بھی
 پیچھے پیچھے وہیں آ گئی۔

”ارے، تم کب آئے؟“ رابعہ کو رمان کو دیکھ کر حیرت سی ہوئی۔

”بس ریمان انکل جارہے تھے اور میں آیا تھا۔“

”اچھا! لیکن تمہیں کیا سمجھانا ہے یہ تو مسٹر ریمان نے بتایا ہی نہیں.....“ رابعہ کے لہجے میں چھین تھی۔

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کو مجھے کیا سمجھانا ہے؟“ وہ شولڈر جھٹک کر بولا۔

”نہیں معلوم، خیر کیا فرق پڑتا ہے، بیٹھو۔“

”رابی خالہ! کوئی بات ہے ضرور۔“

”ریمان کے دماغ میں کیا ہے، یہ ہمیں جاننے کی ضرورت نہیں۔“

”مما! بارش ہو رہی ہے۔“ غیناں نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

”ہاں، اچھی سی چائے اور پکوڑے بنوائی ہوں۔“ رابعہ کو بھی ایک دم یاد آ گیا، وہ باہر چلی گئیں اور وہ

غیناں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میں تو تمہیں لے کر باہر جانا چاہتا تھا۔“

”تو چلیں۔“ وہ خوش ہو گئی۔

”مگر اب نہیں.....“

جانے والا کلینک جو کہ چھوٹا سا اسپتال ہی تھا، صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔ دور برآمدے میں ستون سے لگی ہوا کی اشکبار نگاہوں نے سب منظر دیکھا اپنی ڈاکٹری بی بی کی پریم نگاہیں دیکھیں، کس ارمان اور چاہ سے مسجانی کا گھر بنا تھا اور کس بے دردی سے اسے سہارا کر دیا گیا۔ طلال سیاہ عینک کے شیشے صاف کرتا ہوا واپس آیا تو وہ پھٹ پڑیں۔

”تمہیں معلوم نہیں کیسی محبت تھی تمہاری نانوکو۔۔۔ تم نے مزدور لگا دیے، گراڈالا۔“

”نانوکو مرے زمانے گزر گئے ہیں، بند کلینک انڈے نہیں دے رہا تھا۔“ وہ بڑخ کر بولا۔

”کچھ چیزیں یادگار ہوتی ہیں، مجھے بی بی کی سسکیاں سنائی دے رہی ہیں۔“ وہ رو دیں۔

”اوہ! اللہ کا واسطہ، یہ ناک بند کریں، اپنی حالت پر رحم کریں۔“ طلال نے زور سے ہاتھ جوڑ کر کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ وہ لمبے کے ڈھیر کو دیکھ کر آنکھیں صاف کرتے ہوئے مڑیں تو رابعہ اور نیناں کو دیکھ کر رک گئیں۔۔۔۔۔ رابعہ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کیوں رنجیدہ اور آبدیدہ ہیں۔

”بوا! طلال کا کوئی قصور نہیں، یہ سب ریحان اختر کے کہنے پر ہوا ہے۔“

”یہی تو دکھ ہے۔“

”نہ کریں دکھ! تمہوں نے اس جگہ کچھ اور بنانا ہوگا۔“ رابعہ نے بہت نرمی سے کہا۔

”مگر ماما! یہ دادو نے بہت پیار سے بنوایا تھا۔“ نیناں کو بھی ملال ہوا۔

”چھوڑو بیٹا، اب وہ نہیں ہیں تو ریحان کی مرضی ہے۔“ رابعہ نے بی بی کو بھی سمجھایا۔

”رابعہ! اب مجھے واپس چلے جانا چاہیے۔“ بوا کی آواز بھیگی تھی، لہجے میں کچھ مودت تھی۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہ کریں، بے حس ہو جائیں۔۔۔۔۔“ رابعہ نے کندھے سے لگ کر تسلی دی۔

”رابعہ بیٹی! دھیرے دھیرے وہ سب نشان مٹ رہے ہیں۔“

”کوئی نئی بات نہیں ہے بوا! آپ خود تو بتاتی ہیں کہ آپ کی بی بی کو راجا صاحب نے کتنا صدمہ دیا۔ انہیں بستر سے لگا دیا۔ یہ کلینک ان کے لیے اذیت گاہ بن گیا تھا، اس کا گر جانا ہی بہتر ہے۔“ رابعہ نے کہا تو وہ پلکیں دوپٹے سے صاف کر کے اثبات میں گردن ہلا کر چپ رہیں۔

”مگر ماما! بابا پوچھ ہی لیتے۔“ نیناں کو بھی لمبے کا ڈھیر دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا۔

”کس سے؟ ریحان اختر خود مختار ہیں۔“ رابعہ نے طنز یہ کہا اور اندر چلی گئیں۔ نیناں، بوا کو سہارا دے کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ اسی وقت طلال تیار ہو کر باہر نکل رہا تھا کہ رمان کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔۔۔۔۔ اس کی پیشانی پر ایک ہزار ایک سلوٹ نمودار ہوئی مگر حسب معمول رمان نے نوٹس نہیں لیا کیونکہ وہ اپنی امی کے کہنے پر رابی خالہ اور نیناں کو لے جانے آیا تھا۔۔۔۔۔ بڑی امی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ آئی سی یو میں تھیں، عارفہ اور گلو ان کے پاس تھے۔ رمان اسپتال سے ہو کر انہیں لے جانے آیا تھا۔ اس لیے بہت سنجیدہ تھا۔۔۔۔۔ مگر طلال نے حسب عادت بات ضرور کی۔

”ہیلو! مسٹر رمان۔۔۔۔۔“

”ہیلو۔“ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

”نیناں! اب بھی ٹیوشن پڑھتی ہے کیا؟“ اس کے جملے میں گہرا طنز تھا۔

”شٹ اپ۔۔۔۔۔“ رمان اشتعال میں کہہ کر آگے چل دیا۔

”مسٹر رمان! یہاں غیر ضروری آمد کی آپ کو اجازت نہیں۔“

”یار! آپ بکو اس سے باز نہیں رہ سکتے، میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں، رابی خالہ اور نیناں کو لینے آیا ہوں۔“

”مگر ماموں شہر سے باہر ہیں۔“

”سو وہاٹ۔۔۔۔۔؟“ وہ چڑ گیا۔

”تو آپ ماما اور نیناں کو نہیں لے جاسکتے۔“

”جسٹ شٹ اپ۔۔۔۔۔“ رمان آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا رابعہ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر ریتون بیگم کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔۔۔۔۔ رابعہ اور نیناں نے ان کا سفید سرد چہرہ اور بند آنکھیں دیکھیں، دلخراش چیخیں حلق کے اندر ہی دم توڑ گئیں اور حیرت و تاسف کے مارے آنکھوں سے آنسو بہتے چلے گئے۔ عارفہ نے بڑے حوصلے سے ان دونوں کو سہارا دیا۔ رمان کے سینے سے گلو لگا بین کر رہا تھا۔۔۔۔۔ حقیقت تو یہ بھی تھی کہ عارفہ کے اپنے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی، وہ سچ منج ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت سے محروم ہو گئی تھیں۔۔۔۔۔ مگر موت پر کب کسی کا اختیار ہوتا ہے؟ یہ جملہ سوچ کر ایک دوسرے کو سنا کر حوصلہ دینے کی پوری کوشش کی جا رہی تھی۔ ایسویٹنس میں میت گھر پہنچی، رمان نے شہر کے اندر اور باہر سب عزیز و اقارب کو فون پر اطلاع دی۔

”رمان! سچان کو بھی اطلاع دے دو۔۔۔۔۔“ رابعہ نے فون کرتے دیکھ کر کہا۔

”اور ہاں! ریحان کو بھی فون کرو۔“ عارفہ نے آکر کہا تو رابعہ نے منع کر دیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ شہر سے باہر ہیں۔“

”کچھ بھی سہی۔۔۔۔۔ اطلاع تو دینی چاہیے آگے ان کی مرضی۔“ عارفہ نے سمجھایا اور ٹی وی لاؤنچ میں چاند نیاں بچھوانے چلی گئیں۔

”امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔۔۔۔۔ ورنہ وہ بھی کہیں گے کہ مجھے کون سی اطلاع دی تھی۔“ رمان نے بھی عارفہ کی تائید کی۔

”جو، جی میں آئے کرو مگر وہ خود غرض انسان کبھی احساس نہیں کرے گا۔“ رابعہ یہ کہہ کر عارفہ کے پاس چلی گئیں۔۔۔۔۔ تب نیناں کبھی سہی سی، روئی سی اس کے پاس آئی اور فون اس کے ہاتھ سے لے کر بولی۔

”بابا کو میں فون کرتی ہوں۔“ رمان مان گیا۔ اس نے نمبر ملایا۔۔۔۔۔ مگر بڑی دیر تیل جانے کے باوجود فون اٹینڈ نہیں ہوا پھر اس نے دوسرا نمبر ملایا مگر اس پر بھی بات نہ ہو سکی۔ وہ افسردہ سی ہو کر فون واپس دے گئی مگر چند لمحوں بعد پہلے نمبر سے ایک لائن کا میسج آیا۔

”کیا بات آپ کی سمجھ میں آگئی؟“ رمان نے کئی بار پڑھا مگر کچھ معنی و مفہوم سمجھ میں نہ آئے..... کچھ دیر بعد بجلی سی دماغ میں کوندی وہ سمجھ گیا کہ انہوں نے یہ جملہ رمان احمر کے لیے بھیجا ہے، رمان کے تن بدن میں آگ لگ گئی وہ غصے سے کھول اٹھا مگر ضبط کے سوا کوئی چار نہیں تھا، یہ موقع محل رد عمل کا نہیں تھا۔ اس لیے پوری قوت سے فون میز پر پٹخ کر اس طرف آگیا جہاں باہر مردوں کے لیے فرش نشست کا انتظام ہو رہا تھا..... اس کام میں وہ یہ بات بھول بھال گیا مگر جونہی وہ کسی کام سے اندر آیا تو غیناں نے پوچھ لیا۔

”رمان! بابا کو پھر سے فون کیا؟“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ اسے پتنگے لگ گئے۔

”کیوں ضروری نہیں ہے، میری بڑی امی چلی گئیں، بابا کی کچھ لگتی تھیں۔“ نیناں پوری شدت سے چلائی۔

”کچھ نہیں لگتی تھیں، اپنے کام سے کام رکھو۔“ اس نے اور زیادہ سختی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ پہلی بار وہ اس طرح پیش آیا تھا کہ اس کا نازک سادل دکھ سے بھر گیا۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔

”کیا ہوا؟“ بوا کچھ دیر پہلے ہی پہنچی تھیں اسے آبدیدہ دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

”کچھ نہیں، مجھے ڈانٹا ہے۔“ وہ بوا کے گلے لگ کر رودی۔

”ارے ڈانٹا کہاں ہے، وہ تو اکیلا ہے اس لیے پریشان ہو گیا ہے۔“ عارفہ کچھ قریب تھیں، سن کر بولیں۔

”رمان نے بابا کو فون نہیں کیا۔“

”ارے اپنے بابا کی بات نہ کرو، وہ شہر سے باہر ہیں انہوں نے کون سا آنا ہے؟“ بوا نے اس کے خیال کی تردید کر دی۔

”کہاں گئے ہیں؟“

”یہ تو نہیں معلوم۔“

”طلال بھائی سے پوچھیں۔“

”ہونہ، خوبہ کا گواہ ڈو، چلو بیٹھ کر کلہ پڑھیں۔“ بوا نے تمسخر اڑایا اور اسے ساتھ لیے اندر چلی گئیں۔

☆☆☆

”فیضو! فیضو! جلدی ناشتا لے آؤ۔“ طلال نے اپنے کمرے سے ہانک لگائی۔

”جی لاتا ہوں۔“ فیضو نے کچن سے جواب دیا..... جلدی جلدی ٹرے میں ٹوسٹ آلیٹ اور جوس کا گلاس رکھ کر باہر نکلا تو ٹھٹکا۔

”سلام بی بی.....“ جلدی سے مدیحہ کو سلام کیا۔

”وعلیکم السلام!“

”وہ سب تو نہیں ہیں۔“

”کہاں ہیں، نیناں بھی.....“ وہ چاروں طرف نظر پڑاتے ہوئے پوچھی۔

”سب بیگم صاحبہ کے گھر ہیں۔“

”خیریت.....؟“

”بیگم صاحبہ کی دادی فوت ہو گئی ہیں۔“ فیضو نے کہا۔

”اور یہ ناشتا.....؟“ اس کی نگاہوں میں پُر شوق سوال تھا۔

”یہ طلال صاحب کے لیے ہے۔“

”طلال صاحب گھر پر ہیں۔“ ایکدم ہی چہرہ گلریگ ہو گیا۔ فیضو کے کچھ کہنے سے پہلے ہی طلال کی آواز آگئی تو وہ ڈر کے اس کے کمرے کی طرف چل دیا۔ اس نے ایک دولحے کچھ سوچا پھر خود بھی فیضو کے پیچھے طلال کے کمرے کی جانب آگئی..... ہلکے سے دروازے پر دستک دے کر فوراً ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ سفید دودھیا کڑکڑاتے شلوار سوٹ میں ملبوس بیڈ کے کنارے پر رکھے خوب صورت سیاہ سینڈل پہن رہا تھا اسے یوں خلاف توقع دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا۔ فیضو نے کچھ بتانا چاہا مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے جانے کو کہا تو وہ چلا گیا۔

”سوری، میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔“ وہ ہکلائی۔

”وہ کیسے؟“ دلچسپی سے پوچھا گیا۔

”میرا مطلب ہے آپ ناشتا کریں۔“

”مس مدیحہ آئیں بیٹھیں، ہم اتنے برے تو نہیں ہیں۔“ اس نے خاصی ادا سے کہا۔

”ارے آپ تو بہت اچھے ہیں۔“ مدیحہ چار قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی تو وہ مسکرا دیا۔

”سچ، دراصل آپ خود بہت اچھی ہو۔“

”میں..... میں نہیں تو، اماں اکثر کہتی ہیں کہ میں کالی کلوٹی ہوں، بھائی کی نظر اتارنے والا ٹیکا ہوں۔“ وہ بڑے بھولپن سے بولی تو وہ کھلکھلا کے ہنستا چلا گیا۔

”یہ تو آپ کی اماں ٹھیک نہیں کرتیں، آپ کے نمکین سراپا میں جو جاذبیت ہے وہ کوئی ہم سے پوچھے۔“

نگاہوں میں خمار آلود سستی بھر کے وہ قریب کھڑے ہو کر بولا تو وہ کیکپاٹھی، ریڑھ کی ہڈی میں سے کرنٹ گزرا۔

”وہ، میں چلتی ہوں، نیناں کو بتا دیجیے گا۔“ وہ خاصی بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئی تھی۔

”اجی چھوڑیں کوئی ضرورت نہیں نیناں کو بتانے کی۔“

”جی.....!“

”جی، اپنی اور ہماری ملاقاتوں کو پردے میں ہی رہتے دو۔“ اس نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تو مدیحہ نے لمحوں میں دو رتک کا سفر طے کر لیا۔

”اب میں چلتی ہوں۔“

”ارے کیسے جائیں گی؟ میں مای کی طرف جنازے میں جا رہا ہوں، آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔“ وہ

جلدی سے ناشتا کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں، وہ ہماری طرف آلفی کی گاڑی نہیں آجاسکتی۔“ وہ شرمندگی سے ہنسنائی۔

”اوہ! تو پھر.....“

”میرے بھائی آجائیں گے، میں فون کر دیتی ہوں۔“

”ہوں! اس وقت تک تو ہمارے پاس بیٹھیں۔“ اس نے جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

”شکریہ!“ اس نے گلاس تھام لیا اور قریب ہی بیٹھ گئی۔

”کاش! مجھے جانے کی جلدی نہ ہوتی تو.....“ اس نے جلدی جلدی ناشتا کرتے ہوئے توقف کیا۔

”تو.....“ وہ ہنسنے لگی۔ ”دل کے ساتھ اس نے پوچھا۔“

”تو آپ جیسی مکین کے ساتھ گپ شپ رہتی، مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ میری دوست ہیں۔“

”نہیں! تو آپ کی بات بھی ٹھیک سے نہیں کرتی۔“ مدیحہ نے کہا تو طلال کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا، بہر کیف آپ اپنی بات کر و صرف اپنی۔“ طلال نے کمال ہوشیاری سے کہا تو وہ

سچ منہ اپنے ہارے میں ہاتھیں کرتی رہی۔ وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ ایک دم وال کلاک پر نظر پڑی تو وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اوہ! میں تو لیٹ ہو گیا ہوں، اب میں جا رہا ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا جبکہ مدیحہ وہیں جمی رہ گئی۔ خوب صورت ساز و سامان سے آراستہ کمرہ پر فیوم کی بجھنی بجھنی مہک اور اس کے وجہ سے سرپا کا احساس بہت پرکشش تھا۔ دل نے دھیرے سے دعا کی کہ کاش وہ یہیں اس خوابناک ماحول کا حصہ بن جائے۔

☆☆☆

”کہاں کی تیاری ہے میاں پر خودار.....؟“ وہ تیار ہو کر الماری سے ٹوپی تلاش کر رہے تھے کہ بڑے ابا بڑی عجلت میں کمرے میں داخل ہوئے۔

”جی، وہ نماز جنازہ کے لیے جا رہا ہوں۔“

”اچھا تو تمہیں پتا چل گیا۔“

”کیا.....“ سبحان کچھ نہ سمجھے۔

”آخر کو اس بے چاری کا باپ جہاں سے رخصت ہو گیا۔ اب کیا فائدہ جنازہ میں جانے نہ جانے کا، بے فائدہ ہے وہ زندگی جس میں احباب کا ہجوم ہو مگر پیکرِ خلوص ایک بھی نہ ہو۔“ وہ بہت اب سیٹ تھے جبکہ سبحان کی لاعلمی بتا رہی تھی کہ وہ حیران ہے۔

”میں کچھ نہیں سمجھا، میں تو رابعہ کی دادی کی نماز جنازہ میں جا رہا ہوں۔“

”اوہ! اچھا یہاں بھی سبحان صاحب بے حس ہوا ہے۔“ ان کے لہجے میں حیرت کے ساتھ طنز بھی شامل ہو گیا۔

”آپ پہیلیاں بکھو رہے ہیں۔“

”سعدیہ کا باپ مر گیا ہے..... بعد نماز ظہر نماز جنازہ ہے۔“

”اوہ، انا للہ وانا الیہ راجعون۔“ وہ ایک دم افسردہ ہو گئے۔

”وہ بے چاری اب بالکل ہی تباہ پڑ جائے گی مگر ہمیں کیا ہم تو اپنی دنیا میں زندہ ہیں۔“ وہ بولے۔

”میں واپسی پر آپ سے بات کروں گا، لیٹ ہو رہا ہوں۔“ انہوں نے رسٹ وارج پر نظر ڈالی۔

”جی، ضرور جاؤ وہاں سے لیٹ ہو گئے تو۔“ وہ بڑبڑائے۔

”آپ نہیں گئے۔“ انہوں نے غیر ارادی طور پر پوچھ لیا۔

”نہیں، تماشا دیکھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔“ وہ جھلا اٹھے۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو، موت زندگی پر اللہ کا اختیار ہے۔ سعدیہ کے ابا کوئی مرنے والے پہلے آدمی نہیں

ہیں اور اس میں ہمارا کیا دخل ہے۔“ وہ ان کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

”جہاں ہمارا اختیار ہے وہاں بھی تو ہم کچھ نہیں کرتے۔“ ان کا اشارہ ان کے شادی نہ کرنے کی طرف

تھا۔

”نہیں، ہم ہر معاملے میں بے اختیار ہیں۔“ انہوں نے رد کیا۔

”اب اس بچی کا کیا ہوگا؟“ بڑے ابا نے پھر حسب پسند موضوع چھیڑا۔

”جو اللہ کو منظور ہوگا۔“ وہ مختصر اُبو لے۔

”کچھ خیال کرو، ورنہ ہم تمہارے ساتھ کہیں نہیں جائیں گے۔“ بڑے ابا نے آخری ہتھکنڈا اختیار کیا تو

وہ مسکرا دیے۔

”ایک دو روز میں گھر کی رجسٹری ہونے والی ہے، نور دین بابا سے کہیے آپ کی الماریوں کا سامان نکال

کر پیک کرنا شروع کریں۔“ وہ یہ کہتے ہوئے دروازے کی سمت بڑھے تو پشت سے بڑے ابا کی آواز آئی۔

”کان کھول کر سن لو سعدیہ ہمارے ساتھ جائے گی۔“

”جی ہاں! ہم نے مال گاڑی میں جانا ہے۔“ وہ پلٹ کر شگوفہ چھوڑنے سے باز نہ آئے۔

”سن لیا چٹ پٹا جواب.....“ نور دین بابا وہاں آتے ہوئے بولے۔

”مگر ہم اس جواب سے مطمئن ہونے والے نہیں۔“ بڑے ابا نے جواب دیا۔

”چھوڑ دیں سرکار! سعدیہ بیٹا کا بھی اللہ مالک ہے۔“

”کیسے چھوڑ دیں؟“ وہ مدھم آواز میں بولے۔

”ایسے ہی سبحان میاں کو پسند جو نہیں۔“ نور دین بابا خود بھی ان دنوں بہت افسردہ سے تھے۔

”ضروری نہیں کہ جو اسے پسند نہیں ہم وہ سب مان لیں۔“

”مان تو آپ رہے ہیں یہ گھر آپ کو چھوڑنا پڑ رہا ہے، مجھے اس عمر میں یہ گھر چھوڑنا ہے۔“ نور دین بابا کی

آواز میں رقت طاری ہو گئی۔ بڑے ابا کی آنکھوں میں بھی پانی تیرنے لگا۔ کمرے کی چھت درود یوار دیکھنے لگے۔

”نور دین! کیا کریں، سفر وسیلہ ظفر ہے سبحان کے لیے۔“

”جی سرکار! اللہ انہیں خوش رکھے۔“

”تم فکر نہ کرو تمہارا پاسپورٹ ویزا سب کا انتظام کر رکھا ہے سبحان نے۔“

”جی سرکار!“ ان کی بوڑھی آنکھوں میں موتی چمک گئے۔

”ہاں! بالکل سچ مگر کاش ہم میں سے کسی کو بھی جاننا نہ پڑتا۔“ وہ پھر بھی ناخوش سے ہو کر یو لے اور کمرے سے باہر چل دیے۔

☆☆☆

تدفین کے بعد مرد حضرات قبرستان سے واپس آ گئے تھے۔ منہ کے رستے زندگی کی نمود و بقا کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا مگر رابعہ اپنے کمرے میں بیڈ کی پٹی سے سرٹکائے آنسو بہا رہی تھیں۔ سبھی نیناں ان کا موبائل فون لیے آ گئی۔

”مما! ممما!“

”ہوں!“

”آپ کا فون ہے۔“ نیناں نے فون ان کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

”ہیلو!“

”ہیلو!“

”جی۔“ نمبر اور نام کی شناخت کے بعد وہ فقط اتنا بولیں..... نیناں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ فون سنتے ہوئے وہ کچھ بیزاری تھیں..... وہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ ایک دم بولیں۔

”واٹ! یو مین میں نے یو گس چیک دیا۔“ ان کے چہرے پر حیرت کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ نیناں فکر مند سی ہو گئی۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟ خیر میں بینک سے پتا کرتی ہوں۔“ انہوں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تو نیناں ان سے لپٹ گئی۔

”مما، کیا ہوا.....؟“

”کچھ نہیں، کچھ نہیں.....“

”کونسا چیک؟“

”لگتا ہے آپ کے بابا نے گھٹیا حرکت کی ہے، ہمارا جوائنٹ اکاؤنٹ ہے لیکن اس سے چیک کیش نہیں ہوا۔“ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔

”لیکن آپ نے کس کو چیک دیا۔“

”بس ایک چھوٹا سا گھر خریدا ہے۔“ وہ چھپا نہ سکی۔

”واٹ؟“ نیناں چلا اٹھی۔

”کسی کی ضرورت بھی مگر دکھ یہ ہے کہ ریحان اختر نے میری عزت دو ٹکے کی کرا دی۔“ انہیں ایک دم ہی غصہ آ گیا۔

”آپ بابا سے پوچھیں۔“

”ہوں! کیا کیا پوچھوں... خیر آپ آرام کرو، میں ذرا باہر سے ہو کر آتی ہوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں..... وہ باہر نکل رہی تھیں، ریمان ان کے فوراً بعد کمرے میں آ گیا۔

”رہا خالہ کہاں گئی ہیں؟“ اس نے نیناں سے پوچھا۔

”باہر شاید عارفہ خالہ کے پاس۔“

”دراصل سبحان انکل ان سے ملنا چاہ رہے تھے۔“ ٹانگیں پھیلاتے ہوئے ٹھکن سے چور آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے بتایا۔

”رمان!“

”ہوں!“ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

”میرا دل چاہتا ہے کہ ماما کو لے کر کہیں دور چلی جاؤں۔“

”کیا؟ ادھر دیکھو، میرے بھائی، مجھ سے دور۔“ وہ یکدم جذباتی ہو گیا تو وہ ٹپٹا گئی۔

”بابا کی وجہ سے ماما ہرٹ ہوتی ہیں۔“

”نیناں! ان کی پرابلم ہم سولونہیں کر سکتے مگر ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہے یہ عہد کرو۔“ وہ بے قرار ہو کر اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ نگاہیں چارہوئیں اور عہد ہو گیا۔

”نیناں! تمہارے بابا اتنی آسانی سے شاید تمہیں میرے حوالے نہ کریں مگر ہمیں اپنی جنگ لڑنی ہے۔“ غیر ارادی طور پر اس کا نرم ہاتھ تھام کر خدشہ ظاہر کیا تو خوف سے وہ زرو پڑ گئی۔

”پلیز! پلیز رمان مجھے طلال بھائی سے بچالینا۔“

”ارے دھت تیرے کی، وہ موچھل میرا مسئلہ نہیں ہے، مجھے تمہارے بابا کی منطق سمجھ میں نہیں آتی۔“ وہ ماتھا پیٹ کر بولا۔

”بابا! میری مرضی پوچھیں گے تو میں بتا دوں گی۔“

”چلو دیکھتے ہیں۔“ اس نے شرارت سے اس کی ابھی لٹ انگلی پر لیٹی تو وہ سہم کر باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔

☆☆☆

”سس، بس چٹا۔“ اُلی کی چٹنی میں دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی ڈبو کر چسکا لینے پر اماں کی اور زلفی کی توجہ بار بار مدیجہ کی طرف جاتی، اس کے سامنے کتاب کھلی تھی اور دائیں ہاتھ پر پلیٹ میں گھٹی میٹھی چٹنی رکھی تھی۔ اپنی دنیا میں گمن وہ لطف لے رہی تھی۔ اماں زلفی کی شرٹ کے ٹوٹے ہوئے بٹن لگا رہی تھیں۔ جبکہ زلفی چیت چار پائی پر لیٹا آسمان گھور رہا تھا۔ آپا کی یہ تسبیح کا وقت تھا۔

”یہ تو پڑھ رہی ہے یا چٹخارہ لے رہی ہے؟“ اماں نے پوچھا۔

”بس وقت گزر رہی ہے۔“ زلفی نے بھی بیزاری سے کہا۔

”بھائی! میں پیپر کی تیاری کر رہی ہوں۔“ مدیجہ نے جواب دیا۔

”اچھا، اچھا یہ اٹھا کر اندر جاؤ۔“ زلفی نے سخت جھنجھلاہٹ سے کہا۔ اماں نے محسوس کیا کہ زلفی جب سے آیا ہے چپ چپ اور ابھرا الجھا سا ہے۔

”زلفی!“

”زلفی! دوبارہ پکارا۔“

”ہوں، ہاں.....“

”کیا بات ہے..... کچھ پریشان ہو؟“

”نہ، نہیں۔“

”نہیں..... کچھ تو ہے۔“

”کچھ نہیں بس پیسوں کا ہندو بست نہیں ہوا، دوسری طرف مالک مکان نے جلدی کرنے کو کہا ہے۔“

”تو پھر.....؟“ اماں کو تشویش ہوئی اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھیں۔

”ہاتھ تو پکا ڈالا تھا، اب دیکھیں کیا ہوتا ہے؟“

”ارے بچے لڑکی والوں کی طرف جانا ہے انہیں بلانا ہے سب اس نئے گھر کی وجہ سے لٹک رہا ہے۔“

اکبری بیگم بولیں۔

”تو لٹکنے دیں میں کوشش تو کر رہا ہوں۔“ وہ جھنجھلا سا گیا۔

”چلو پھر فکر مند کیوں ہو؟“

”فکر کچھ بھی ہو سکتی ہے، مجھے سوچنے دیں۔“ وہ بیزار سا تھا۔

”سوچنے کی ضرورت کیا ہے؟ ساری عمر اس گھر میں رہے ہیں اب بھی رہ لیں گے۔“ اندر سے آتے ہوئے آپا بولیں۔

”ہونہہ! آپا! کیا کہہ رہی ہیں اس گھر میں یہاں گاڑی بھی نہیں آتی۔“ مدیحہ نے اچانک مداخلت کی۔

”تو نہ آئیں، تمہیں گاڑی کی فکر کیوں ہے؟“ آپا نے تعجب سے اسے دیکھا تو وہ بوکھلائی۔

”آپا! میری پیاری سہیلی نیناں اسی وجہ سے نہیں آتی۔“

”نیناں، نیناں زندگی اسی کے گرد گھوم رہی ہے کیا؟“

”میری ایک ہی سہیلی ہے اور آپ کو کیا معلوم سہیلی کیا ہوتی ہے؟“ مدیحہ اپنی ترنگ میں کہہ گئی۔

”بکومت! مجھے اچھی طرح معلوم ہے سہیلی کیا ہوتی ہے؟“ آپا نے سختی سے کہا اور اٹھنے قدموں کمرے میں چلی گئیں۔ تب مدیحہ کو کچھ احساس ہوا۔

”زبان بے لگام ہو رہی ہے، نظروں سے حیا جا رہی ہے، کیا ہو رہا ہے تمہیں؟“ اکبری بیگم تاؤ کھا گئیں۔

”ایسا کیا، کیا ہے میں نے؟“

”بس چپ رہو اور اندر جا کر پڑھائی کرو۔“ اکبری بیگم نے ٹھیک ٹھاک لٹاڑا تو وہ پیر پٹختے ہوئے کتابیں لیے اندر چلی آئی..... آپا پرانے سے صندوق میں جانے کیا دیکھ رہی تھیں..... اس نے کتابیں میز پر رکھیں اور وہم سے بستر پر گر گئی۔ اسے طلال کو بھی سوچنا اور یاد کرنا تھا۔ وہ سر تا پا اس کے اعصاب پر چھاپکا تھا۔ نیناں کی عدم موجودگی میں ہونے والی ملاقات نے تو سحر پھونک دیا تھا۔ جب سے مل کر آئی تھی دل یہی چاہ رہا تھا کہ ایسی ملاقات روز ہوا کرے..... کتنا غیر متوقع اور حسب آرزو ہوا تھا۔

”مدیحہ!“ آپا نے صندوق بند کرتے ہوئے جانے اس کے چہرے پر کیا دیکھ لیا کہ پکارا۔

”ہوں! جی آپا۔“ وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا اپنی اس آپا سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں ہوتا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ نہ سمجھی۔

”کبھی اس طرح امنگ اور ترنگ میں بند آنکھوں کے ساتھ مسکراتے نہیں دیکھا۔“ آپا برابر آ کر لیٹ گئیں۔

”اللہ قسم آپا میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

”تم میرا سرمایہ ہوشیاریاں لیے فکر مند رہتی ہوں۔“

”ہوا کیا ہے؟“

”کچھ نہیں، کچھ ہونا بھی نہیں چاہیے۔“

”اچھا یہ بتائیں آپ صندوق کیوں کھولے رکھتی ہیں؟“ وہ ان کے گلے میں بانٹیں ڈال کر بولی۔

”اس میں گزری زندگی کے نشانات ہیں، انہیں دیکھتی ہوں۔“

”کیوں، بھائی اور میں آپ کو کتنی بار سمجھا چکے ہیں، مت اداس ہوا کریں۔“

”سب کچھ بھلانا آسان نہیں ہوتا۔“

”جو کچھ ہے ہی نہیں اسے کیا یاد کرنا۔“

”ہاں! سچا تو کچھ نہیں۔“ وہ بڑبڑائیں۔

”آپا! میری اچھی آپا آپ خوش رہا کریں۔“ وہ دلگیر ہو کر بولی تو وہ بھیگی پلکوں کے ساتھ مسکرا دیں۔

”اچھا پہلے اٹھ کر عشا کی نماز پڑھو شاباش.....“ عشا کی نماز کا انہیں خصوصاً یاد کرنا پڑتا تھا وہ بنا کچھ کہے اٹھ بیٹھی۔

☆☆☆

”وقت ظالم ایسے ہی سب کچھ اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔“ صوفی کی پشت سے سرٹکائے رابعہ بھی سوچ رہی تھیں۔ رسم قل کے بعد گھر خالی ہو چکا تھا..... ”یہ اتنا بڑا گھر جسے دادی نے کمال چاہیکہ سستی اور دانشمندی سے سنبھال رکھا تھا اب اسے کون سنبھالے گا؟“ یہ سوال بھی درو بام سے الجھتی نگاہیں کر رہی تھیں مگر فی الحال عارفہ نے جس شکل و تدبیر سے سب معاملات سنبھالے تھے ان سے یہ سوال وہ نہیں کر سکتی تھیں..... البتہ سبجان، دعا کے بعد اندران سے ملنے چلے آئے تو ان سے دل کی بات کہہ دی۔

”رابعہ! یہ دنیا میں رہنے والے سوچتے ہیں، کسی کے ہونے نہ ہونے سے کب فرق پڑتا ہے۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”فرق پڑتا ہے دادی کے بعد یہ گھر دیرانہ لگ رہا ہے۔“

”تو اب تمہیں اپنے گھر جانا چاہیے، کچھ عرصے بعد یہ احساس ماند پڑ جائے گا۔“

”وہ تو پہلے ہی دیرانہ ہے۔“

”بہار، موسم گل تو تم خود ہو، پھر ایسے کیوں سوچتی ہو؟“

”دیکھا تم نے، وہ میرا شوہر اطلاع ملنے پر بھی نہیں آیا۔“

”صد مہ ہے یا افسوس؟“

”شاید کچھ بھی نہیں، سب نے محسوس کیا، میری نیٹاں نے بہت قیل کیا اور تو کچھ نہیں۔“

”چھوڑو سب روٹین کی باتیں ہیں، میں سمجھتا ہوں اس پر کڑھنے سے حاصل۔“ وہ بولے۔

”سبحان! تم نہیں سمجھ سکتے کہ حالات کیا ہیں؟ بس تم نہ جاؤ۔“ بے اختیار ہی وہ بولیں عین اسی لمحے
ریحان اختر نے کمرے میں قدم رکھے اور ان کی بات کا مسکرا کر جواب سبحان کو دیا۔

”ہاں! مت جاؤ کیونکہ انہیں آپ کی ضرورت پڑنے والی ہے۔“ سبحان اچانک پیدا ہونے والی اس
چھوٹیشن پر کھڑے ہو گئے۔

”میرا جانا یا نہ جانا آپ کے مشورے سے مشروط نہیں۔“ سبحان یہ کہہ کر تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔
تب وہ رابعہ کے قریب آ کر بولے۔

”سوری! میری وجہ سے سبحان صاحب چلے گئے۔“

”دوست ایسی باتوں کا برا نہیں مانتے۔“ رابعہ نے بھی برکتہ کہا۔

”ہونہہ! دوست ہی کڑے وقت میں کام بھی آتے ہیں۔“ انہوں نے ذومعنی نگاہوں سے دیکھا۔

”آپ تشریف رکھیے گا یا۔۔۔؟“

”میں سفر سے آ رہا ہوں محض افسوس کے لیے ورنہ ابھی میرا واپسی کا پروگرام نہیں تھا۔“

”کوئی مجبوری نہیں تھی۔“ وہ بولیں۔

”خیر نیٹاں کو بلاؤ اور اجازت دو۔“

”کیا مطلب؟“

”بھئی نیٹاں کو ساتھ لے جانا ہے، آپ تو یہاں رہیں گی، میری بیٹی کے بنا میں کیسے رہ سکتا ہوں۔“

”اسی لیے گھر سے باہر تھے؟“

”نیٹاں تو ساتھ تھی، اس پاس۔“ وہ بڑی ترنگ سے بولے۔

”نیٹاں کو ہلکا سا قبور ہے وہ کل میرے ساتھ آئے گی۔“

”فیور! یقیناً بے آرام ہوگی اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ بضد ہو گئے۔

”سور ہی ہے، اٹھے گی تو رمان چھوڑ آئے گا۔“

”نہیں، رمان میرے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا اس وقت تک کہ وہ اپنا فیصلہ تبدیل کر لے۔“

”کسی کی ذاتی سوچ اور فیصلے پر ہٹ دھرمی کا کوڑا لے کر مت بیٹھیں۔“

”رابعہ بیگم! رمان سے کہہ دو میری بیٹی سے دور رہے اگر مرضی اپنی کرنی ہے تو۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں

بولے۔

”خاموش ہو جائیں یہ موقع فضول باتوں کا نہیں ہے، فوننگی کا گھر ہے۔“ وہ دبے دبے غصے کے ساتھ بولیں۔

”افسوس ہی کرنے آیا ہوں، اب میری نیٹاں کو بلاؤ۔“

”کیا نیناں، نیناں کی تکرار لگا رکھی ہے، وہ غیروں میں نہیں ہے، میری بھی بیٹی ہے۔“ انہیں غصہ آ گیا۔
 ”اپنا بتانے کی شرط یہی ہے کہ رمان کو میری بات ماننی ہوگی، یہ صورت دیگر نیناں کا نام بھی زبان پر نہ لائے۔“ وہ دانستہ اونچی آواز میں بولے، باہر سے گزرتے رمان کے کانوں میں جملہ پہنچا تو وہ اندر گھس آیا۔
 ”ریحان انکل! نیناں پر بہت زعم ہے لے جائیں اسے، رمان احمر میں دم ہوگا، پیار میں طاقت ہوگی تو نیناں صرف رمان احمر کی ہی ہوگی۔“

”شٹ اپ!“ وہ دھاڑے۔
 ”چلانا مجھے بھی آتا ہے لیکن آپ کا احترام کرتا ہوں، آپ کے اشاروں پر ناسمجھ نہیں سکتا۔“ بڑے مؤدب طریقے سے کہا گیا۔
 ”تو کبھی بھول کر بھی میرے گھر مت آنا۔“ انہوں نے وارننگ دی۔

”جانتا ہوں کہ مجھے راستے سے ہٹا کر آپ رابی خالہ کے لیے طلال کی فیور چاہتے ہیں۔“ وہ بولا اور واپس چلا گیا۔

”طلال میری نیناں کے لیے ہر گز نہیں۔“ رابعہ بولیں۔
 ”نیناں کو بلاؤ۔۔۔۔۔“ وہ بولے تو وہ ماحول کی خرابی کا خیال کر کے باہر نکل گئیں۔ اس طرح کی خرابی کا رابعہ کو بخوبی اندازہ تھا اور اسی لیے شاید رمان کو جی جان سے چاہنے کے باوجود نیناں کے حوالے سے ہچکچاتی تھیں۔۔۔۔۔ نیناں پر ان کا اختیار نہیں تھا، ریحان اختر کی شرائط ناممکن نہیں مگر وہ ان کی ذات سے دور رمان کو رکھنا چاہتی تھیں۔۔۔۔۔ ریحان اختر اور طلال کے سائے سے بھی دور۔۔۔۔۔

☆☆☆

چوتھے روز رمان کو آفس جانا تھا۔ وہ گھر آیا۔۔۔۔۔ گاڑی کی آواز پر دعائے دے بے قدموں گیٹ کا رخ کیا۔
 گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وہ گیٹ بند کرنے کے لیے پلٹا تو دعا اندر کا دروازہ کھول کے آچکی تھی۔
 ”ہائے ڈیڑا“ وہ مسکرا کر بولا تو وہ خوش ہو گئی۔

”مامی نہیں آئیں۔“
 ”نہیں، چہلم تک تو وہیں رہیں گی پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے؟“ وہ اندر کے داخلی دروازے کو کھول کر آگے آگے چلنے لگا۔

”کیا مطلب؟“
 ”سنو! لیے لوگوں کا المیہ ہوتا ہے کہ ان کی عقل گھٹنوں سے کھسک جاتی ہے اس لیے یہ مطلب و مطلب مت پوچھا کرو۔“ وہ شرارت سے باز نہ آیا۔
 ”رمان!“ وہ جھکی۔

”چلو جاؤ، میں نے کچھ دیر سونا ہے پھر صبح آفس جانا ہے۔“
 ”فجر کی نماز ہو گئی، سونے کے بعد جاگو گے کب؟“
 ”تو۔۔۔۔۔؟“

”تو یہ کہ تیار ہو جاؤ، میں ناشتا بنا دیتی ہوں۔“
 ”ہوں! کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو، چلو پھر شرٹ اسٹری کرو، میں شاور لے کر آتا ہوں۔“ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ متفق ہو کر ایڑیوں کے بل گھو گیا۔۔۔۔۔ وہ خوش ہو گئی۔
 کچھ ہی دیر میں اپنی پسند سے سافٹ پنک وائٹ لائن والی شرٹ۔۔۔ اسٹری کر کے پیٹک کی۔۔۔ فریج کھولا، فریزر سے شامی کیا ب نکالے، دودھ، مکھن جام نکال کر ٹرے میں رکھا۔۔۔۔۔ ٹوسٹر آن کیا۔۔۔۔۔ جس وقت چائے کپ میں ڈال رہی تھی وہ گیلے بال تو لسیا سے خشک کرنا ہوں وہیں آ گیا۔ گیلے بدن سے صابن اور بالوں سے اٹھتی شیمپو کی مہک پر پلٹی تو وہ اس کی پشت پر کھڑا تھا۔۔۔۔۔ ایک دم دل میں کھلبلی سی مچ گئی۔
 ”یار! خوش نصیب ہو گا وہ سالہا جس کو تم جیسی بیوی ملے گی۔“ اس نے شرارت آمیز جملہ اچھا لالہ تو اس کے چہرے کے گلاب مرجھا گئے۔

”خوش نصیب تو وہ ہوتا ہے جسے پیا چاہے۔“
 ”میری دعا ہے کہ وہ تمہیں ٹوٹ کر چاہے۔“ خلوص دل سے اس نے دعا دی۔
 ”اپنے پاس رکھو دعائیں، میرے غم کو خوشی مت کہو، میں کبھی تمہیں یہ دعا نہیں دوں گی کہ نیناں تمہیں ٹوٹ کر چاہے۔“

”پلیز! دعا کچھ اور مت کہنا۔“ فوری طور پر اس میں غیر متوقع تبدیلی آئی اور وہ تولیا وہیں کرسی پر بیٹھ کر باہر نکل گیا۔ نیناں کے حوالے سے تو جو کچھ ریحان انکل نے کہہ دیا تھا اس وجہ سے سخت متفکر تھا گو کہ ابھی سوچنے کا وقت نہیں ملا تھا۔۔۔۔۔ جاتی ہوئی نیناں کو بھی دائیں آنکھ دبا کر رخصت کیا تھا، یہ ظاہر ہونے نہیں دیا تھا کہ اس کے بابا نے کیسا ظالمانہ، غیر مہذب فیصلہ سنایا ہے۔ وہ سستی تو رونے لگتی کیونکہ وہ بھی تو اس کی محبت میں سرتاپا ڈوبی ہوئی تھی۔ ناشتا و اشتا بھول کر بستر پر گر سا گیا۔ دماغ میں جیسے پن چکی چلنے لگی۔
 ”کیا ہوا؟ نیناں تمہارے لیے وجہ پریشانی تو نہیں۔۔۔۔۔“ ناشتے کی ٹرے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے دعائے کر پدا۔

”نیناں تو میرے ہونے کا احساس ہے، پریشانی کس بات کی؟“ وہ اس کو دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”میں جانتی ہوں۔“ وہ جانے کے لیے مڑی تو اسے یاد آیا۔
 ”امی کے کپڑے الماری سے نکال کر رکھنا، شام کو لے کر جانے ہیں۔“
 ”اچھا!“ وہ سپاٹ سے انداز میں کہہ کر باہر نکل گئی اور وہ پھر نیناں کے بلے میں سوچنے لگا۔
 ”رمان احمر! ریحان انکل تمہیں آزما رہے ہیں یا ستارے ہیں؟“ خود سے پوچھا۔
 ”رابی خالہ ٹھیک کہتی ہیں، ریحان انکل کی سوچ سچی ہے۔“ جواب اندر سے آیا تو ہونٹ چبانے لگا۔
 ”اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ ریحان انکل کو نیناں کی پسند کا اندازہ ہے اور اس لیے اسے ٹھٹ ٹانم دینے کی کوشش کی ہے، طلال کے ہوتے وہ بھلا میرے لیے کیسے چاہیں گے؟ کچھ بھی ہوا اپنی ہستی کا احساس ضروری ہے، میں کیوں ان کا غلام بنوں۔۔۔۔۔؟“ سختی سے خود کو جواب دے کر وہ مطمئن ہو گیا اور اٹھ کر ناشتا کرنے لگا لیکن نیناں ایک دم سامنے آ بیٹھی اس کا چہرہ اتر ا ہوا تھا، آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، لبوں پر سوال تھا۔

”زمان! کیا تم صرف اپنی ہستی کا احساس ضروری سمجھتے ہو؟“ وہ مضطرب ہو کر ہونٹ چبانے لگا۔

”میں تمہاری ہستی کا جواب نہیں.....؟“ اس نے گویا دوسرا سوال کر دیا۔ تب وہ تڑپ اٹھا۔

”نیناں! نیناں! تم میری ذات کا احساس ہو مگر تمہارے بابا مجھے کیوں تم سے جدا کرنا چاہتے

ہیں.....؟“ وہ بولا..... لیکن جواب نہیں آیا تو سر کے بال مٹھیوں میں جکڑ کر بیڈ پر ہی گر گیا..... محبت میں اضطراب کا دور تو شاید اب شروع ہوا تھا۔

☆☆☆

”تمہاری توجہ کہاں ہے مائی ڈیز.....؟“ نیناں دیکھ رہی تھی کہ مدیحہ بے گل سی بار بار دروازے کی طرف

دیکھ رہی ہے، وہ پوچھ بیٹھی۔

”کہیں نہیں، کیوں؟“ مدیحہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”طلال بھائی نے کوئی بد تمیزی تو نہیں کی تھی۔“ نیناں نے لپ ٹاپ پر نظریں جمائے پوچھا۔

اسے فیضو نے گھر آتے ہی بتا دیا تھا کہ مدیحہ بی بی آئی تھیں اور طلال صاحب کے کمرے میں ہی بیٹھی تھیں۔

”وہ، نہ نہیں تو، کیوں.....؟“ مدیحہ کا رنگ فق ہو گیا۔

”کیونکہ وہ بد تمیزی کر سکتے ہیں۔“

”نہیں، میرا خیال ہے وہ بہت نائس ہیں۔“

”وہ ایسے احتیاط کرنا، مجھے الزام نہ دینا۔“ نیناں نے انتہائی نرمی سے کہا۔

”نیناں! تمہیں اپنے کزن رمان سے محبت ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ طلال صاحب کو برا سمجھو۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو، میں نے پیدائش سے اب تک طلال بھائی کے ساتھ گزارا ہے ان میں ظاہری دلکشی

کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔“

”لیکن وہ تو شاید تمہیں پسند کرتے ہیں۔“

”ہوں..... شاید.....“ وہ ٹال گئی۔

”اور تم رمان بھائی کو پسند کرتی ہو۔“

”یہ چھوٹا لفظ ہے، رمان کے لیے میرے جذبات تم نہیں سمجھ سکتیں۔“

”آئی سے افسوس کرنا تھا۔“ مدیحہ کو یاد آیا۔

”ابھی آئی نہیں، آج آجائیں گی۔“

”نیناں! نیناں!“ بوا آواز دیتی اسی طرف آگئیں۔

”جی۔“

”ریحان میاں بلا رہے ہیں۔“

”خیریت.....؟“

”پتا نہیں.....“

”اچھا آپ چلیں میں آتی ہوں۔“

”بس جلدی مل لو.....“ بوا یہ کہہ کر گئیں تو اس نے مدیحہ کو پریشانی کے لیے کچھ کام دیا اور باہر چلی گئی.....

چند لمحے گزرے تھے کہ اس کے کندھوں پر مضبوط ہاتھ رکھے گئے تو وہ ڈر کر اچھل پڑی۔

”ارے، آپ تو نیناں سے زیادہ ڈر پوک ہو۔“ طلال نے ہنس کر کہا۔ وہ طلال کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔

”آپ گھر میں تھے؟“

”کیوں، آپ نے مجھے تلاش کیا تھا؟“

”نہیں، نیناں کی موجودگی میں یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔“ وہ شرما کر بولی۔ وہ قریب ہو کر اس کا دوپٹا تھام کر

پیار سے بولا۔

”نیناں سے ڈرنے کی ضرورت کیا ہے؟“ وہ اور شرمائی۔

”مجھے کام کرنا ہے، آپ پلیز جائیں۔“

”تو آپ دل سے کہہ رہی ہو۔“

”اچھا نہیں لگتا.....“

”مجھ سے ملنا یا یہاں ملنا.....“

”بس نیناں کو اچھا نہیں لگے گا۔“ اس نے نظریں چراگئیں۔

”یہ لو، یہ میرا کارڈ ہے، جب ملنا چاہو تو میرے نمبر پر رابطہ کر لینا۔“ طلال نے اپنے والٹ سے وزیٹنگ

کارڈ نکال کر اسے دیا جسے مدیحہ نے چیل کی طرح جھپٹ کر پرس میں رکھ لیا۔ طلال سیٹی بجاتا ہوا باہر چلا گیا تو

اس نے اپنے حواس بحال کیے..... دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، پیشانی پر پسینہ آ گیا تھا..... دوپٹے سے چہرہ

صاف کرتے ہوئے نظریں نیناں کی خوب صورت فوٹو پر پڑیں تو وہ کھوسی گئی۔ نیناں کے حسین بے مثال کے

سامنے بھلا اس کی کیا حیثیت تھی؟ طلال کا یوں دلچسپی لینا اسے خوش بھی میں مبتلا کر گیا..... حالانکہ اسے طلال کو

سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ حسین نیناں کی موجودگی کے باوجود وہ اس جیسی ساتویں عام سی شکل صورت والی

مدیحہ میں کیوں دلچسپی لے رہا تھا..... لیکن دل کے معاملات ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔

☆☆☆

”پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں بڑی بڑی رقموں کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے؟“ واش روم سے پہنچ کر کے

رابعہ ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے آئیں تو بیڈ پر لیٹے ریحان اختر نے پہلا سوال کیا..... انہوں نے کچھ توقف

اختیار کیا۔

”رابعہ بیگم جوائنٹ اکاؤنٹ کا مطلب یہ نہیں ہوتا۔“ وہ سمجھ گئی کہ وہ کیا کہنا اور پوچھنا چاہ رہے ہیں۔

”چلیں آپ نے مطلب سمجھا دیا، اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے؟“

”مرد کرنے پر آئے تو بہت کچھ کر سکتا ہے، مجھ سے مانگ لیا ہوتا۔“

”اپنا حصہ لینا جرم نہیں۔“

”وہ بتا کر لیا جاتا تو ٹھیک ہوتا۔“

”بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔“

کیا کیا سب منظر چھوڑ ڈالے
”ریحان اختر!“

”یوا! چپ رہیں، خاموش رہیں۔۔۔۔۔“ وہ پتزارے ہو گئے۔

”ٹھیک ہے جاؤ مگر فرصت نکال کر سوچ لینا، تمہاری ضد کو شکست دے ہونیاں بہت خدٰی ہو چکی ہے..... تم پر گئی ہے..... دو بندوں کی ضد کے نتیجے میں کچھ نہیں بچتا۔“ وہ بولتی رہیں اور وہ سنتے رہے۔

”محبت میں نتیجے کی فکر نہیں کرتے۔“

”تو میناں کو بھی محبت ہے رمان سے۔“

”آپ نہیں سمجھ سکتیں، رمان میری ضد بن گیا ہے.....“ وہ یہ کہہ کر دوبارہ بیٹھ گئے۔

”جاؤ گھرے میں، رابعہ، نیناں کے پاس سے واپس کمرے میں جا چکی ہوگی۔“

”آپ پلیرز کچھ نہیں جانتیں، بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”بھول ہے تمہاری، کانٹے بھی پھول نہیں بنتے، راجا صاحب کو بی بی یہ کہتے کہتے قبر میں اتر گئیں مگر وہ کانٹے، پھول سمجھ کر جمع کرتے رہے۔۔۔۔۔ تم نے بھی یہی کیا۔“

کانٹے، پھول سمجھ کر جمع کرتے رہے۔۔۔۔۔ تم نے بھی یہی کیا۔“

”اچھا بس! زبان بند کر لیں۔“ وہ کچھ جھنجھلائے اور شکمن آلود پیشانی کے ساتھ باہر نکلے..... تیناں کے کمرے کی لائٹ آف تھی، دروازہ بند تھا..... وہ سمجھ گئے کہ رابعہ کمرے میں ہیں..... دل مضطرب نے رخ بدلا اور فی وی لاؤنچ میں صوفے پر تیم دراز ہو کر سوچ بچار کرنے لگے..... سکون جیسے کہیں چلا گیا تھا، اٹھ کر بیٹھ گئے..... ذہنی دباؤ نے سر درد کی شکل اختیار کر لی تو بے اختیار ہو کر قیضو کو آوازیں دینے لگے..... وہ تو اپنے سرونٹ کو ارڈر میں سویا ہوا تھا۔

”کیا چاہیے ریحان.....؟“ رابعہ نے آکر پوچھا۔

”ک..... کچھ نہیں، بس چائے کے لیے فیضونگوارہا تھا؟“

”بوانے ایسا کیا کہ دیا کہ چائے کی ضرورت پڑ گئی..... پھر رابعہ نے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”اپنا کام کرو۔“ وہ اپنی مخصوص ٹون میں آگئے۔

”مجھے میرا کام کرنے تو دیا کریں۔“

”پلیز جاؤ، جا کر سو جاؤ۔۔۔۔۔“ وہ چلائے۔

”ہمش دھیرج، بیٹی سوچکی ہے، پہلی بار اس روپ میں دیکھا ہے، بیوی ہونے کے ناتے پوچھا.....“ وہ بہت آہستہ آواز میں بولیں۔

ہے.....“ وہ بہت آہستہ آواز میں بولیں۔

”ہونہر، بیوی، کسی کی معشوق، کسی کی محبوب۔“ وہ یہ بڑبڑاتے ہوئے خود ہی اٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔۔۔۔۔ رابعہ بڑی دیر بیٹھی رہیں پھر خود بھی انھیں اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کمرے میں آگئیں۔۔۔۔۔ ریحان بظاہر بستر پر تھے مگر نیند ان سے کوسوں دور جا چکی تھی، پوری کھلی آنکھوں سے چھت کو گھور رہے تھے۔۔۔۔۔ رابعہ کو تعجب ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ کیا بات ہوئی جو ریحان اس قدر اچھے اچھے سے ہیں، اس وقت بوا کے کمرے میں گئے اور بوائے کیا کہہ دیا کہ اپ سیٹ ہو گئے۔۔۔۔۔ مگر ان سے یہ سب پوچھنا بیکار تھا۔۔۔۔۔ اپنے

محبت تو ایسی طاقت ہے جو دل و دماغ میں اتر جائے تو پھر جسم و جاں کو اپنے قبضے میں لے لیتی ہے..... غیباں پر کچھ اثر نہیں ہوا نہ وہ اثر لینا چاہتی تھی، رمان کو سب کچھ بتا کر جو دلی خوشی اور سکون ملا تھا اس کا مزہ پہلی بار چکھا تھا، اسے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ رمان کو اس قدر چاہتی ہے، بابا کے حکم کے بعد بھی اس سے بات کرتے ہوئے قطعاً کوئی خوف محسوس نہیں ہوا، اس کی اس جرأت پر رمان فون کالوں سے لگائے جھوم رہا تھا..... دو دلوں کے جذبات پہلی بار ڈائریکٹ ڈائل ہوئے تھے..... رمان کی مطمئن طبیعت پر چھائی اضطرابی پرچھائیاں معدوم ہو گئیں..... محبوب ساتھ دینے کا عہد کرے تو پھر اور کیا چاہیے؟ محبت کے لیے محبوب کی چاہت اور پیان ہی کی تو ضرورت ہوتی ہے۔

☆☆☆

”ریحان اختر!“ دائیں کندھے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر کہا گیا۔

”ہوں ہاں۔“ وہ گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھے۔

”میرے کمرے میں آؤ.....“ بڑے دھیمے مگر قوی لہجے میں حکم دے کر وہ کمرے سے باہر نکل گئیں.....
ریحان اختر نے آنکھیں ملیں، دائیں ہاتھ بیڈ پر دیکھا، رابعہ وہاں نہیں تھیں..... گھڑی ال پر نگاہ ڈالی اور پھر جمائی
لے کر پوری سعادت مندی کا ثبوت دینے کے لیے سلپر پیروں میں ڈال کر باہر نکل آئے..... بوائے انہیں
دیکھ کر جیسے کرسی کی پشت سے سرٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

”ہو! میں کیا سمجھوں؟“ وہ دھیرے سے برابر والی کرسی پر ٹک گئے۔

”پُرانی دیوار پر اب نئی کیل ٹھونکنے کی جگہ نہیں رہی..... سمجھدار ہو اس وقت میرے پاس یوں بیٹھا دیکھ کر کوئی بھی آسانی سے بہت کچھ سمجھ سکتا ہے۔“ ریحان اختر کے بت سے نکلا وہ سچ مچ نیا آدمی تھا جو سسلپنگ سوٹ میں بے ترتیب بالوں کے ساتھ گھر کی پرانی ضعیف ملازمہ کے پاس بیٹھا تھا۔

”ایسا کیا ہو گیا کہ آپ کو یوں سمجھانے کی ضرورت پڑ گئی.....؟“

”ایسا کیا ہو گیا کہ آپ کو یوں سمجھانے کی ضرورت پڑ گئی.....؟“

”ریحان اختر! میری بوڑھی آنکھیں اور کچھ نہیں دیکھ سکتیں..... مجھ سے میری وفاداری کا اور امتحان نہ لو، میں نے اپنی بی بی کے ساتھ کیے ہر عہد کو نبھایا ہے مگر اب بس کرو..... یہ وفاداری گناہ گاری میں بدل گئی ہے۔“

”ہو!! آپ نے تو کچھ نہیں کیا.....؟“ وہ بولے۔

”بوا! آپ نے تو کچھ نہیں کیا.....؟“ وہ پوچھے۔

”کرتے ہوئے تو دیکھا ہے، وفاداری نبھانے کے لیے چشم پوشی کی ہے، جھوٹ بولے ہیں۔“ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”بہو! سب ٹھیک ہونے والا ہے، سب میں نے کیا ہے؟ میں ہی اقرار کروں گا۔“ وہ بولے۔

”نہیں، سب کیا دھرا اس کلینک کا ہے، تم نے بہت برا کیا ہے وہ کسی طرح بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ بس اپنی بیٹی کو بچالو، اس کو ضدی نہ بناؤ۔“

اپنی بیٹی کو بچالو، اس کو ضدی نہ بناؤ۔“

”کیا، کیا ہے نینا! نے؟“ وہ یکدم پریشان ہو گئے۔

”ابھی تک کچھ نہیں مگر وہ بھی ویسا کر سکتی ہے جیسا پہلے اس گھر میں ہو چکا ہے، یہ گھر برباد نہ کرو ریحان، ہم ہاتھ جوڑتے ہیں۔“ یوانے دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے، وہ بے کل ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے، یوانے

222 ماہنامہ یاکیزہ — جنوری 2012ء

انداز سے سمجھا کہ بوانے طلال کی بدتمیزی کی بات کی ہوگی، ریحان اپنی بیٹی کی وجہ سے فکر مند ہو گئے ہیں۔ بس یہی سوچتے سوچتے وہ بستر پر آ گئیں..... لیکن یہ فیصلہ کر لیا کہ بوا سے پوچھ کر دم لیں گی۔

☆☆☆

تہجد کی نماز پڑھ کر عارفہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگیں تو رمان کے کمرے کی لائٹ آن دیکھ کر ٹھٹھکیں..... چند لمحوں کے بعد رکیں اور پھر کمرے کی طرف آ گئیں، رمان کو انہوں نے اپنے پاس ہی روک لیا، کچھ ضروری معاملات پر بات کرنی تھی..... مگر وہ اتنی رات تک جاگ رہا ہے یہ فکر انگیز بات تھی۔

”رمان! ابھی تک جاگ رہے ہو؟“

”وہ، امی! نیند نہیں آرہی.....“ وہ لانا میں کھلنے والی کھڑکی سے ہٹ کر بولا۔

”وجہ؟“

”امی! اینٹاں کے فون نے مجھے ڈسٹرب کر دیا ہے۔“

”کیا ہوا، خیریت.....؟“ وہ بھی پریشان ہو گئیں۔

”وہ رورہی تھی، ریحان انکل نے مجھ سے ملنے پر پابندی لگا دی ہے۔“

”ارے کیوں بھی.....؟“ انہیں حیرت ہوئی۔

”وہی وجہ ہے یقیناً.....“

”تو اس میں برائی کیا ہے؟ کوئی بات نہیں کام کرنے میں عار کیا ہے؟“ وہ سمجھ کر بولیں۔

”کمال ہے عار ان کے ساتھ کام کرنے میں ہے، جو اتنی سی بات ضد بنا لے اس کے ساتھ کام کیسے کیا جاسکتا ہے؟“

”تو پھر اس کو اینٹاں کے لیے راضی کیسے کیا جاسکتا ہے؟“

”ان کی گیم ہے، طلال کے لیے راستہ ہموار کر رہے ہیں۔“ وہ یقینی طور پر بولا۔

”یہ کوئی اچھی بات نہیں میں رابعہ سے بات کروں گی۔“

”کوئی فائدہ نہیں، وہ تو خود وہاں اجنبی ہیں۔“

”یہی تو دکھ ہے کہ میری پیاری بہن ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہی ہے۔“ عارفہ گہرے تاسف کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”مجھے اینٹاں کی فکر ہے وہ بہت ڈسٹرب ہے۔“

”نینٹاں میں ریحان کی جان ہے وہ جلد مان جائیں گے۔“

”رابی خالہ کی الماری میں اب تک سحان انکل کے تحائف، گریٹنگ کارڈز، خشک پھول محفوظ ہیں،

جانے اس شدت کے باوجود ریحان انکل کے لیے فیصلہ کیوں کیا گیا؟“

”ہوتا ہے، ایسا بھی دھوکا ہو جاتا ہے۔“

”خیر، آپ سو جائیں۔“

”آپ کی طاہرہ بیچو کا فون آیا تھا کہ کل کوئی فیملی دعا کو دیکھنے آرہی ہے۔“

”آپ نے جب جانا ہوتا دیکھیے گا، میں لے جاؤں گا۔“

”نہیں یہاں ڈرائیور اور گاڑی موجود ہیں، مسئلہ کچھ اور ہے۔“ وہ رکیں۔

”کیا مسئلہ.....؟“

”دادی جو معاملات دیکھتی تھیں وہ اب کون دیکھے گا؟ یہ اتنی بڑی کوٹھی خالی تو نہیں چھوڑی جاسکتی.....

ہمارا میکا ہے یہ اس کی پروپر دیکھ بھال کیسے ہوگی؟“

”آپ فکر مند نہ ہوں، منیجر وغیرہ بڑی امی کو آکر حساب کتاب دیتے تھے اب آپ یا میں دیکھ لوں

گا..... باقی یہاں گلو ہے آدھا پورشن کرایے پر دیا جاسکتا ہے۔“ وہ بڑی آسانی سے تجویز دے کر ان کی طرف

دیکھنے لگا۔

”چلو، دیکھتے ہیں، رابعہ سے بھی بات ہوگی۔“

”اب جائیں اور سو جائیں۔“

”مگر.....“ وہ کچھ جھجک سی رہی تھیں۔

”مگر کیا.....؟“

”دعا اچھی لڑکی ہے۔“

”کوئی شک نہیں.....“

”نینٹاں کے لیے ایک ہزار لوگ آجائیں گے مگر دعا کو تم سے بہتر کوئی نہیں رکھ سکتا۔“ بالآخر دل کی بات

زبان پر آ گئی۔

”یہ غلط خیال ہے آپ کا، دعا میری دوست ہے، میری بہن ہے، میں اس کے لیے ایسا سوچتا بھی نہیں۔“

”اور نینٹاں کے لیے ریحان راضی نہ ہوئے تو.....؟“

”کوئی بات نہیں، پھر بھی دل اور دماغ سے کوئی اسے نکال نہیں سکتا.....“ عارفہ نے بے بسی سے بیٹھے کو

دیکھا اور پھر کچھ دیر مزید بیٹھنے کے بعد وہاں سے اٹھ آئیں۔

☆☆☆

بار بار ذوالفقار کے فون آنے پر رابعہ کو کچھ دیر کے لیے باہر جانے کی تیاری کرنی پڑی..... حالانکہ ریحان

کو موسم کی تبدیلی کے باعث شدید فلو ہو گیا تھا، وہ آج آفس بھی نہیں گئے تھے..... وہ خاموشی سے گاڑی نکال

لائی تھیں۔

سپریم کافی باؤس میں ذوالفقار پہلے سے موجود تھا..... وہ سامنے آکر بیٹھ گئیں تو اسے تعجب سا ہوا، وہ

تیاری میں بھی کچھ الجھی الجھی سی تھیں۔

”خیریت.....؟“

”ہوں، آپ سناؤ خیریت ہے نا.....؟“ انہوں نے سادگی سے پوچھا۔

”آپ ڈسٹرب ہیں۔“

”شاید، بس کچھ معاملات ایسے ہیں گھر میں جو الجھا رہے ہیں۔“

”اسی لیے تو آپ کو کہا تھا کہ پیار کا کوئی اور گھر بنا لیجیے۔“ وہ عالم شوق میں بہک سا گیا جبکہ وہ چونکیں اور سنجیدگی سے بولیں۔

”ذوالفقار! میری بیٹی کی موجودگی کا خیال رکھا کرو۔“

”سوری! میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کو خوش و خرم رہنا چاہیے، اس کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“
”نہیں، شکریہ، میں شرمندہ ہوں کہ آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔“ وہ نظریں جھکا کر وضاحت کرنے لگیں تو ذوالفقار کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

”اوہ! میرا کیا بنے گا؟“

”سوری! میرے پرسنل اکاؤنٹ میں اتنی بڑی رقم نہیں، اگر کچھ مہلت آپ مالک مکان سے لے لیں تو کوشش کر سکتی ہوں۔“

”نہیں، دراصل مالک مکان کو ملک سے باہر جانا ہے اسے جلدی ہے۔“ وہ افسردہ سا ہو کر بولا۔

”یہ تو مسئلہ ہے لیکن فی الوقت میں کچھ نہیں کر سکتی۔“ انہوں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ تو وہ کافی کا آڈروے کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

”رابعہ جی! اس طرح تو میرا ایڈوانس ڈوب جائے گا۔“ وہ بہت پریشانی طاری کرتے ہوئے بولا۔

”مگر ذوالفقار! مجھے نہیں لگتا کہ میں فوری طور پر پیسوں کا بندوبست کر سکوں گی۔“

”اگر مسز راجا ریحان بے بس ہیں تو کیا کہا جاسکتا ہے؟“ بڑے مٹھاس بھرے لہجے میں طنز کا سہارا لیا گیا جو انہیں نشتر کے مانند لگا۔

”کاش! میں مسز راجا ریحان نہ ہوتی۔“

”سوری! آپ اداس نہ ہوں، الجھن کیا ہے۔“ یکدم ہی وہ سارے زمانے سے بڑھ کر ہمدرد ہو گیا۔

”آپ کے بار بار فون کرنے کی وجہ سے مجھے آنا پڑا اور نہ میں بہت ڈسٹرب تھی۔“

”بتائیں تو۔۔۔۔۔؟“

”بس کچھ اور نہیں، ازدواجی زندگی بالکل الٹ پلٹ گئی ہے، وہ گھر نہیں مہمان سرائے ہے، نہ اپنے لیے محبت پاسکی اور نہ بیٹی کو دلا سکتی ہوں۔“ وہ بے حد مخموں سی ہو گئیں۔۔۔۔۔ رات کے واقعے کا ذہن پر گہرا اثر تھا۔

”پلیز! میرے سامنے بیٹھ کر یوں رنجیدہ نہ ہوں، میں آپ کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔ میں آپ کو وہ سب دے سکتا ہوں جو آپ کو نہیں ملا۔“ وہ جذباتی سا ہو گیا۔

”کاش! ان سب باتوں کا وقت ہوتا۔“

”وقت کو کچھ نہیں ہوا، میرا ہاتھ تھام لیں۔۔۔۔۔ پھر دیکھیں دنیا کیسے بدلتی ہے؟“ بڑی ہمت سے اس نے رابعہ کا دایاں ہاتھ تھام لیا۔۔۔۔۔ جسے انہوں نے جلدی سے آزاد کرایا۔

”کیسی باتیں کرتے ہو؟ یہ سب باتیں ریحان سے میں سن چکی ہوں۔“

”میرا اعتبار کریں، آپ کو سچے پیار کی ضرورت ہے۔“

”پلیز! تھی اب نہیں رہی، نیناں کو یاد رکھا کرو۔“ وہ خاصے جنوں خیز لمحات سے گزر کر جھٹکے سے انھیں اور جانے سے پہلے بولیں۔

”ذوالفقار! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مدد نہیں کر سکتی، تاہم کوشش کروں گی، پلیز۔“ وہ چلی گئیں۔۔۔۔۔ اور وہ اپنے مقصد میں ناکامی کے باعث غم و غصے سے کھول اٹھا۔

☆☆☆

ظہورہ بی بی لڑکے والوں کو اصرار کر کے آخر کو لے ہی آئی تھی۔ طاہرہ بیگم کو بڑی اطمینان بھری خوشی محسوس ہو رہی تھی، صبح سے ہی انہیں مہمانوں کی آمد کا انتظار تھا۔ گھر کے کونے کونے کی ملازمہ کی مدد سے خود صفائی کرائی تھی، ہر شے اجلی، اجلی اور شفاف لگ رہی تھی، لباس تبدیل کر کے کچن کا رخ کیا تو دعا کو خاموش اور کھویا کھویا سا دیکھ کر پہلے کچھ کہنا چاہا مگر کچھ سوچ کر خوش دلی سے بولیں۔

”دعا! چندا کپڑے تبدیل کر کے بالوں کو کھلا چھوڑ دینا، ہاں کا جل ضرور لگا لینا۔“

”اور کچھ۔۔۔۔۔“ بڑا مختصر اور منتشر سا جواب آیا۔

”اور یہ کہ مہمان آچکے ہیں جلدی سے آ کر فریال تیار کرو۔“ وہ بولیں۔

”مامی آگئیں۔۔۔۔۔؟“ غیر متوقع سوال تھا۔

”یہ سوال کہاں سے آگیا۔۔۔۔۔؟“

”بتائیں۔۔۔۔۔“

”ہاں! کچھ دیر پہلے آئی ہیں۔“

”اور رہا۔۔۔۔۔“

”دعا! رہا مان کو میں نے سمو سے اور کیک لانے کے لیے بھیجا ہے۔“ طاہرہ بیگم اسے اطلاع کی صورت بتا کر باہر چلی گئیں، دعا جانتی تھی کہ وہ اس کے سوالوں سے کتر رہی ہیں اور یہ سچ بھی تھا، آنکھیں بھر آئیں، پلو سے رگڑیں اور پہلی بار مہمانوں کے لیے تیار ہونے کی غرض سے اپنے کمرے کا رخ کیا۔۔۔۔۔ اماں جان نے اس کے لیے اور فنج کلر کا گرتہ اور شلوار منتخب کر کے رکھا تھا، بقول ان کے وہ اس پر خوب سجتا تھا ماں کی فکر مندی پر ہولے سے مسکرائی اور کپڑے لیے واش روم میں چلی گئی۔

ڈرائنگ روم کے نیم وادروازے سے جھانکا تو بالکل سامنے ظہورہ بی بی ہی دکھائی دیں۔

”ارے آؤ دعا بیٹی، آ جاؤ۔۔۔۔۔“ بی بی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔۔۔۔۔ سو بلا لیا۔ وہ سر پر دوپٹا ٹھیک سے جما کر اندر داخل ہوئی۔

”السلام علیکم!“ دھیرے سے سلام کیا تو سب کی ملی جلی آواز میں جواب آیا۔ اس نے بی بی کے اشارے کو سمجھ کر دو مہمان خواتین کے درمیان بیٹھنا تھا۔۔۔۔۔ اس کی ہچکچاہٹ محسوس کر کے عارفہ اور مہمان خواتین ایک ساتھ بولیں۔

”ارے بیٹا بیٹھو!“ وہ کسمسا کر درمیان میں بیٹھ گئی۔

”ماشاء اللہ! بہت دراز قامت بیٹی ہے۔“ ایک خاتون نے اس کے لمبے قد کو سراہا۔

”ارے اکبری بہن! صرف قدر ہی کو نہ دیکھو، آنکھ، ناک، بال سب خوب صورت ہیں۔“ بی بی نے اپنی چرب زبان کا استعمال کیا۔

”ہاں جی! ماشاء اللہ بہت پیاری بیٹی ہے۔“ اکبری بیگم نے جواب دیا۔

”ہمارا بیٹا بھی بہت حسین ہے۔“ دوسری خاتون نے ضروری سمجھا کر لڑکے کے نمبر بھی بڑھائے جائیں۔

”سچ کہہ رہی ہیں آپ، جوڑی خوب سجے گی۔“ بی بی نے لقمہ دیا۔

”جاؤ بیٹا دعا چائے کی ٹرائی لے آؤ۔۔۔۔۔“ عارفہ نے دعا کے چہرے پر پھیلی بے چینی بھانپ کر کہا، وہ تو منتظر تھی تیزی سے اٹھی اور چلی گئی۔

”بس اب منہ میٹھا کرادو اکبری بہن۔“ بی بی نے کہا۔

”بی بی پہلے تعارف تو کرا دیجیے۔“ عارفہ نے یاد دلایا۔۔۔۔۔ تو بی بی شرمندہ سی ہو گئی، جو کام سب سے پہلے کرانا تھا وہ بعد کرانا پڑا۔

”بس یادداشت اب ایسی ہی رہ گئی، یہ لڑکے کی اماں ہیں اکبری بیگم اور یہ رشتے میں لڑکے کی پھوپھی ہیں، سب انہیں آپا ہی کہتے ہیں۔۔۔۔۔ اور یہ لڑکی کی ماما ہیں اور یہ ماں ہیں۔“ بی بی نے تعارف مکمل کراتے ہوئے آخر میں عارفہ اور طاہرہ کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ لوگ بہت اچھے لگے ہیں، بس جلد ہم نئے گھر میں چلے جائیں گے تو آپ کو دعوت دیں گے۔۔۔۔۔ فی الحال ہمیں لڑکی پسند آگئی ہے۔۔۔۔۔“ اکبری بیگم نے کہا، طاہرہ کھل اٹھیں، خوشی سے عارفہ کی طرف دیکھا وہ بھی مسکرا دیں۔

”لڑکے کی تصویر آپ لوگ رکھ لیں، دعا بیٹی کی بھی رائے لے لیجیے گا۔۔۔۔۔“ آپا نے اپنے پرس سے پوسٹ کارڈ سائز تصویر نکال کر عارفہ کی طرف بڑھائی۔

”شکریہ! ماشاء اللہ حسین بیٹا ہے۔۔۔۔۔“ بے اختیار ہی ان کے لبوں سے نکلا۔

”بہت نیک سیرت اور اطاعت گزار ہے۔“ آپا نے بیٹیجے کی تعریف کی۔ وہ دونوں مطمئن ہو کر اثبات میں گردن ہلاتی رہیں۔۔۔۔۔ کچھ دیر بعد دعا چائے کے بھر پور لوازمات سے کچی ٹرائی لیے آگئی۔۔۔۔۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں تھا اور آنکھوں میں غبار تھا۔۔۔۔۔ عارفہ دیکھ کر پہلو بدلنے پر مجبور ہو گئیں۔

☆☆☆

پہلی تاریخ کا چاند اس کی نگاہوں کی زد میں تھا۔۔۔۔۔ چھوٹے سے لان میں کرسی کی پشت سے سر نکالنے بڑی دیر سے عالم محویت میں تھا۔۔۔۔۔ تنہائی، اداسی، افسردگی اور پشیمانی جیسے سب گڈمڈ ہو کر اس پر طاری تھے۔۔۔۔۔ عارفہ تنگن کے باعث سوچتی تھیں۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔

”چاند دیکھ کر کیا دعا مانگ رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ پشت سے دعا کی مدھم سی آواز آئی تو اس نے گردن گھما کر دیکھا، وہ اسی لباس میں اس کے سامنے تھی۔

”چاند ابھی نکلا ہی کہاں ہے؟ جب نکلے گا تو ہم بھی دعا مانگیں گے، اپنے حصے میں مقدر کا لکھا مانگیں گے، ہم طلبگار نہیں دنیا اور دولت کے، ہم اللہ سے فقط اس کی وفا مانگیں گے۔“ وہ مدھم مدھم، سریلے سے لفظوں میں بول

گیا۔

”ابھی مانگنا باقی ہے کیا؟“ وہ برابر والی کرسی پر ٹپک گئی۔

”نہیں شاید ایسا بھی نہیں ہے۔“

”رمان ڈسٹرب ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”شاید!“

”شاید نہیں یقیناً، بتاؤ۔۔۔۔۔“

”کچھ نہیں، تم اچھی لگ رہی ہو۔“ ایک دم ہی مسکرا کر موضوع بدل دیا۔

”آج تو اچھی لگوں گی ہی۔“

”وہ کیوں۔۔۔۔۔؟“ وہ کچھ نہ سمجھا۔

”تمہاری جان جو چھوٹ گئی۔۔۔۔۔“ گہرا درد جیسے جاگ اٹھا۔

”اول اچھا! ہاں بھئی بلا سر سے ٹپ گئی۔“ وہ سمجھ کر شریانداز میں بولا۔

”تو خوش ہونا چاہیے۔“

”خوش تو ہوں۔۔۔۔۔“ اس نے جھوٹ بولا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ فوراً سمجھ جاتی ہے۔

”اسی لیے اتنی رات گئے اندھیرے میں بے نام سے چاند کو گھور رہے ہو۔“

”ارے، میں اپنا چاند دیکھ رہا تھا، دیکھو بالکل نیناں جیسا ہے نا۔۔۔۔۔“ اس نے چھیڑا۔

”غلط، نیناں تو چودھویں کا چاند ہے۔“ پہلی بار شاید اس نے اعتراف کیا تھا۔

”واہ! کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ اوپر اوپر سے ہنسا۔

”رمان! کیا بات ہے؟“

”میرا چاند مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“ اس نے فقط اتنا بتایا۔

”مطلب۔۔۔۔۔؟“

”رمان سے نیناں کو دور کرنے کا حکم ہے۔“

”ایسا کون کر رہا ہے، میں نے تو تمہیں آزاد کر دیا۔۔۔۔۔“ وہ بے قرار ہو گئی۔

”تھینک یو ویری مچ، دعا! یو آر گریٹ، تم میری دوست ہو، آج میں پشیمان تم سے ہوں۔“ اس کا نغمہ ہاتھ

تھام کر اس نے اعتراف کیا۔

”میں کچھ کر سکتی ہوں تو بتاؤ؟“ بھیکے لہجے میں پوچھا گیا۔

”بس اچھی دوست بن کر دعا کرنی رہو اور مجھے سچے دل سے معاف کر دو۔“

”رمان! معاف کیا ہے تو شاید پسند کی گئی ہوں۔“

”خدا کرے کہ تم بہت خوش و خرم زندگی بسر کرو۔“

”ابھی تو پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہے۔“

”سب اچھا ہوگا ماشاء اللہ۔۔۔۔۔“ وہ بولا۔

”چلو اندر جا کر سو جاؤ خنکی بڑھ رہی ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”دعا! ادھر دیکھو میری طرف.....“ ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔
 ”ہوں!“

”مجھے معاف کر دیا ہوتا تو آنکھوں کے کنول مسکر رہے ہوتے۔“
 ”آنکھوں کے دیپ جھلکارے ہوں تو بھی خوشی ہی ظاہر ہوتی ہے۔“
 ”پلیز! دعا اس سے محبت کا آغاز کرو جس کو دیکھا بھی نہیں پر وہ اپنا ہے۔“

”جاؤ سو جاؤ.....“ وہ ہاتھ چھڑا کر پلٹ گئی..... رمان تاسف سے اپنا خالی ہاتھ دیکھتا رہا، اس راستے کو گھورتا رہا جہاں سے گزر کر وہ گئی تھی..... یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس کو چاہتی ہے پھر بھی ایسا مشورہ دے دیا۔

☆☆☆

بے تاب و بے قرار دل کے ساتھ تیکے پر سر رکھا ہی تھا کہ اشکوں نے رستہ بنالیا..... دائیں بائیں بند آنکھوں سے گویا دریا بہہ نکلا..... رمان کو کیا معلوم تھا کہ کس ضبط کے امتحان سے گزر کر اس نے کسی اور کو اپنانے کے لیے گردن جھکا لی تھی..... محبت میں محبوب بانٹ دینا کتنا کڑا ہوتا ہے یہ کوئی اس کے دل سے پوچھے، وہ تو ذرا سی مجبوری پر دل چھوڑ بیٹھا تھا۔

”رمان! خدا بھی نہ کرے غم سے ہمکنار نہیں اور تمہاری محبت کو، بس یہ جو اس میں اور تم میں رابطہ ہے خدا کرے یہ سدا رہے، تمہاری محبت کا چراغ ہمیشہ جلا رہے، تم دونوں کی الفت کا کنول کھلا رہے، تمہیں مسکرائیں نصیب ہوں، تم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے حبیب بن کر رہو، تمہارا جیون خوشیوں سے بھرا رہے..... بس میری یہ دعا ہے.....“ صدق دل سے رمان کو مخاطب کر کے اس نے محبت بھری دعائیں دیں..... لیکن چھما چھم برستی گھٹانے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ تکیہ بھگوتے بھگوتے، کروٹیں لیتے لیتے سکون نہ آیا تو جانے کیوں دھیرے سے ایک بار پھر وہ قدموں سے آنچل سنبھالتی وہیں رمان کے پاس پہنچ گئی..... وہ بھی چاند میں اپنا چاند دیکھ رہا تھا..... اسے دیکھ کر چونکا اور اٹھا۔

”دعا!“ فقط منہ سے اتنا نکلنے کی دیر تھی کہ وہ چیخیں مار مار کر روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔

”رمان! میں تمہارے سوا کسی کے ساتھ نہیں رہ سکتی، میں نے جھوٹ بولا ہے، میں کیسے تمہیں بھول جاؤں..... پلیز، پلیز مجھے یوں نہ دکھ دو.....“ وہ شدت سے اپنے بازوؤں میں اسے دبائے روتے ہوئے التجائیں کر رہی تھی، رمان نے خود کو ڈھیلا اور نرم چھوڑ دیا اس کے سر پر اپنی ٹھوڑی رکھ دی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں، سسکیاں ہمیں تو بہت غیر محسوس طریقے سے اسے ذرا سا الگ کر کے ایک ٹک دیکھنے لگا۔

”پلیز! رمان.....“ بہت التجا تھی اس کی آنکھوں سے، بہتے اشکوں میں۔ وہ تڑپ اٹھا لیکن پھر دور جا کر کھڑا ہوا..... اس کے وجود سے لپٹے احساس کو خود سے جدا کرنے میں کچھ وقت گزر گیا..... سنبھل کر پلٹا اور بولا۔

”اسیر کس نے کیا ہے گلوں کی خوشبو کو؟ صبا کے پاؤں میں زنجیر کس نے دیکھی ہے؟ بجھے ہیں صر صر

طوفان سے کب چراغ نجوم، جنوں کے خواب کی تعبیر کس نے دیکھی ہے؟ لکھی ہے خاک کے ذروں پہ وقت کی تحریر مگر ناداں لڑکی مگر یہ وقت کی تحریر کس نے دیکھی ہے؟ میرے مقدر کا تمہیں کیا پتا.....؟“ وہ بولتا رہا وہ سنتی رہی، اس کے بولنے سے دیکھنے تک بے بسی اور بے چارگی تھی، دوسرے لفظوں میں وہ یہ سمجھا رہا تھا کہ اسے مقدر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لو۔ اس نے نظریں جھکا لیں..... کچھ لمحے سکوت چھایا رہا..... پھر وہ قریب آ کر بولا۔

”میری چاہت اگر تم ہو تیں تو بہت کافی تھے تم سے لپٹنے والے گرم لمحات..... کیا تم اب بھی نہیں جان سکیں کہ میرے اور تمہارے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے۔“

”صرف تم، تم فاصلہ رکھے ہوئے ہو.....“ اس نے احتجاج کیا۔
 ”دعا! فار گاڈ سیک، پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی والا انداز اختیار کرو.....“ کچھ سنجیدگی سے کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا..... اس کے جاتے ہی عارفہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی بند کر لی..... اور غمگین سی بستر پر بیٹھ گئیں..... انہیں تو بیٹے کی اداسی اور پریشانی کا غم ہی کھائے جا رہا تھا، دعا کی طرف سے ذرا سا اطمینان ہوا تھا سو وہ بھی سامنے آ گیا کہ وہ رمان کو چھوڑنا ہی نہیں چاہتی۔

”یا خدا! کیا بنے گا ہمارے بچوں کا.....؟“ دل سے تاسف بھری آہ نکلی..... تینوں بچے ہی جگر کے ٹکڑے تھے..... کس کو سنبھالیں اور کس کو نہیں، عجب دورا ہے پر زندگی آگئی تھی..... بہن اور بھانجی، نند اور بھانجی سب ہی پیار کے رشتے تھے، سب سے بڑھ کر ان کی عمر بھر کی کمائی، پیارا اکلوتا بیٹا جو دنیا سے محبت کرتا ہے، اس کا کیا ہوگا؟ دنیا پر کیا گزر رہی ہوگی؟ دعا کی حالت تو وہ دیکھ ہی چکی تھیں..... اتنے بدلاؤ کے بعد وہ یوں دیوانی ہو کر اس طرح رمان سے آ لپٹے گی یہ تو انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

”سچ کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے۔“ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

☆☆☆

رات وہ بہت دیر سے آیا تھا۔ مال آیا تھا، میڈیسن سیٹ کرنی تھیں..... اس لیے خاموشی سے آ کر سو گیا مگر اکبری بیگم کورشتے کے بارے میں بتانے کی بے چینی ہو رہی تھی، ناشتا کرنے کے لیے جونہی وہ آیا تو وہ جیسے تیار بیٹھی تھیں..... پراٹھا آ ملیٹ، چائے کا کپ فوراً اس کے سامنے رکھ دیا۔

”رات بڑی دیر سے آئے؟“

”بس کام تھا۔“ وہ ناشتا کرتے ہوئے بولا۔

”لڑکی ہمیں پسند آگئی بلکہ وہ ہے ہی پسند کرنے کے قابل، میں نے انہیں کہہ دیا ہے کہ جلد نئے گھر میں بلائیں گے۔“

”اماں! چھری تلے دم لے لیا کرو، فی الحال اتنی جلدی کیا ہے؟ کوئی نیا گھر ورا بھی نہیں مل رہا.....“ وہ بہت تلخ ہو گیا۔

”تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ لڑکے رشتے کی بات سن کر خوش ہوتے ہیں اور تم.....“ اکبری بیگم بھڑک گئیں۔
 ”میرا مسئلہ پیسہ ہے، بولیں حل کر سکتی ہیں میرا مسئلہ یا پھر مانگ لیں لڑکی والوں سے؟“ وہ تند لہجے میں

بولا۔

”باؤلا ہو گیا ہے، بیٹی والوں کا یوں تمسخر اڑاتے ہیں، مت بھولو تمہاری بھی بہن ہے۔“ اماں نے اچھا خاصا لٹاڑا۔

”میرا سر نہ کھائیں، رقم کا بندوبست نہیں ہوا، پیانہ ڈوب جائے گا۔“ وہ جھلا کر کہتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا۔ تو اکبری بیگم کو کچھ احساس ہوا، اندر سے مدیحہ شور مچاتے ہوئے آئی تو انہیں یاد آیا کہ مدیحہ کو امتحان سینئر چھوڑنا تھا اس کا پیپر تھا۔

”ارے وہ تو گیا، اب، اب کیا کروں؟“ ان کے حواس جواب دے گئے۔

”کیا۔ اب میں کیسے جاؤں؟“ مدیحہ باقاعدہ روتے لگی۔

”ارے بھئی اسے فون کرلو، زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔“ آپا نے آکر مشورہ دیا۔

”فون میں پلینس نہیں ہے۔“

”اوہو! جب پلینس ڈلوادیں تو باتیں ختم نہیں ہوتیں جانے کس سے باتیں کرتی ہو۔“ اکبری بیگم نے کہا۔

”بھئی اب دیر نہ کرو جو کرنا ہے جلدی کرو۔“ آپا نے پریشان ہو کر کہا۔

”اماں مجھے جلدی سے رکشا کرا دیں میں چلی جاؤں گی۔“ مدیحہ نے حل پیش کیا۔

”چلو میرے ساتھ، میں چلتی ہوں۔“ آپا نے صحن میں تار پر لٹکی اپنی چادر سنبھالی۔

”اوہو! میں بچی نہیں ہوں، بس باہر لگی سے رکشا کرا دیں۔“ وہ ٹھکی اور اپنا پنڈ بیگ اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی۔

”چلو۔“ مجبوراً اکبری بیگم کو ہتھیر پھینکنے پڑے۔

”واپس کیسے آؤ گی؟“ آپا نے باہر دروازے سے سر نکال کر پوچھا۔

”آجاؤں گی، پریشان نہ ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے چلی گئی۔ اکبری بیگم اس کے پیچھے تھیں، آپا نے دروازہ بند کیا، صحن میں آئیں تو فرش پر پڑے ہوئے وزیٹنگ کارڈ کو دیکھ کر ذہن پر زور ڈالتے ہوئے جھک کے کارڈ اٹھا لیا۔ طلال اختر اسٹنٹ ڈائریکٹر نیناں گروپ آف انڈسٹریز۔ پڑھ کر وہ سمجھ گئیں کہ یہ کارڈ مدیحہ کی ڈائری سے گرا ہے لیکن اس کارڈ نے آپا کے اندر ہنگامہ برپا کر دیا۔

”یہ طلال اختر کون ہے؟ مدیحہ کے پاس اس کا کارڈ کیوں ہے؟“ ان دونوں سوالات نے انہیں ہلا دیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کیا ہے؟ مگر مجبوری تھی مدیحہ کے آنے پر ہی پتا چل سکتا تھا۔ انہوں نے کارڈ اپنے منہ کے نیچے رکھ دیا اور کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں موند لیں۔ ذہن میں کوئی پرانی فلم چلنے لگی تھی، چہرے کا رنگ متغیر سا ہو گیا، جڑوں کی ہڈیاں سختی سے آپس میں جڑی گئی تھیں کچھ نہ کچھ ان کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ مدیحہ کے اطوار، چال ڈھال اور انداز میں بہت بڑی تبدیلی سی تھی، جسے محسوس تو وہ کر رہی تھیں مگر پوچھا نہیں تھا۔ فون پر باتیں، بلاوجہ قہقہے لگانا، بار بار آئینہ دیکھنا یہ شاید بلاوجہ نہیں تھا۔ دل میں گرہ ہی پڑ گئی۔

☆☆☆

شدید فلو اور بخار کے باوجود ریحان اختر کوئی فون سننے کے بعد صرف جو شانہ پی کر تیزی سے چلے

گئے۔۔۔۔۔ ان کے جانے کے بعد وہ چائے کا کپ لیے بوا کے پاس کچن میں آ گئیں۔ نیناں ڈرائیور کے ساتھ یونیورسٹی ایڈمیشن کے لیے گئی تھی۔۔۔۔۔ کچھی کچھی سی، روئی روئی سی، رابعہ کا دل دکھ سے بھر گیا اسے تو کچھ نہ کہا کیونکہ اس کا دکھ وہ جانتی تھیں۔۔۔۔۔ البتہ بوا سے بات کرنے کے لیے اس سے بہتر موقع کوئی نہیں تھا۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“ بوا نے خود پوچھ لیا۔

”بوا! ماں سے بڑھ کر پیاری ہیں پھر نیناں کے لیے کچھ کیوں نہیں کرتیں؟“

”رمان کو سمجھاؤ وہ اپنی ضد چھوڑ دے، ریحان کی ضد تو راستے کی گرد ہے جلد بیٹھ جاتی ہے۔“

”بوا! کس قدر جانتی ہیں ریحان کو پھر مجھے کچھ نہیں بتایا، رمان کی ضد راستے کی گرد نہیں۔“ انہوں نے

شکوہ کیا۔

”کیا نہیں بتایا؟“ وہ کچھ پریشان ہو گئیں۔

”بوا! آپ کو سب محبتوں کا واسطہ وہی بتا دیں جو رات کو ریحان سے کہا۔“ انہوں نے اس قدر اچانک کہا

کہ وہ حیرت سے دیکھنے لگیں۔

”کیا، کیا کہا۔۔۔۔۔؟“

”وہ سب جس نے ریحان کو رات بھر سونے نہیں دیا، وہ آپ کے کمرے میں بہت دیر رہے، یہ سب کیا

ہے؟“ انہوں نے جرح کی۔۔۔۔۔ بوا کچھ نہ بول سکیں صرف آنکھیں جھکا لیں۔

”بولیں بوا!“ وہ مصر ہو گئیں۔

”کیا، کیا بتاؤں؟ میں نے ریحان کو کچھ غلط نہیں کہا، مجھ پر شک مت کرو۔“

”نہیں، نہیں اللہ نہ کرے کہ میں آپ پر شک کروں مگر بوا مجھے وہ سچ بتائیں جو ریحان کی سچائی ہے۔“

”پھر اس کے بعد۔۔۔۔۔؟“ استفہامیہ نظروں سے دیکھا گیا۔

”میرے لیے نہ اب کچھ ہے اور نہ بعد میں مگر میری نیناں کا خیال کر لیں۔“

”نیناں کی بات تو رمان کے سمجھوتے پر ختم ہوتی ہے، اصل مسئلہ تو اس نیناں کا ہے جس کی ضد کو شکست

میں بدلنے کا ریحان انتظار کر رہا ہے۔۔۔۔۔؟“

”کیا مطلب؟ اس نیناں سے کیا مراد ہے؟“ انہیں شدید ذہنی جھٹکا لگا۔

”وہی نیناں جس کی فوٹو تم نے دیکھی، ریحان کی جنونی محبت۔ مگر اتنی ہی اس کی جنونی نفرت نے ریحان

کو بے قرار ضدی بنا دیا۔۔۔۔۔ تمہاری نیناں کا نام اس کی محبت میں رکھا ہے۔۔۔۔۔ مگر کتنے زمانے گزر گئے اس ضدی

عورت نے ریحان کو شوہر تسلیم نہیں کیا۔“

”کیا! وہ ریحان کی بیوی ہے، کہاں چھپا رکھا ہے۔۔۔۔۔؟“ رابعہ پر یکے بعد دیگرے حیرتوں کے پہاڑ

ٹوٹ رہے تھے۔

”نہیں معلوم، اس نے نکاح کے بعد سنا ہے بھاگ کر کسی بند کنویں میں چھلانگ لگا دی تھی، ریحان کے

آدمیوں نے کنویں سے نکال کر کسی نامعلوم جگہ پر پہنچا دیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر چوٹ لگی تھی دھڑ بھڑا رہا،

ریحان اب تک علاج کر رہا ہے مگر بقول اس کے وہ نہ دوا کھاتی ہے نہ ریحان سے بات کرتی ہے۔“ وہ

دھیرے دھیرے ایسے بتا رہی تھیں جیسے کسی فلم کی اسٹوری سنار ہی ہوں۔

”اوہ میرے خدا! اتنا ظلم..... آپ کہانی سنار ہی ہیں یا حقیقت.....؟“ رابعہ سر ہٹا کر رہ گئیں۔

”ایسی بہت سی حقیقتیں میرے دل و دماغ میں ہیں مگر اپنی بی بی کی اولاد کو بے عزت نہیں کر سکتی.....“ انہوں نے اعتراف کیا۔

”مگر آپ نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ، نیناں کے ساتھ، ایک دفعہ بھی آپ سچ نہ بتا سکیں، ریحان نے مجھ سے محبت کا ٹھیل کھلا، مجھے اذیتیں دیں اور آپ نے ریحان کا ساتھ دیا.....“ رابعہ کو ایک دم اشتعال آ گیا۔

”تو کیا کرتی؟ ہم جیسی نوکرائیوں کو مالک اسی لیے خریدتے ہیں، بی بی کے ساتھ آئی تھی ان کے بچوں کا بھرم نہ رکھتی.....“ وہ بولیں۔

”مگر بوا آپ نے میرے اعتماد کو کچھ کرچی کرچی کر دیا، میری بیٹی کا نام ریحان نے نیناں رکھا تو آپ نے کچھ نہ کہا۔“ رابعہ آبدیدہ ہو گئیں۔

”ریحان کو کون سمجھا سکتا ہے بولو، وہ آج کہیں اور نہیں گیا اسی سے ملنے گیا ہے۔ وہ اسے یہاں لانا چاہتا ہے، میں اور تم کیسے روکیں گے؟ بس مجھے نیناں کی خوشی عزیز ہے۔“

”ہمت کریں یہ بناوٹی باتیں، ریحان نے مجھے میری بیٹی کے نام سے نفرت کرا دی ہے، میری سوتیلی ماں میری بیٹی کو دے دیا..... اب وہ اپنے بھانجے کو اس کا ہاتھ پکڑا دے گا۔“ وہ تقریباً غصے سے چلا اٹھیں۔

”نہیں، طلال کے لیے وہ ایسا نہیں کر سکتا.....“ وہ وثوق سے بولیں۔

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، میری اس قدر توہین کی ریحان نے، اب میں ایک بل بھی یہاں نہیں رہ سکتی۔“

”پاگل نہ بنو، ریحان کو مات ہونے تک ایسا مت سوچو، مجھے یقین ہے کہ وہ نیناں، ریحان کو کبھی قبول نہیں کرے گی۔“ وہ سختی سے بولیں۔

”پتا نہیں کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ..... میرا سر چکرانے لگا ہے۔“

”معاف کر دو، یہ سب کچھ چھپانا میری مجبوری ہے۔“

”رہنے دیں بوا! آپ کو مجھ پر ذرا ترس نہیں آیا، میں دوائیں کھاتی رہی، مار کھاتی رہی اور آپ نے زبان نہ کھولی۔“

”سب شکایتیں ٹھیک ہیں، مجھے برا بھلا کہو۔“

”میری بیٹی سے نہیں اس کے نام سے محبت ہے ریحان کو بس۔“

”بتایا تو ہے کہ اس کے حسن نے ریحان کو دیوانہ بنا دیا، اس کی نفرت نے ضدی بنا دیا۔“

”مجھ سے محبت کا ذرا مار چانے کی ضرورت کیا تھی؟“ وہ رو دیں، بوائے ندامت سے سر جھکا لیا۔

”اور کچھ بھی کہیں، کیوں چپ ہو گئیں۔“

”بیٹا! رمان کو سمجھاؤ، نیناں مر جھا کے رہ گئی ہے۔“

”مت فکر کریں نیناں کی، وہ آپ سے کس قدر محبت کرتی ہے اور آپ نے اسے بھی دھوکا دیا۔“ رابعہ یہ

کہہ کر باہر نکل گئیں..... بوائے ان کے جانے کے بعد ندامت کے آنسو بہائے۔

☆☆☆

عارفہ دادی کی طرف جانے کی تیاری کر رہی تھیں کہ طاہرہ بیگم پریشان حال آ گئیں..... وہ اس طرح دیکھ کر خود بھی فکر مند ہو گئیں۔

”بھابی! دعا بخار میں پھنک رہی ہے، بے سدھ پڑی ہے۔“

”ہیں! لیکن رات کو تو وہ یہاں سے ٹھیک گئی.....“ غیر ارادی طور پر انہوں نے کہہ دیا۔

”کیا رات کو یہاں آئی تھی.....؟“

”ہاں! لیکن بالکل ٹھیک تھی، اب کیا کریں.....؟“ عارفہ بیگم کے ہاتھ پاؤں بھی پھول گئے۔

”اس کے ابا کو ڈاکٹر صاحب کو بلانے بھیجا ہے۔“

”تو صبح سے آپ کو پتا نہیں چلا میں رمان کے ساتھ اسپتال لے جاتی۔“

”میں نے سمجھا کہ سو رہی ہے اٹھ جائے گی، کل اس نے بہت کام کیا تھا، اس وجہ سے میں نے بے آرام نہیں کیا.....“ طاہرہ بیگم پر تو رقت سی طاری ہو گئی۔

”اچھا گھبرانے کی کیا بات ہے؟ چلو چل کر دیکھیں.....“ عارفہ بیگم نے ہمت بندھائی..... دونوں فوراً دعا کے پاس آ گئیں۔

”دعا! دعا! بیٹا آنکھیں کھولو.....“ عارفہ اس کے سر ہانے بیٹھ کر ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ مگر

اس میں جیسے کوئی بیداری پیدا نہیں ہوئی..... گرم گرم لمبی سانس پیدا ہو رہی تھی..... چہرہ سرخ انگارے کے مانند

دنگ رہا تھا۔

”کل تو خوش تھی..... آپ نے دیکھا تھا نا بہت مطمئن تھی.....“ طاہرہ بیگم بولیں عارفہ بیگم کے اندر جیسے

کسی نے تیز دھار آ لے سے گھاؤ لگا دیا..... وہ طاہرہ بیگم کی اس لاعلم خوش نہی کو کیسے مایوسی میں بدل دیتیں؟

رات کا وہ کریناک نظارہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا..... وہ رنجیدہ ہو گئیں..... مگر بولیں کچھ

نہیں۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب آ گئے..... عارفہ سر ہانے سے اٹھ کر ذرا فاصلے پر کھڑی ہو گئیں..... ڈاکٹر نے

کچھ ضروری سوالات کیے، اچھی طرح معائنہ کیا اور مرتشوش انداز میں نسخہ لکھتے ہوئے ہدایت کی۔

”یہ میڈیسن فوراً منگوا کر دیں، آدھے گھنٹے تک بخار کی شدت میں کمی آئی چاہیے اگر نہ آئے تو اسپتال

لے جائیں، ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھیں۔“ برکت اللہ، ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ ہی باہر نکل گئے.....

عارفہ نے رمان کو فون کیا اور فوراً گھر آنے کو کہا..... طاہرہ بیگم فریق سے ٹھنڈا پانی لائیں عارفہ نے ان کے ہاتھ

سے پانی اور پٹیاں لے کر خود بہت پیار سے اس کے ماتھے پر رکھیں۔

”مجھے لگتا ہے میری بیٹی کو نظر لگ گئی، وہ اکبری بیگم اور آپا گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔“ طاہرہ بیگم نے

خوشہ یقین میں بدل کر پیش کیا۔

”ارے نہیں، وہ کوئی بری نظر سے تھوڑی دیکھ رہی تھیں، مجھے لگتا ہے موسم کی تبدیلی کی وجہ سے بخار ہوا

ہے۔“ عارفہ بیگم نے سچ پر پردہ ڈالتے ہوئے تسلی دی..... حالانکہ وہ حقیقت سے آشنا تھیں۔ بے سدھ پڑی دعا

ماہنامہ پاکیزہ۔ جنوری 2012ء

234

ماہنامہ پاکیزہ۔ جنوری 2012ء

235

کی آنکھوں کے کنارے اب تک آنسوؤں کے خشک ہونے کے آثار ظاہر کر رہے تھے۔ وہ جانتی تھیں کہ دعا نے یہ فیصلہ قبول نہیں کیا صرف مجبوراً گردن جھکائی ہے اور مجبوری کا صدمہ بخار کی حدت میں بدل گیا ہے۔ ”کچھ فرق پڑ رہا ہے کیا؟“ طاہرہ بیگم نے ٹھنڈی پٹیاں بدلنے کے باعث چھو کر دیکھا۔

”انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”میں سوچ رہی ہوں اگر آپ چلی گئی ہوتیں تو میرے لیے کتنی مشکل ہوتی؟“

”ایسا کیوں سوچا؟ ارے آنا کوئی مشکل تھا اور اب جب تک میری دعا ٹھیک نہیں ہوتی میں یہیں رہوں گی۔“ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دعا کے لیے کیا کچھ کر ڈالیں، اس کی اس حالت کا ذمے دار وہ خود کو سمجھ رہی تھیں۔

”کاش! میری دعا کو آپ کے ساتھ ہی رہنے کا موقع ملتا؟“ بے خیالی میں متا کے احساس نے یہ جملہ طاہرہ کے منہ سے نکلوا دیا۔ عارفہ کا دل تڑپ اٹھا۔ وہ خود کو کسی بلندی سے گرنا محسوس کرنے لگیں۔ باہر گیٹ پر رمان کی گاڑی کا ہارن سن کر انہیں جانا پڑا۔ مگر اندر اٹھتے شدید طوفان کے ساتھ۔

☆☆☆

اپنے نام کی آواز سن کر دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے قدم کالج سے باہر نکالے۔ سیاہ برسرڈیز اس کے لیے موجود تھی جس میں طلال اس کا منتظر تھا۔ جلدی سے دروازہ کھول کر وہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔ گاڑی میں برق دوڑنے لگی۔ کچھ دور کشادہ سڑک پر پہنچ کر طلال نے گاڑی کی رفتار کم کی اور بائیں ہاتھ سے اس کا دایاں ہاتھ تھام لیا۔

”جی جناب! اب کیا ارادے ہیں؟“ وہ عالم مدہوشی میں بولا۔

”وہ، وہ بس مجھے جلدی گھر جانا ہے دراصل۔“

”یہ اگر مگر... دراصل دراصل چھوڑو، یہ بتاؤ کتنی دیر ہمارے دل کو سکون پہنچا سکتی ہو؟“

”اللہ! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ وہ شرمائی۔

”ٹھیک کہہ رہا ہوں، آج دور تک ساتھ چلو، طبیعت اداس ہے۔“

”کیوں؟“

”تمہاری سہیلی نے دل توڑا ہے، تم تو مرہم رکھ دو۔“ زور سے اس کا ہاتھ دبا کر غمورنگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر، وہ میں نے شاید میں نے آپ کو فون کر کے غلطی کی۔“ اب وہ کچھ بوکھلا سی رہی تھی۔

”مدیحہ! میں اس سرکش لڑکی کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اس کے سوا بھی کسی سے محبت کر سکتا ہوں۔“

”محبت تو آپ کو نیناں سے ہی ہے۔“

”نہیں اب نہیں ہے، جانتی ہو کیوں؟“

”بتائیں؟“

”میرے ماموں اپنی لاڈلی نیناں کو میرے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔“

236 ماہنامہ پاکیزہ جنوری 2012ء

”دیکھیں! ہم بہت دور آگئے ہیں۔“ اس نے آبادی سے باہر نکلنے پر یاد دلایا۔

”کم آن پار! اب چپ کر کے بیٹھو، نیناں تمہاری دوست ہے ذرا سوچو جب اسے یہ پتا چلے گا کہ میں نے تمہیں کس قدر قریب کر لیا ہے تو اسے غصہ آئے گا۔“

”نہیں آئے گا کیونکہ وہ کہتی رہتی ہے کہ طلال اچھے نہیں ہیں، مدیحہ نے بتایا تو وہ قہقہہ لگا کے ہنسنے لگا۔

”ہا، ہا، ہا لیکن تم بھی یہ سمجھتی ہو؟“

”نہیں، اسی لیے تو آپ کے ساتھ ہوں۔“

”اوہ میری نمکین! دل چاہتا ہے کہ تمہیں اڑالے جاؤں۔“ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ دونوں ہی اظہار محبت کر رہے تھے۔

”ہائے! میری اماں اور آپا جان سے مار دیں گی، اب مجھے کوئی رکشا کرا دیں۔“

”ابھی سے، ابھی تو دل سنبھلا نہیں۔“ اسے سچ سچ غصہ تھا۔

”ایک بات بتائیں، اگر نیناں مان گئی تو۔“

”نہیں وہ اپنے خالہ زاد کزن رمان کے لیے تڑپ رہی ہے، جسے ماموں نے ملنے سے بھی منع کر دیا ہے۔“ اس نے دھڑلے سے کہا۔

”طلال! نیناں بہت خفا ہوگی۔“ وہ کچھ سوچ کر ڈر گئی۔

”کیوں؟ یہ تمہاری زندگی ہے، میری زندگی ہے ہم جو چاہیں کریں۔“ وہ بڑی بے باکی سے بولا۔

”اچھا پلیز مجھے اب رکشا کرا دیں، دیر ہوگئی ہے، اماں تو کالج پہنچ جائیں گی۔“ مگر ابھی وہ جواب بھی نہیں دے پایا تھا کہ سلور جی ایل آئی بالکل برابر آگئی، اس میں پچھلی سیٹ پر بیٹھی نیناں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

مدیحہ کو طلال کے ساتھ دیکھ کر اسے شاک لگا۔ وہ تو یونیورسٹی سے واپس آرہی تھی۔

مدیحہ اور طلال نے اسے نہیں دیکھا۔ گاڑی دائیں طرف ڈرائیور نے موڑ لی تو نیناں نے دکھ سے آنکھیں

موند کر سر سیٹ کی پشت سے لگا لیا۔ اسے دلی صدمہ پہنچا تھا، مدیحہ کو کتنا سمجھایا تھا مگر طلال کی شخصیت کے سحر

میں وہ گرفتار ہو کر رہی۔ اس حد تک آزادانہ میل جول کا مطلب یہی تھا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے، مدیحہ کو

سمجھانا بیکار ہے۔

☆☆☆

آج بھی اوجھل ہے نگاہوں سے نشانِ منزل

اے زندگی!

تو ہی بتا کتنا سفر باقی ہے؟

ایسے ہی بیکار، دائیں بائیں سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھیں کئی گھنٹے بے سبب گزر گئے۔

پھر دوست پرانا یاد آیا تو جانے کہاں سے ڈھیر سارا اطمینان دل میں بھر گیا۔ سجان نے باہر ہی ان

کی گاڑی دیکھ لی تھی۔ گھر کے دروازے پر جو ننھی وہ ننھی تو وہ تیز قدموں سے چل کر قریب آگئے۔ سجان

کی ایک گاڑی کھڑی ہونے کے بعد دوسری گاڑی کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ اس لیے انہوں نے باہر ہی

ماہنامہ پاکیزہ جنوری 2012ء

237

گاڑی لاک کی اور ان کے ساتھ اندر آ گئیں۔

”خیریت، بڑے عرصے بعد ہماری یاد آئی.....؟“ سبحان نے بکھری بکھری بے ترتیب سی حالت دیکھ کر پوچھا۔

”سبحان! میں سکون کی تلاش میں آئی ہوں، مجھے اپنے کمرے میں لے چلو، وہ سب یادیں میرے سامنے پھیلا دو جن میں اپنا سکون رکھ کے میں بھول گئی تھی.....“ وہ بہت پرشردگی کے ساتھ چلتے ہوئے بولیں۔

”تم بھی کمال کرتی ہو، اس شخص کے پاس سکون ڈھونڈنے آئی ہو، جو خود سکون کی پہچان بھی کھو چکا ہے۔“ انہوں نے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔

”تم کیا جانو کہ تمہارے پہلو میں کتنا سکون ہے جبکہ نہ تم مسجد ہو، نہ مندر ہو اور نہ گرجا ہو۔“ وہ صوفے پر تقریباً گری گئیں..... سبحان کو افسردہ سی حیرت نے آ گھیرا۔

”کیا بات ہے اتنا فلسفہ وہ بھی مجھ عاجز کے لیے.....؟“ انہوں نے مذاقاً پوچھا تو ان کی افسردہ نگاہوں میں ہلکی سی چمک آئی۔

”سبحان! وہ سب باتیں کرو جو ہم کرتے تھے، میں بہت تپائی محسوس کر رہی ہوں۔“

”میں دیکھ رہا ہوں کہ کچھ عرصے پہلے جو تبدیلی تم میں آئی تھی وہ پھر رخصت ہو گئی ہے۔“ انہوں نے ان کے حلیے پر نظر ڈال کر کہا۔

”بس پر کھول کر اڑان بھرنے کی کوشش تھی۔“

”وہ کوشش اچھی تھی۔“ انہوں نے اعتراف کیا۔

”تم نہیں سمجھو گے، قدم قدم پر نت نئے دھوکے کھانے کے بعد کیا رہ جاتا ہے؟“

”اب ملال کے موسم سے باہر نکلو۔“

”کیسے نکلوں؟ جانتے ہو سبحان اختر کی پہلی بیوی ہے جس سے سبحان کو جنون کی حد تک عشق ہے۔“

”وہاٹ! یہ کس نے بتایا؟ یہ کیسے ممکن ہے.....؟“ وہ تقریباً اچھل ہی پڑے۔

”بوانے بتایا ہے، تمہیں یہ جان کر اور بھی حیرت ہوگی کہ اس کا نام نینا ہے، میری بیٹی کو سبحان نے وہ نام دے دیا..... جس عورت کو سبحان سے شدید نفرت ہے وہ اس سے عشق کرتا ہے۔“

”عشق چیز ہی ایسی ہے، اس میں دوطرفہ کی تو شرط ہی نہیں ہوتی۔“

”قیمت دے کر عشق کرنا یہ کہاں کی رسم ہے؟“ وہ طنزیہ بولیں۔

”ایک تاجر سے یہ سوال فضول ہے، اس کی شخصیت، حسب نسب ذہن میں رکھو۔“ سبحان نے انتہائی نرمی سے کہا۔

”سبحان! میں اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی مگر میری بیٹی وہاں ہے اس کی خاطر میں کچھ نہیں کر سکتی۔“

”کیوں نہیں کر سکتیں، اسٹینڈ لوڈ ٹاٹ جاؤ۔“

”سبحان کو سمجھانا آسان کام ہے کیا؟“

”کوئی مشکل نہیں ہے، میں بات کرتا ہوں۔“

”ارے نہیں، سبحان آجائیں تو بات کرتی ہوں، تم سناؤ کب جا رہے ہو؟“ انہوں نے اپنا ذہنی دباؤ کم کرنے کی خاطر موضوع بدلا۔

”بس ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر، مکان کی رجسٹری ہونے کی دیر ہے۔“

”اچھا! اتنی جلدی وہ بھی میرے حالات جان کر۔“

”راہی! جانا تو ہے، نوکری جو وہاں ہوئی..... بڑی مشکل سے بڑے ابا کو راضی کیا ہے..... گو کہ وہ اب تک ضد پر اڑے ہیں۔“

”چھوڑ دو وہ نوکری، یہاں دادی کے بعد آفس کے معاملات دیکھو، مجھے دوست کی ضرورت ہے، پلیز.....“ وہ یکدم منت سماجت پر اتر آئیں۔

”کم آن! یہ باتیں سننے کے لیے کہ دوست کا روبرو کالا لپٹی تھا..... سبحان تمہیں بہت کچھ کہے گا۔“

”وہ اب کون سا رکھتے ہیں اور پھر ان سے کوئی رشتہ میں رکھنا نہیں چاہتی۔“

”ٹھنڈے دل سے غور کرو، میں ذرا نور بابا کو چائے کا کہہ دوں۔“ وہ یہ کہہ کر کچھ دیر کو باہر گئے..... واپس آئے تو انہوں نے اصرار کیا۔

”سبحان! پلیز میری خاطر نہ جاؤ، بڑے ابا کی بات مان لو۔“

”یعنی سعدیہ سے شادی کر لوں؟“ وہ مسکرائے۔

”ہاں! اور یہیں زندگی شروع کرو، میں نے کبھی کچھ نہیں مانگا مگر اب مجھے تمہاری اشد ضرورت ہے۔“ وہ بے بسی سے بولیں تو سبحان گڑبڑا گئے۔

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نہ میری محبت ہے نہ عشق.....“ انہوں نے پوچھا۔

”ہاں! مگر میری خواہش بڑے ابا کی مرضی اور تمہاری ضرورت ہے۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ سعدیہ کا عشق کامیاب ہو گیا۔“

”ابھی تو تم نے کہا تھا کہ عشق دوطرفہ ہونے کا محتاج نہیں ہوتا۔“ نور دین بابا چائے اور بسکٹ لے آئے تو سبحان نے ان سے بڑے ابا کے متعلق پوچھا۔

”وہ تو سعدیہ بیٹی کے پاس رہتے ہیں، وہ اکیلی جو ہوتی ہیں۔“ نور دین بابا کے لہجے میں معلومات کے ساتھ ساتھ رحم کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

”نور دین بابا! یہ کمر اکتنا بے ترتیب ہو رہا ہے؟“ رابعہ نے چاروں طرف بکھرے ہوئے بندھے ہوئے سامان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ سامان یہاں سے جانے کا انتظار کر رہا ہے۔“

”کہیں نہیں جا رہا، آپ سارا سامان کھول کر سیٹ کر دیں۔“ رابعہ نے نور دین بابا سے کہا تو وہ غیر یقینی کی سی کیفیت میں کبھی رابعہ کو دیکھنے لگتے اور کبھی سبحان کو۔

”سبحان کہہ دو نور دین بابا کو پھر سے گھر سجا دیں۔“ رابعہ نے انہیں مخاطب کیا، وہ کچھ دیر انہیں دیکھتے رہے پھر اثبات میں گردن ہلا کر اشارہ کر دیا..... نور دین بابا کی خوشی سے آنکھیں جھللا گئیں..... بڑھ کر رابعہ

کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا تو رابعہ کو بھی جیسے قرار آ گیا۔

☆☆☆

شام کا منگچا سا اندھیرا باقی تھا۔ مدیحہ کے گھر میں قدم رکھنے کی دیر تھی کہ اکبری بیگم نے اسے بالوں سے پکڑ کر دیوچا اور سیدھے آپا کے سامنے لا پٹا۔ مدیحہ کو شدید رد عمل کا خدشہ تو تھا مگر اتنے شدید اشتعال انگیز رویے کا اندازہ نہیں تھا۔

”یہ لیس، سنبھالیں اپنی لاڈلی کو، پوچھیں اب تک کہاں تھی؟ کون چھوڑ کے گیا ہے؟“ اکبری بیگم نے کہا۔

”مدیحہ! طلال کون ہے؟“ آپا نے براہ راست اس کو مخاطب کیا، اس کے چہرہ پر رنگ سا آ کر چھا گیا۔

”طلال کہاں سے درمیان میں آ گیا.....؟“ وہ فقط منمنائی۔

”کون طلال آپا.....؟“ اکبری بیگم نے کچھ تعجب سے آپا کو دیکھا۔

”یہ طلال اختر.....“ آپا نے اپنے منگے کے نیچے سے وزیننگ کارڈ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ مدیحہ کے پاس سچ بتانے کے سوا اب کچھ نہیں بچا تھا۔

”یہ سب کیا ہے مدیحہ بتاؤ، زلفی نے سن لیا تو خون پی جائے گا تیرا۔“ اماں نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

”کیوں طلال کسی خلائی مخلوق کا نام ہے؟ میری سہیلی نیناں کا کزن ہے، اس کا کارڈ ہونا کوئی جرم ہے؟“ اس نے الٹا چور کو تو ال کو ڈانٹنے کے مصداق رویہ اختیار کیا۔

”نیناں کا کزن ہے، تمہارا کیا واسطہ ہے اس سے.....؟“ اماں نے زور سے دو ہتھڑا مارتے ہوئے پوچھا۔

”اکبری! تم جاؤ میں پوچھتی ہوں، جاؤ جا کر ہنڈیا بھونو.....“ آپا نے کافی متانت سے کہا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے چلی گئیں۔

”نیناں، راجا ریحان اختر کی بیٹی ہے، طلال کس کا بیٹا ہے؟“ انہوں نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

”نیناں کی پھپھو کا بیٹا ہے.....“ وہ بھیگی پلکیں صاف کرتے ہوئے بولی۔

”کون سی پھپھو کا بیٹا؟“

”دوسرہ پھپھو کا بیٹا، نیناں کی سگی پھپھو کا بیٹا ہے.....“ مدیحہ نے تلملا کر بڑے دباؤ کے ساتھ کہا۔ آپا کے حلق کے اندر ہی سب چیخیں جیسے کسی نے قید کر دی تھیں..... کچھ دیر تو وہ بول بھی نہ سکیں..... مدیحہ کپڑے بدلنے کے لیے اٹھنے لگی تو انہوں نے روک لیا۔

”اور کتنے بیٹے ہیں نیناں کی پھپھو کے؟“

”بس طلال ہی ہیں، باقی مجھے نہیں پتا.....“

”کہاں تھیں اس کے ساتھ.....؟“ انہوں نے تفتیشی نظروں سے گھورا۔

”بس لاٹک ڈرائیور پر گئے تھے۔“ وہ نظریں جھکا کر بولی۔

”اس کی تلاش تو پتا چل گئی، اب خون کا پتا لگانا باقی ہے.....“ آپا نے گویا خود سے بات کی۔

ماہنامہ پاکیزہ۔ جنوری 2012ء

”طلال مجھے پسند کرنے لگے ہیں، بہت اچھے ہیں، نیناں تو بلا وجہ انہیں برا بھلا کہتی ہے۔“ وہ جیسے شیر ہو گئی، اپنی ترنگ میں بولتی چلی گئی۔

”نیناں، کیوں برا بھلا کہتی ہے یہ نہیں سوچا تم نے، حسین و جمیل نیناں کو چھوڑ کر وہ تمہارے ساتھ وقت بتانے لگا..... کیوں؟“ آپا کو غصے آ گیا۔

”نیناں! رمان کو پسند کرتی ہے اس لیے۔“ وہ منہ پھلا کر بولی۔

”کچھ بھی ہے اب طلال کا نام بھی تمہاری زبان پر نہ آئے، ہمارا ان سے کوئی مقابلہ نہیں..... کاش! یہ بات مجھے تمہاری عمر میں بتائی جاتی۔“

”آپا! طلال اپنے فیصلے میں خود مختار ہے۔“

”وہ تمہارا رشتہ مانگنے آئے گا؟“

”ہاں! آپ اسے غلط نہ سمجھیں، مل کر دیکھیں۔“

”گھر سے نہ قدم نکالنا اور نہ اس سے رابطہ کرنا، میرے ملنے تک سمجھ گئیں.....؟“ انہوں نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

”اچھا۔“

”اب اٹھو، مغرب کی نماز کا وقت نکل رہا ہے۔“ وہ یہ کہہ کر جائے نماز بچھا کر نماز کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

☆☆☆

رمان کے دھونس جمانے پر وہ تیار ہو کر گیٹ تک آ گئی۔ اس نے ماما کو بتا دیا تھا، بوا ویسے ہی سمجھ گئی تھیں..... کچھ نہیں بولیں..... جس دن سے رابعہ سے بات ہوئی تھی۔ وہ اپنی ذات تک سمٹ کر رہ گئی تھیں، چپ چاپ اور شرمندہ، شرمندہ سی..... رمان نے گیٹ کے باہر گاڑی کھڑی کی تھی، نیناں تیز قدموں سے باہر نکلی اور گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی..... رمان نے گاڑی اشارت کی۔

”پتا بھی ہے کہ بابا نے منع کیا ہے پھر بھی فون کیوں کرتے رہے؟“ وہ بڑی روانی میں کہہ گئی، رمان نے اس کی اس ادا پر فریفتہ ہوتے ہوئے کہا۔

”پتا بھی ہے کہ رمان احمر کا دل بے قرار تھا، نیناں ریحان کا دل بے تاب تھا سو ملنا ضروری تھا۔“

”لیکن حالات ہمارے لیے ٹھیک نہیں ہیں، اب ٹینشن ہے بابا اگر پیچھے سے آگئے تو.....؟“ وہ حد درجہ خوف زدہ سی تھی۔

”کمال ہے یارا! تم تو آج بھی اتنی بزدل ہو، یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہارے بابا غلطی پر ہیں۔“ وہ سبک دوی سے مصروف شاہراہ پر گاڑی چلاتے ہوئے بولا۔

”میں کر بھی کیا سکتی ہوں؟ اپنی ماما کو تو خوش دیکھا نہیں۔“

”دیکھو! اب بہت ہو گیا ہے تم اور رابی خالہ اسٹینڈ لو۔“ ایک آکس کریم پارلر کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”بابا کو کیا فرق پڑے گا؟“

”بڑے گام، تم ان کی کمزوری ہو یا ر، فائدہ اٹھاؤ.....“ آئس کریم کا آرڈر دے کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”تو تم بابا کی فرمائش پوری کر دو، میری خاطر۔“ نیناں نے بڑی بڑی سرگیں آنکھوں سے دیکھتے ہوئے
 خواہش کا اظہار کیا..... اس سے رمان کا دل چاہا کہ اسے ہانہوں میں سمیٹ کر چوم لے..... مگر ضبط کا تقاضا اور تھا۔
 ”مجھے چاہتی ہو یا میری تو ہن چاہتی ہو.....؟“

”غلط سمجھ رہے ہو، طلال بھائی گھات لگائے بیٹھے ہیں، بوا مکمل خاموش اور لا تعلق ہو گئی ہیں، ماما تو اس
 قدر اپ سیٹ ہیں کہ کیا بتاؤں؟ اب ایسے میں تم ذرا سی گردن جھکا لو گے تو کیا ہو جائے گا۔“
 ”یہ ذرا سی بات نہیں ہے کچھ اصولی موقف ہوتے ہیں، دعا کس قدر مجھے چاہتی تھی بلکہ اب بھی اس کی
 حالت سے پتا چلتا ہے کہ وہ میرا خیال دل سے نہیں نکال سکی..... حالانکہ اس نے رشتہ قبول کر لیا..... میں نے
 اس کی خاطر فیصلہ نہیں بدلا۔“

”اچھا، بس بس، سمجھ میں آ گیا، طلال بھائی سے پھر میں کیسے بچ سکتی ہوں.....؟“ اس نے جذباتی انداز
 میں اس کا ادھورا جملہ اچک لیا۔

”طلال کو تو میں دیکھ لوں گا.....“ آئس کریم آچکی تھی، ونیلا و وچا کلیٹ اس کی فیورٹ تھی اس لیے انکار
 نہیں کیا..... ہاتھ بڑھا کر کپ لے لیا۔

”طلال بھائی تو ویسے ہی حد درجہ گھٹیا پن پر اتر آئے ہیں.....“ یکدم ہی اسے مدیحہ اور طلال کے چہرے
 نظروں کے سامنے دکھائی دینے لگے۔

”کیوں، اس نے چھینڑا ہے تمہیں.....؟“ رمان کا لہجہ پر مزاح تھا۔

”میں قتل کرویتی ان کا.....“ وہ تیخ پا ہو گئی۔

”پھر.....؟“

”میری سہیلی کے قریب ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”تو اچھی بات ہے، تمہاری جان چھوٹ جائے گی.....“ آئس کریم کا مزہ لیتے ہوئے بڑے سرسری انداز
 میں وہ کہہ گیا۔

”جانتے ہو مدیحہ ایک غریب مگر شریف گھرانے کی لڑکی ہے، طلال بھائی کی عیاشی اس کا خاندان افورڈ
 نہیں کر سکتا، مدیحہ کا نقصان ہو سکتا ہے۔“ وہ بہت مہربان ہمدردی سنیل کی بن کر مخاطب ہوئی۔
 ”تو اس مدیحہ کو عقل دینی تھی۔“

”بس اسے طلال بھائی کی پرسنلٹی بہت متاثر کرتی ہے۔“

”تو ڈوبنے دو، جو خود ڈوبنا چاہتا ہے اسے چھوڑ دیتے ہیں۔“

”یہ خود غرضی ہے۔“

”کم آن یا ر، ہم ایک دوسرے کے لیے آئے ہیں، مدیحہ اور طلال گئے بھاڑ میں۔“ وہ کچھ خفا سا ہو کر بولا،
 تو وہ مزید کچھ اور نہیں بولی، دھیرے دھیرے آئس کریم سے گویا کھیلاتی رہی، ذہن تو مدیحہ کی جانب تھا۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

ریحان اختر کو گئے ہفتہ ہو گیا تھا۔ رابعہ دن گن رہی تھیں، ریحان اختر کا انتظار تھا..... مگر ان کی کس کو خبر تھی؟ ایک عجب سی پراسراریت تھی ماحول میں، سب چپ چپ اور الگ الگ سے تھے..... نیناں کی دنیا یونیورسٹی اور گھر کے کمرے تک محدود ہو گئی تھی، رابعہ گھر میں یا پھر دادی کی طرف چکر لگا آتیں، گلو سے ڈھیروں باتیں کر کے اس دل گرفتہ کو تسلیاں دے آتیں، چاہا کہ اسے کہہ دیں۔

”گلو! اب رابی بی بی یہیں آ کر رہیں گی۔“ مگر اپنا کمرہ دیکھ کر آ جاتیں بوا سے جانے کیوں بات کرنے سے گریزاں ہو گئی تھیں، وہ بات کرتیں بھی تو سنی ان سنی کر دیتیں، بوا کا اندازہ درست تھا کہ وہ ریحان کے بارے میں جان کر انہی کو قصور وار سمجھ رہی تھیں۔ نیناں ماں کے اس رویے پر حیران تھی مگر وجہ نہیں پوچھ سکتی تھی کیونکہ وہ پھر سے خاصی چڑ چڑی سی ہو گئی تھیں۔ اس وقت بھی بوا نے مہمان کی آمد کا ذکر کیا تو وہ تڑخ کر بولیں۔

”تو میں کیا کروں؟“ وہ سہم سی گئیں۔

”وہ لڑکا تم سے ملنا چاہتا ہے۔“

”مجھے کسی لڑکے سے نہیں ملنا۔“ انہوں نے سختی سے کہا اور اپنے کمرے میں آ گئیں..... نیناں پیچھے ہی چلی آئی۔

”مما! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“

”کیوں.....؟“

”بوا کو کس قدر برے طریقے سے جھڑکا ہے آپ نے۔“

”بوا، بوا، بوا، بس کرو، جا کر دیکھو کون ہے؟“

”میں.....؟“ اس نے پوچھا تو وہ چند لمحے سوچ میں پڑ گئیں اور پھر خود ہی باہر نکل آئیں۔

”چلا گیا ہے۔“ بوا نے انہیں باہر سے آ کر اطلاع دی تو وہ وہیں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئیں۔

”کون تھا.....؟“ دھیرے سے پوچھا۔

”ذوالفقار۔“

”کیا کہہ رہا تھا.....؟“

”کہہ رہا تھا کہ پھر آؤں گا۔“ بوا یہ کہہ کر جانے لگیں تو وہ بولیں۔

”آپ کو تو پتا ہی ہو گا ریحان کب آئیں گے؟“ انہوں نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے انہیں متا بھرے

انداز میں دیکھا اور آگے بڑھ گئیں..... رابعہ کو کچھ تاسف ہوا مگر نیناں نے موبائل فون لا کر تھمایا تو نارٹل ہو کر فون کان سے لگا لیا۔

”ہیلو!“

”ہیلو! رابعہ جی!“ ذوالفقار کی آواز آئی تو انہیں نیناں پر غصہ آیا کہ بلا وجہ فون لا کر دے دیا۔

”جی۔“

”مجھے معلوم تھا کہ آپ گھر میں ہی ہیں، صرف ایوانڈ کر رہی ہیں۔“

”یہ بات نہیں ہے، دراصل میں کچھ ڈمٹرب ہوں۔“

”میں آپ سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”پلیز! ذوالفقار! میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی اور ویسے بھی آپ سے معذرت میں کر چکی ہوں۔“

انہوں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

”کون سی معذرت..... کس کس معذرت کا پوچھوں.....؟“ انتہائی طنز میں ڈوبا ذوالفقار نے جملہ تھا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ انہیں کچھ غصہ سا آ گیا۔

”معذرت نہیں چاہیے۔“

”دیکھو! میرے پاس اتنی بڑی رقم نہیں ہے، میں معذرت کر سکتی ہوں۔“

”تو راجا ریمان اختر سے مانگ لیں۔“ بڑی بے ہاکی سے کہا گیا تو انہیں چار سو چالیس کا جھٹکا لگا۔

”کیا.....“

”ہاں! ان کی طرف کافی سود نکلتا ہے۔“

”کیا مطلب ہے؟“

”چلیں مطلب پھر کبھی سمجھاؤں گا..... بلکہ وصول کر کے بتاؤں گا، بائے۔“ بڑے اطمینان سے اطلاع

کے طور پر کہہ کر فون بند کر دیا۔ رابعہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، وہ حیران پریشان سی اپنے آپ کو ہی ملامت کرنے لگیں۔

”بلاوجہ کسی پر اتنا بھروسہ کیا ایک غیر سے دانستہ راہ و رسم کی کیا ضرورت تھی؟ ایک نئی مشکل۔“ یہ سوچ

کر ہی سرور سے پھٹنے لگا..... ایسے میں نیناں نے پیشانی پر محبت بھرا ہاتھ رکھا تو کچھ حوصلہ ساملا۔

”بابا کی وجہ سے پریشان ہیں.....؟“ نیناں نے پوچھا۔

”نہیں، تمہاری وجہ سے فکر مند ہوں میری جان!“ انہوں نے پیار سے اس کا پیشانی پر رکھا ہاتھ اٹھا کر

چوم لیا۔

”مما! آپ بابا سے رمان کی بات کریں۔“ اس نے دل کی بات کہی۔

”رمان میری بیٹی کا مقدر ہے، اللہ پر بھروسہ ہے مجھے۔“ پورے یقین کے ساتھ انہوں نے اسے امید

دلائی۔

☆☆☆.....☆☆☆

گھر میں گھستے ہی اس نے آپا کے کمرے کا رخ کیا..... اور چند منٹوں میں ان کے پرانے صندوق اور

اٹیچی کیس کی ایک، ایک چیز نکال کر باہر پھینک ڈالی۔ آپا کے شادی کے پرانے سوٹ، چوڑیاں، ننھے ننھے

کرتے، پاجامے، نیکرشٹس فرش پر پھیلا دیں..... آپا نے کمرے میں داخل ہو کر حیرت اور افسوس کے ساتھ

بکھرے ہوئے سامان کو دیکھا اور پھرے ہوئے زلفی کو گھورا۔

”آپا! آپا! وہ فوٹو کہاں ہے، جس میں وہ ملازمہ بھی ہے.....“ وہ بوکھلا کر بولا۔

”کون سی فوٹو اور کون سی ملازمہ؟“ وہ کچھ حائل سے بولیں۔

”آپا وہی فوٹو جس میں آپ، آپ کی سہیلی اور اس کی ملازمہ اکٹھے بیٹھ رہی ہیں۔“

”تم کیوں مانگ رہے ہو؟“ ان کے چہرے کا رنگ متغیر سا ہو گیا۔

”آپا! وہ فوٹو دکھائیں، میں جس بوڑھی عورت سے مل کر آ رہا ہوں، وہ وہی ہے، آپ فوٹو تلاش کریں۔“

”وہ میں نے پھاڑ کر پھینک دی تھی۔“

”نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ویسے بھی وہ ملازمہ میرا مسئلہ نہیں۔“

”آپ بلاوجہ مایوس ہو رہی ہیں، یہ کپڑے جس کے ہیں اس کے بارے میں ہمیں پتا چلے گا۔“ وہ اتنے

وٹوق سے فرش پر پھیلے کپڑے اٹھاتے ہوئے بولا کہ متا بھرے جذبات آنکھوں سے چھٹک پڑے۔

”آپا! راجا صاحب کی طرف ہمارا حساب نکلتا ہے۔“

”نہ منور دنیا میں ہے اور نہ وسیع پھر کیا فائدہ.....؟“ وہ سسکاری بھر کر بولیں۔

”آپا! میرا دل کہتا ہے کہ ان خاتون کو سب معلوم ہوگا۔“

”وہ دونوں یہاں سے بھاگ گئے تھے، راجا صاحب نے بہت تلاش کیا تھا۔“

”کچھ تو، کچھ تو وصول ہوگا، آپ کی برباد زندگی کا کچھ تو حاصل ہوگا۔“ وہ الجھا الجھا سا یہ کہہ کر چار پائی پر

بیٹھ گیا..... تب وہ آگے بڑھیں اور صندوق کی تہ سے لگا کاغذ پلٹ کر ایک بوسیدہ سالقا فہ نکال کر اس کے پاس

آٹھنٹھیں پھر ایک ایک کر کے آٹھ دس تصویریں اسے لفافے سے نکال کر پکڑا دیں۔

”میری مجرم ایک ہی تھی.....“ وہ بولیں۔

”لیکن اس جرم میں جنہوں نے ان کی مدد کی انہیں حساب دینا ہوگا۔“

”راجا صاحب کا بھی بہت تصور نہیں تھا بس منور ہی ہر جانی ہو گیا تھا۔“ آپا کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

”آپا! آپ کے سارے دکھوں کا نہیں کچھ نہ کچھ کا حساب کتاب ضرور کراؤں گا۔“ وہ یہ کہہ کر سب

تصویریں لیے باہر چلا گیا..... آپا کے حلق سے سسکیوں نے احتجاج کا راستہ اختیار کیا..... وہ ماضی کی کریناک

یادوں سے لپٹ کر باقاعدہ رونے لگیں، مدیجہ پریشان ہو کر کمرے میں آئی اور غیر معمولی صورت حال دیکھ کر

ان سے لپٹ گئی۔

”آپا! آپا!“

”ہونہہ۔“ یہ مشکل ان کی آواز نکلی۔

”کیا ہوا.....؟“ وہ بولی۔

”میرا بچہ، میرے جگر کا ٹکڑا۔“ روتے روتے وہ صرف اتنا ہی بولیں..... مدیجہ سمجھ گئی کہ انہیں اپنا منایا

آ رہا ہے۔

”آپا! آپ نے تو صبر کر لیا تھا..... آج.....؟“ وہ کہتے کہتے رکی۔

”صبر جدائی پر کیا تھا، انتظار کے لیے نہیں۔“ وہ اس کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں.....

مدیجہ کوتلی دینے کے لیے الفاظ جمع کرنے میں مشکل ہو گئے۔

☆☆☆.....☆☆☆

گاڑی کا ہارن سن کر رابعہ کو اندازہ ہو گیا کہ ریحان اختر آگئے ہیں۔ بند سوٹ کیس اٹھا کر دیوار سے لگا دیے اور بیڈ پر رکھے کھلے بیگ کی زپ بند کر کے اسے بیڈ کے نیچے دھکیل دیا۔ غیر ضروری مصروفیت دکھانے کے لیے وارڈروب کھول کر دائیں بائیں ہاتھ مارنے لگیں۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور ریحان اختر اپنے پرسٹل ڈرائیور کے سہارے اندر داخل ہوئے، چہرے پر چھوٹے بڑے زخم جن پر کوئی میڈیسن لگی ہوئی تھی، وہ اس باتوں پر کلاسیوں تک پہنچ رہی تھی۔ کمزور اور نڈھال سے بستر پر بہ مشکل لیٹ سکے۔ رابعہ دروازہ حیرت سے اس وقت باہر گئیں جب انہوں نے ڈرائیور کو جانے کی اجازت دی اور ہلکے سے انہیں پکارا۔ وہ کچھ حیرتی سے ریل کر ان کے قریب آگئیں یہ موقع ہی عجیب تھا۔

”رابعہ! بوا کو میرے پاس بھیج دو۔“ انہوں نے کراہتے ہوئے کہا مگر بوا خود مضطرب سی حالت میں وہیں آگئیں۔ رابعہ نے باہر جانے کے خیال سے قدم اٹھائے تو انہوں نے روکنے کی سی ملتس نگاہوں سے دیکھا۔ وہ رک گئیں۔

”یہ سب کیا ہے؟“ بوانے اُن سے پوچھا۔

”کہانی کا آخری سین۔۔۔۔۔“ وہ رنجیدہ سے ہو گئے۔

”تمہیں کیا ہوا ہے یہ زخم، یہ پٹیاں۔۔۔۔۔؟“ بوا بے قراری تھیں۔

”بوا! وہ مرتے مرتے مگر مجھے جیتنے نہ دیا۔“ ایک دم شدت جذبات سے اُن کی آواز گلوگیر ہو گئی، دو موٹے موٹے آنسو آنکھوں سے ڈھلک کر تکیے میں جذب ہو گئے۔

”نیناں مر گئی۔۔۔۔۔؟“ بوا چلا اٹھیں۔

”خدا نہ کرے، میری نیناں تو نہیں ہے، وہ کسی اور کی نیناں تھی؟“ وہ جذباتی ہو گئے۔

”پھر کیوں اسے جبر کی قید میں رکھا؟“ بوا کی زبان پر شکوہ مچل گیا۔ رابعہ کے لیے یہ سب باتیں پریشان کن تھیں طبیعت بوجھل ہو گئی تھی۔ دل چاہا یہاں سے چلی جائیں مگر ریحان کی نظریں شاید تاڑ لیتی تھیں۔

”بوا! اس ضدی نے خود کو آگ لگالی، میری لاکھ کوششوں کے باوجود وہ راکھ کا ڈھیر بن گئی۔۔۔۔۔ میں ہار گیا۔۔۔۔۔ میں ہار گیا۔۔۔۔۔“ بے اختیار ہی وہ رونے لگے اور ہاتھ بیڈ کی پٹی پر مارنے لگے۔

”کیا کر رہے ہیں ریحان؟“ رابعہ یکدم انہیں مخاطب کر کے چلا میں۔۔۔۔۔ ”زخمی ہاتھوں کو سزا دینے سے کیا حاصل ہے؟“

”یہ ہاتھ بھی گناہ گار ہیں رابعہ!“

”اللہ سے معافی مانگیں، جو ہو چکا اس پر توبہ کر لیں۔“ رابعہ یہ کہہ کر وہاں سے باہر نکل آئیں۔ مزید وہاں ٹھہرنے کا ان میں حوصلہ نہیں رہا تھا۔ انہیں تو سخت ذہنی صدمہ پہنچا تھا کہ ایک عورت نے جل کر جان دے دی، قید میں رہ کر موت کو گلے لگا لیا مگر ریحان اختر کی مرضی پوری نہ ہونے دی۔

”ریحان اتم نے اچھا نہیں کیا، محبت پیسے سے نہیں خریدی جاتی، حالات نے جس طرح بھی اسے آپ تک پہنچایا تھا، آپ کو خیانت نہیں کرنی چاہیے تھی، وہ جل کے مر گئی، کیا ملا آپ کو؟“ دیکھی دل اور سلگتے ذہن کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی وہ سوچ رہی تھیں کہ بوانے آکر پشت سے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ

چونکیں۔

”جی۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے پوچھا مگر انداز اجنبی تھا۔

”ریحان لوٹ آیا ہے۔“

”نیناں نیناں لوٹ گئی ہے، ریحان کے بت کو کرچی کرچی کر کے۔۔۔۔۔ بہت بہادر تھی مگر مجھے اس کے جانے کا افسوس ہے۔“ رابعہ بولیں۔

”ارے کیوں؟ خوشی مناؤ ریحان تمہارا ہو گیا۔۔۔۔۔“ بوانے بہت خوشی کا اظہار کیا تو رابعہ کو اچھا نہیں لگا۔

”بوا! وہ انسان تھی ریحان کی صدا اور خواہش نے اسے مار ڈالا، آپ کو اس سے ہمدردی نہیں۔“

”اپنی بی بی سے وفاداری کا تقاضا یہی ہے۔“

”یہ خود غرضی ہے۔“ انہوں نے احتجاج کیا۔

”کچھ بھی کہو، مجھے وہ پسند ہے جو ریحان کو پسند ہے۔“

”مطلب۔۔۔۔۔؟“

”ریحان کئی روز اسپتال میں رہ کر آیا ہے، میں اس کے لیے تختی بناتی ہوں۔“ وہ یکسر رابعہ کی بات نظر انداز کر کے کچن میں چلی گئیں تو وہ جھنجھلا کر اُن کے پیچھے ہی آگئیں۔

”بوا! آپ کو ایسا کیوں لگا کہ مجھے اس کی چھوڑی ہوئی جگہ پر رہنا ہے، میرا سامان بندھ چکا ہے۔“

”دیکھو رابعہ بیٹی! وہ مر چکی ہے، اپنا گھر اب کیوں چھوڑنا۔۔۔۔۔؟“ وہ فریج سے چکن نکالتے ہوئے بولیں۔

”ہونہہ! اس کے مرنے کے بعد جگہ خالی ہے کا بورڈ لگائیں ریحان اختر، مجھے ایسے دو غلے آدمی کے ساتھ نہیں رہنا۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں کہہ کر کچن سے باہر نکلیں۔

”اس حال میں ریحان کو چھوڑ کر جاسکتی ہو؟“ انہوں نے پکارا، وہ پلٹیں۔

”انتہا حق نہیں رکھتے ریحان، میں نیناں کو لے کر ابھی چلی جاؤں گی، ویسے بھی کل دادی کا چہلم ہے۔“ وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئیں۔ بوا افسردہ سی ہو گئیں۔ رابعہ کی بات بھی حق پر مبنی تھی۔ ریحان نے جس طرح اذیت دی تھی اس کے بدلے میں اور کیا توقع کی جاسکتی تھی۔

☆☆☆.....☆☆☆

نیناں کو انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔۔۔۔۔ یونیورسٹی سے آتے ہی اسے چنچ کرنے کو کہا اور ایک سوٹ کیس جس میں نیناں کے اور ان کے کپڑے تھے فیضو سے گاڑی میں رکھوایا۔ باقی ریحان کے کمرے میں موجودگی کے باعث کچھ سوچ کرنی الحال چھوڑ دیے۔ نیناں کو کچھ بھی نہ بوا سے پوچھنے کا موقع ملا تھا اور نہ بابا سے۔ پورچ میں دھول مٹی سے اٹی گاڑی دیکھ کر وہ جان چکی تھی کہ بابا آچکے ہیں مگر ماما کا رویہ بڑا سپاٹ اور تند تھا اس لیے اس نے پوچھنے کی جسارت نہیں کی۔

انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے ریورس کی تو عین اسی وقت طلال کی گاڑی گیٹ کے سامنے آگئی۔۔۔۔۔ نیناں کو ذہنی جھٹکا لگا، مدیحہ اس کے برابر بیٹھی تھی اسے دیکھ کر نظریں چرا گئی۔ طلال نے ان کے لیے راستہ چھوڑا

اور مسکرانے لگا۔

”مما! پلیز ایک منٹ.....“ اس نے تلملا کر گاڑی رکوائی اور غصے سے دروازہ کھول کر باہر نکلی تھی۔ طلال نے بیک ویو مرر سے اس کا ارادہ بھانپ لیا تھا اس لیے دروازہ کھول کر بڑی ادا سے کھڑا ہو گیا۔

”مدیحہ! اسٹوپڈ، پاگل ہو گئی ہو تم۔“ نیناں نے طلال کے بجائے کھڑکی پر جھک کر مدیحہ کو مخاطب کیا۔ ”اے چڑیا! مدیحہ اس وقت میری مہمان ہیں، تمیز سے بات کرو۔“ طلال اس کی طرف گھوم کے آ گیا۔ ”طلال بھائی! اس معصوم کے حال پر رحم کھائیں، میرا انتقام میری سہیلی سے نہ لیں۔“ اس نے کچھ سوچ کر نرمی اختیار کی۔

”ارے واہ! بھئی تو کون، میں خواجواہ والی بات ہے، میں مدیحہ کو پسند کرتا ہوں، تم کہاں سے درمیان میں آ گئیں.....؟“ وہ تسخرانہ انداز میں بولا تو وہ شرمندہ ہو کر آخری بار مدیحہ سے بولی۔

”پلیز! مدیحہ سمجھنے کی کوشش کرو، گاڑی سے باہر آؤ، میرے ساتھ چلو۔“ ”آپ چلتی پھرتی نظر آئیں بی چڑیا، ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہے۔“ طلال نے.... اس کی بات کا جواب دیا۔

”مدیحہ! اپنی اماں کا آپا کا ہی خیال کر لو، وہ سن کر کتنی دکھی ہوں گی۔“ نیناں نے آخری کوشش کی تو مدیحہ نے لب ہلائے۔

”نیناں! آپا کو طلال کے بارے میں پتا ہے، تم میری اچھی سہیلی ہو پلیز.....“ ”نو، نیور، خبردار جو تم نے مجھے سہیلی کہا۔“ نیناں نے اس کا جملہ اچک کر غصے سے کہا اور تیز قدموں کے ساتھ واپس لوٹ آئی۔

”یہ مدیحہ ہے نا.....؟“ رابعہ نے اس کے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد گاڑی اشارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”مما! طلال بھائی اچھا نہیں کر رہے، وہ مجھے جلانے کے لیے مدیحہ کے ساتھ فلرٹ کر رہے ہیں۔“ ”سو وہاٹ! رابعہ مطمئن رہیں۔“

”مما! مدیحہ کے گھر والے ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے؟“ ”جو ہو رہا ہے ہونے دو، طلال سے ہماری جان تو چھوٹی ہے۔“ وہ بولیں۔ نیناں کو ایسا لگا کہ مما کو کسی سے کوئی غرض نہیں رہی انہیں حالات نے اس قدر بے حس بنا دیا ہے شاید کہ وہ اس طرح سوچنے لگی ہیں، ایسے موقع پر بحث کا فائدہ نہیں تھا..... کچھ راستہ خاموشی میں کٹ گیا۔

”مما! بابا کب آئے؟“ ایک دم ہی اس نے پوچھا۔ ”یاد نہیں.....“

”کیا مطلب.....؟“ ”میں نے وقت نہیں دیکھا تھا۔“

”میں مل کر نہیں آئی، وہ ناراض ہوں گے۔“ ”نہیں، اب وہ ناراض نہیں ہوں گے۔“

”بابا ٹھیک تو ہیں۔“

”کچھ زخمی ہیں، بہت بڑے حادثے سے گزر کر آئے ہیں۔“ عجیب ذومعنی جملہ تھا وہ یگانگت کچھ پریشان سی ہوئی مگر گاڑی گیٹ پر پہنچ چکی تھی۔ اس لیے خاموش ہو گئی۔

☆☆☆.....☆☆☆

جونہی اس نے گھر میں قدم رکھا اکبری بیگم نے دو سٹروں سے اس کا استقبال کیا۔ منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیے۔ ہال کوچ ڈالے، ایسا جنون ان پر طاری تھا کہ وہ اسے جان سے مار ڈالتیں، جتنی دیر میں آپا سلام پھیر کر باہر آئیں اتنی دیر میں ٹوانہوں نے مدیحہ کو ادھ موا کر دیا۔ گھنٹوں کا انتظار شدید اشتعال میں بدل گیا تھا۔

”بس کرو، جان سے مارو گی کیا؟“ آپا نے کھینچ کر انہیں پرے کیا۔ مدیحہ کی بری حالت ہو چکی تھی۔ ”اسے مار ڈالنا بہتر ہے، یہ رسوائی کرائے گی، زلفی کو پتا چل گیا تو وہ اسے دفن کر دے گا۔“ اکبری بیگم نے روتے ہوئے کہا۔

”مدیحہ! کیوں گئیں تم گھر سے..... میرے منع کرنے کے باوجود.....؟“ آپا نے اس کے بے ترتیب بالوں کو سنوارتے ہوئے پوچھا۔

”وہ.....“ ”یہ کیا بتائے گی؟ اس کا دماغ چل گیا ہے، رہنا جھوپڑے میں خواب محلوں کے۔“ اماں نے جھلا کر کہا۔ ”تم بتاتے گھر سے نکل گئیں اتنا بھر دسا ہے اس پر؟“ آپا نے حیرت و تاسف کے ساتھ اسے دیکھا۔ ”اپنی کزن کو چھوڑ کر وہ اسے بدھو بنا رہا ہے، آج زلفی آجائے میں اسے لے کر جاتی ہوں، منہ توڑ کے آؤں گی اس کا۔“ اماں یہ اعلان کر کے کمرے میں چلی گئیں۔

”آپا، اس میں برائی کیا ہے؟“ وہ بولی۔ ”وہ دھوکا ہے، ہمیں بے وقوف بنانا ہے۔“ ”نہیں.....“

”ٹھیک ہے پھر اس سے پوچھ لینے میں کیا حرج ہے؟“ آپا نے اماں کی بات کی تائید کی تو وہ پریشان ہو گئی۔

”نہیں، ابھی نہیں، نیناں مجھ سے خفا ہو گئی ہے۔“ ”اور پھر بھی..... پھر بھی وہ ٹھیک ہے۔“ آپا نے تعجب سے کہا۔ ”نیناں کو طلال سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔“

”پھر غلط کہا، وہ اس کو تم سے بہتر جانتی ہے۔“ آپا نے خاصے غصے سے کہا۔ ”وہ میں جانتی ہوں کہ وہ کیوں ایسا کرتی ہے؟“ وہ کچھ نرم لہجے میں بولی۔ ”اب ایسی حرکت ہرگز نہیں کرنا۔“ وہ سختی سے کہہ کر وہاں سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔ ”نہ اس گھر کے حالات بدلیں گے نہ کچھ بہتری آئے گی، اسی لیے تو بڑے گھروں اور چھوٹے گھروں کے درمیان فاصلے رہتے ہیں۔“ وہ کہتے ہوئے ان کے ساتھ ہی باورچی خانے میں آ گئی۔

”یہ فاصلے قدرتی ہیں اور اچھے ہیں، بڑے جانور چھوٹے جانوروں کو نگل جاتے ہیں۔“ انہوں نے چائے کا پانی چو لھے پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔
”یہ ہم چھوٹے گھروں میں رہنے والے بڑے گھروں پر الزام لگاتے ہیں۔“ وہ بولی تو آپا نے اسے گھور کر دیکھا اور بولیں۔

”الزام نہیں لگاتے، حقیقت سے گزرتے ہیں، میں گزری ہوں تلخ حقیقت سے۔“
”بس، بس آپا رہنے دیں، آپ پھوپھا جی کی بے وفائی کی سزا سب کو دیں۔“ وہ یہ کہہ کر پاؤں پٹختے ہوئے اندر چلی گئی مگر آپا کی آنکھیں حیرت و افسوس سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ کس قدر گستاخ اور بے ادب ہو گئی ہے، یہ تو ایسی تبدیلی تھی کہ جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ آج تک مدیحہ نے آپا کی پرستش کی تھی، یہ کیسا موڑ آیا تھا زندگی میں کہ وہ اس طرح دو بدو ہو گئی۔
”طلال نے اس پر کون سا سحر پھونک دیا ہے۔“ وہ صرف بڑا کر رہ گئیں، دل اچاٹ ہو گیا بنا چائے بنائے چو لھا بند کر کے کمرے میں آ گئیں۔

☆☆☆.....☆☆☆

رابعہ کی زبانی ریحان کی کہانی سن کر عارفہ متحیر رہ گئیں۔ گم مگم کچھ دیر انہیں دیکھتی رہیں رابعہ کو ہلکی سی ہنسی آ گئی۔

”آپ کو یقین کرنے میں دشواری ہو رہی ہے نا؟“
”راہی! ریحان اب قابلِ رحم ہے، اس کے سچ پر ہی معاف کر دینا چاہیے۔“ وہ تھل سے بولیں۔
”ہونہہ، کون سا سچ.....؟ مجھ سے محبت کی قسمیں کھا کی تھیں، مجھ سے دھوکا دہی کی، شدید ذہنی، جسمانی اذیتیں دیں، وہ سچ ہے یا یہ.....؟“
”سب کو چھوڑ کر صرف اس بات کا یقین کرو کہ وہ اب صرف تمہارا ہے۔“
”یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔“ رابعہ نے بہت آہستگی سے کہا تا کہ نیناں نہ سن سکے مگر اس نے شاید سن لیا تھا، دھیرے سے قریب آ کر ماں کی گود میں سر رکھتے ہوئے بولی۔

”مما! میرا دل چاہتا ہے کہ کبھی تو میں اپنے ممما، بابا کے ساتھ خوشی کے لمس کو محسوس کروں، سب کی طرح دونوں کے درمیان رہوں۔“ دل میں دلی خواہش نے لفظوں کا روپ دھارا۔
”بیٹا یہ خواہش آپ کو کرنی ہی نہیں چاہیے۔“ رابعہ نے محبت سے کہا۔
”مما! جو کچھ آپ نے عارفہ خالہ کو بتایا ہے، وہ سچ بھی ہے تو پلیز میری خاطر.....“ نیناں کے اندر سہم تھا وہ رو دی۔

”اب تک آپ کی خاطر ہی کیا ہے۔“
”تو اس کا پھل بھی اللہ نے دیا ہے، ریحان لوٹ آئے ہیں.....“ عارفہ نے کہا۔
”کسی کی موت کے بعد..... یہ پھل میرے ضمیر کے لیے بوجھ ہے۔“
”اس میں تمہارا تو ذرا سا بھی قصور نہیں۔“

”سزا تو میں نے اور میری نیناں نے پائی ہے۔“
”راہی! اس احساس کو یوں محسوس کرو کہ ریحان اب صرف تم دونوں کے ہیں۔“ عارفہ آپا نے پیار سے کہا۔

”چھوڑیں! فی الحال ریحان کے بارے میں خود کو کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔“ وہ بولیں۔
”اس وقت ہی تو پہلے سوچنے کی ضرورت ہے میری جان! عارفہ بولیں۔“
”عارفہ بی بی، رمان پوچھ رہے ہیں کہ فرشی چادریں کتنی منگوانی ہیں۔“ گلو نے آکر پوچھا تو ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا..... عارفہ اٹھ کر چلی گئیں تب نیناں نے ترمیم بھری نگاہوں سے رابعہ کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر عجیب سا حزن تھا، افسردگی تھی، وہ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر ان سے لپٹتے ہوئے بولی۔

”مما! ہم یہیں رہیں گے، بابا کے پاس نہیں جانا۔“
”نیناں! وہ یہ اجازت کہاں دیں گے؟“
”میں ان سے ملنا بھی نہیں چاہتی، میں آپ کی بیٹی ہوں۔“ یکدم اس قدر مضبوط فیصلہ سنا کہ وہ وہاں سے اٹھ کر سیدھی رابعہ کے کمرے میں چلی گئی۔

”کیا کہہ رہی تھی نیناں.....؟“ عارفہ نے واپس آکر پوچھا۔
”پاپ سے متفر ہو گئی ہے، وہاں جانا نہیں چاہتی۔“ رابعہ نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔
”اچھی طرح سے سوچ لو۔“ عارفہ فکر مندی سے بولیں۔

”یہ تو طے ہے کہ ریحان کو معاف نہیں کیا جاسکتا۔“ رابعہ بیزار سی ہو گئیں..... ان کا انداز تو دیکھ کر عارفہ نے اس وقت خاموش رہنے میں بہتری جانی..... انہیں پیار سے پھکی دے کر ڈھیر سا راحو صلہ دیا اور ایک بار پھر وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں تو رابعہ نے تھکے ذہن کو سکون دینے کے لیے صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆.....☆☆☆

”آہا! آف توبہ، میرے اللہ!“ آنکھ اک دلخراش آہ کے ساتھ کھلی تو زبان سے یہ جملہ نکلا..... بوانے جھٹ محبت سے ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”نیناں نے اچھا نہیں کیا، مجھ سے پوچھا بھی نہیں، میرے لیے جل کر مرنے کا اہتمام کیا، بوا اس نے اچھا نہیں کیا۔“ بوا کو محسوس ہو گیا کہ وہ ہر لحاظ سے کمزور ہو گئے ہیں۔ لب کچلتے ہوئے جو یاسیت اور دکھ ان کے چہرے پر تھا وہ آج سے پہلے انہوں نے نہیں دیکھا تھا۔

”اسی لیے آگ سے دور رہنے کو ہم نے کہا تھا، اس لڑکی نے ہمارے سامنے تم پر تھوک پھینکا تھا مگر جانے پھر بھی تمہیں نہ غصہ آیا نہ دکھ ہوا۔“ بوانے ماضی میں جھانک کر انہیں بھی احساس دلایا۔
”عشق جو ہو گیا تھا، سچ پوچھیں تو اس کے غصے اور نفرت سے ہی عشق بڑھتا گیا مگر.....“ بولتے بولتے وہ چپ ہو گئے۔

”تم نے خالی کمرے میں رابعہ کی کمی محسوس نہیں کی، نیناں کو یاد نہیں کیا؟“ بوانے ان کا دھیان بانٹا تو وہ کربناک سے انداز میں مسکرا دیے۔

”رابعہ رات بھر کمرے میں نہیں آئی، اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اپنے گھر جا چکی ہے۔“ اُن کے لہجے میں موجود نارسائی کا دکھ بڑا یقینی سا تھا۔ گویا وہ جان کر تسلیم کر چکے تھے کہ رابعہ اپنے گھر جا چکی ہیں۔

”رابعہ کا یہی گھر ہے، اسے تم نے یاد دلانا ہے۔“

”وہ بھی ضدی ہے، نیناں کی طرح۔۔۔۔۔“ وہ شکست خوردہ سے ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئے۔

”نیناں کو بھول جاؤ اس کا ذکر بھی رابعہ کے سامنے نہیں کرنا، اپنی بیٹی نیناں کو ماں سے دور نہ کرو۔“ بوانے سختی سے تنبیہ اور تاکید کی۔

”مگر رابعہ کبھی فیصلہ نہیں بدلے گی۔“

”وہ تم سے محبت کرتی ہے تم نے بڑی زیادتی کی پھر بھی اسے تم مناسکتے ہو، لا سکتے ہو۔“ بوا حوصلہ ہی دے سکتی تھیں وہ اداس نظروں سے انہیں دیکھنے لگے بھی انہوں نے یاد دلایا۔

”آج رابعہ کی دادی کا چہلم ہے، ہمت پکڑو جاؤ، اس کا بھی بہت اثر ہوگا۔“

”اچھا، پہلے ڈاکٹر سے ملنا ہے۔“ انہوں نے رضا مندی ظاہر کی۔ بوا خوش ہو گئیں۔

”میں ناشتا بنواتی ہوں اٹھو شاپاش۔“ بوانے اٹھتے ہوئے کہا، عین اسی لمحے فیضو نے دو خواتین کے آنے کی اطلاع دی۔

”کون ہیں۔۔۔۔۔؟“ بوانے فیضو کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

”پتا نہیں بس کہہ رہی ہیں کہ بوا کو یا پھر بڑے صاحب کو بلا دو۔“ فیضو نے کہا اور بچن میں گھس گیا۔ بوا نے ڈرائنگ روم کا رخ کیا لیکن پھر وہ فیضو کے پاس آئیں چائے لانے کو کہا۔۔۔۔۔ ان کا اندازہ تھا کہ رابعہ سے ملنے آئی ہوں گی۔

ڈرائنگ روم کا بھاری سا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئیں تو دو خواتین کو صوفے پر سٹے بیٹھا دیکھ کر اجنبی سی مسکراہٹ کے ساتھ سلام کیا۔ ان دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

”علیکم السلام۔۔۔۔۔“

”جی آپ کو شاید رابعہ سے ملنا ہے؟“ بوانے متانت سے پوچھا۔

”نہیں، صرف آپ سے ملنا ہے، راجا ریحان اختر سے ملنا ہے۔“ سفید چادر میں لپٹی آپا نے سنجیدگی سے کہا۔

”ریحان کی طبیعت ٹھیک نہیں، آپ کو کوئی مدد چاہیے تو۔۔۔۔۔“ بوانے اُن کے ظاہری سادہ سے لباس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم کوئی چندہ مانگنے نہیں آئے، آپ نے غور سے دیکھا نہیں، مجھ سے تو آپ بخوبی واقف ہیں۔“ آپا نے چہیتے ہوئے الفاظ جمع کیے تو بوا ٹھنکیں۔

”بیٹا آپ کی اور میری پیدائش میں بہت فرق ہے، آپ بتادیں۔“

”بوا! راجا صاحب کی ایک بیٹی تھی وسیہ، اس کی سہیلی عزیز سہیلی زینت تو آپ کو یاد ہوگی؟“

”ہا، ہا، ہا، مگر۔۔۔۔۔“ حیرت و ہرجوہاسی میں وہ کچھ اور نہ بول سکیں۔

”اس گھر کی طرف میرا کچھ حساب نکلتا ہے یہ تو جانتی ہیں آپ۔۔۔۔۔؟“ آپا نے تحمل سے جملہ مکمل کیا۔

”کیسا حساب؟ وہ تو دنیا میں ہی نہ رہے۔“

”جانتی ہوں، ایمان داری سے بتاؤ یہ طلال کون ہے؟“

”زینت! وسیہ کا بیٹا ہے۔“ وہ دھیرے سے کہہ گئیں۔

”تو پھر میرا کچھ کہاں ہے؟“ آپا کا گلارہ بندھ گیا۔

”وہ مجھے نہیں معلوم۔۔۔۔۔“ وہ مکر گئیں۔

”تو بلائیں راجا ریحان اختر کو۔۔۔۔۔ انہیں تو معلوم ہوگا۔“ زینت چلائیں۔

”جب شوہر بچہ لے کر بھاگا تھا تب کیوں لے جانے دیا تھا۔“ ایک دم ہی ریحان اختر نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے سختی سے کہا۔

”اسے تو میری عزیز سہیلی نے دام الفت میں پھانس لیا تھا، سہیلی کا شوہر چھین لیا، بچہ چھین لیا۔۔۔۔۔“ آپا کو غصہ آ گیا۔

”بہت زمانے ہو گئے اس بات کو۔“ بوانے مداخلت کی۔

”مگر اس گھر سے زخم ملنے کا سلسلہ جاری ہے۔“ آپا بولیں۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”طلال آپ کا بھانجا میری بیٹی مدیحہ کے بیچھے پڑا ہے، مدیحہ، نیناں کی سہیلی ہے۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟“ ریحان اختر کو حیرت نے چھوڑا۔

”ہم طلال کو سمجھا دیں گے۔“ بوانے جواب دیا۔

”اور میرا بیٹا۔۔۔۔۔“ آپا چلائیں۔

”اس ممتا کی ماری پر رحم کرو، ساری زندگی بیوہ بن کر گزاری ہے، بیٹے کے لیے تڑپ رہی ہے۔“ اکبری بیگم نے جذباتی ہو کر کہا تو ریحان اختر مزید وہاں نہیں ٹھہر سکے۔ شدید غصے میں وہاں سے چلے گئے۔

”بہت افسوس ہے، وسیہ نے اچھا نہیں کیا تھا۔ ہماری بی بی کو بھی اس بات کا رنج تھا۔“

”مجھے صرف اپنے بیٹے کا انتظار ہے، اس کے بارے میں آپ دونوں ہی کچھ بتا سکتے ہیں۔“

”ریحان کو حقیقت معلوم نہیں ہے۔“ بوا فقط اتنا بولیں۔

”تو آپ کو تو معلوم ہے، آپ تو ہر راز سے واقف ہیں۔ کیا، کیا نہ ستم کرایا وسیہ نے مجھ پر اپنی دولت سے خریدا بھی تو غریب سہیلی کے سہاگ کو۔“ آپا کا قاعدہ رونے لگیں۔

”وسیہ کے ساتھ تمہارا شوہر بھی قصور وار تھا، دولت کی چمک نے اس کو اندھا کر دیا تھا۔“ بوا بولیں۔

”مگر کیا سہیلی اس کو کہتے ہیں؟ میرے اعتبار کو چکنا چور کر دیا اور میرا معصوم بچہ۔۔۔۔۔ یہ طلال واقعی وسیہ کا بیٹا ہے۔“

”ہاں، وہ میں ریحان سے کہہ کر اس کے کان کھنچواتی ہوں آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔“ یوانے جلدی جلدی کپڑے کے تھان کے مانند ساری بات لکھتی اسی اثنا میں فیضو چائے لے آیا مگر ان دونوں نے معذرت کی اور بنا چائے پیے چلی گئیں۔ بوا اضطرابی کیفیت میں ریحان اختر کے کمرے کی طرف چل دیں لیکن وہ فون پر غم و غصے کے ساتھ بات کر رہے تھے۔

☆☆☆.....☆☆☆

تین آدمی اور تینوں اپنی اپنی جگہ خاموش..... اکبری بیگم آپا کے غم پر چپ چاپ سبزی کاٹ رہی تھیں..... آپا تخت پر لیٹی برآمدے کی چھت گھور رہی تھیں، کھویا ہوا احساس درد کے ساتھ ان کے سارے وجود پر طاری تھا۔ اب تک جس پردے میں صدے چھپا رکھے تھے وہ بھی تار تار ہو گیا تھا..... بیٹا ملنے کی سب امیدیں دم توڑ گئیں۔ پہلے بھی وہ یہ حقیقت قبول کر چکی تھیں کہ وہ دونوں مر چکے ہیں ساتھ میں بچہ بھی مر گیا ہوگا..... مگر جب سے طلال کا زکریا تھا تب سے یہ خواہش اندر ہی اندر بے کل کر رہی تھی کہ یہ کس کا بیٹا ہے؟ لیکن بوا کے صاف انکار سے تو یہ واضح ہو گیا تھا کہ ان کا بیٹا نہ جانے کہاں گیا؟ حادثے کا شکار ہو گیا یا پھنسا گیا..... مدیحہ نے کمرے کی کھڑکی سے ان کی دیران آنکھوں سے بہتے اشک دیکھے تو رہا نہ گیا باہر آ کر ان کے سینے پر سر رکھ دیا۔

”اگر میری ذرا سی بھی عزت ہے تمہارے دل میں تو راجا خاندان کے کسی فرد سے بھی نہیں ملنا۔“ وہ گلوگیر لہجے میں فقط اتنا بولیں۔

”کیا، کیا ہوا آپا، آپ دونوں جب سے آئی ہیں اس قدر خاموش کیوں ہیں؟“

”صرف خاموش ہیں، مر نہیں گئے۔“

”بات کیا ہے؟“ وہ فکر مند ہو گئی۔

”طلال، وسیہ کا بیٹا ہے، اس سہیلی کا بیٹا جس نے میرا گھر برباد کیا۔ طلاق کے کاغذات بھجوائے اور وہ سفاک میرا بیٹا چھین لے گیا..... اس کے بیٹے سے ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔“

”یہ تو میں نے بتایا تھا کہ طلال نیناں کی پھوپھو کا بیٹا ہے۔“ مدیحہ نے کلیر کرنا چاہا۔

”کاش وہ اس کا بیٹا نہ ہوتا۔“ اکبری بیگم صحن میں سے تار پر سوکھے دسترخوان اتارنے آئیں تو اس کی بات سن کر طنز یہ بولیں۔

”آپ دونوں نیناں کے گھر گئی تھیں.....؟“ وہ پریشان ہو گئی۔

”ہاں! اور اب کسی نیناں کا اس گھر میں ذکر نہیں ہو، نیناں کی پھوپھو نے تمہاری آپا کا گھر اجاڑا ہے سمجھیں تم.....“ اکبری بیگم نے زور سے کہا تو وہ سنائے میں آ گئی..... سب خواب بکھرتے ہوئے دکھائی دیے۔ ایک دکھ اور نفرت کا سا احساس رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

”آپا! آپ غمزہ نہ ہوں، میں اب بھی طلال سے نہیں ملوں گی، نیناں سے بھی نہیں۔“ وہ شدت غم سے تڑپ کر ان سے لپٹتے ہوئے بولی۔

”تمہیں یقین ہے کہ طلال وسیہ کا ہی بیٹا ہے۔“ ڈوبے کو تنکے کا سہارا کے مصداق آپا نے بھی پُر امید لگا ہوں سے اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے دیکھا۔

”ہاں! وہ نیناں کی پھوپھو کا بیٹا ہے۔“ مدیحہ نے کہا تو وہ سرد آہ بھر کے رہ گئیں۔

”آپ! آپ تو میری اچھی آپا ہیں، آپ تو حوصلہ دیتی ہیں، بھول جائیں سب کچھ۔“ مدیحہ نے پیار سے ان کے بال سنوارے تو وہ ضبط نہ کر سکیں پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ مدیحہ کے لیے انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اس کی آواز پر اکبری بیگم دوڑی آئیں۔ عین اسی وقت زلفی کھانا لے کر آگیا، آپا کو روستے دیکھ کر اس کے بھی حواس جاتے رہے۔

”کیا، کیا ہوا ہے.....؟“

”کچھ نہیں بس ویسے ہی.....“ آپا نے ہتھیلی سے رگڑ کر جلدی سے آنکھیں صاف کیں اس سے چھپانا

ضروری تھا۔

”کچھ تو ہے۔“ وہ اڑ گیا۔

”ارے کچھ نہیں ہمارا خیال تھا کہ راجا ریحان کے گھر سے آپا کے بیٹے کا اتنا پتا چل جائے گا مگر بوا کے بقول انہیں کچھ علم نہیں۔“ اماں نے نالے کے سے انداز میں کہا۔

”اور وہ ریحان صاحب کا بھانجا.....؟“

”وہ وسیعہ کا بیٹا ہے۔“ اماں نے دھیرے سے جواب دیا۔

”خیر! آپ لوگوں کو وہاں جانے کی ضرورت کیا تھی، یہ حساب تو مجھے خود لینا ہے۔“ وہ سختی سے بولا۔

”وہ، وہ بس ویسے ہی.....“ اماں اور آپا کی زبان لڑکھڑا گئی، مدیحہ کئی کترا کر باہر نکل گئی..... اصل بات زلفی کو بتانا مناسب نہیں تھا۔

”آپ فکر نہ کریں ایک بار میں ملوں گا ضرور راجا صاحب سے۔“ وہ گہری سوچ میں غلطاں بڑی گہرائی سے بولا۔

”اچھا تم چلو ہاتھ دھو لو میں کھانا نکالتی ہوں۔“ اماں نے اس کا موڈ بدلنے کی خاطر کہا اور باورچی خانے کا رخ کیا۔

☆☆☆.....☆☆☆

رمان کی ڈیوٹی لگائی تھی عارفہ نے کہ قرآن خوانی شروع ہونے سے پہلے طاہرہ پھوپھو اور دعا کو لے کر آنا ہے۔ لہذا وہ بڑی مصروفیت میں سے وقت نکال کر پہنچا۔ گو کہ اس کے دفتر کے ایک دوست بھی مدد کے لیے موجود تھے اور پھر سبجان بھی بڑھ چڑھ کر مردانہ حصے میں مصروف تھے۔ اس کا منوڈ آف ہوا لیکن ٹال گیا۔ البتہ طاہرہ پھوپھو نے دعا کو گھور کر اشارہ کیا۔

”اماں، وہاں میرا کیا کام ہے؟“

”ہاں، بہت کام ہے تمہارا دیکھیں پکانی ہیں تم نے۔“ رمان نے جل کر کہا۔

”دیکھا آپ نے کیسے بات کی ہے۔“ دعا نے ہاں کی طرف دیکھ کر شکوہ کیا۔

”ٹھیک کہتا ہے اس نے۔“ طاہرہ پھوپھو بولیں۔

”مجھے کہیں نہیں جانا، ویسے بھی نیناں وہاں موجود ہے۔“ دعا نے تڑخ کر کہا اور اپنے کمرے کی طرف

چلی گئی، رمان جل بھن سا گیا پیچھے پہنچا اور اس کی لمبی چوٹی پکڑ کر بولا۔

”اپنے دماغ کی کھڑکیاں اب تو کھول لو، تازہ ہوا آئے، بند دماغ سے بسا آتی ہے۔“

”میرا دماغ ہے، آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے مل کھا کر اپنی لمبی چوٹی آزاد کرائی۔

”دعا! فراخ دلی کا مظاہرہ کرو، اب تو یہ رویہ چھوڑ دو۔“ وہ نرم پڑ گیا۔

”کیا ہے مظاہرہ فراخ دلی کا، تمہیں بخش دیا ہے اس امیر زادی کے لیے جو دولت کے باعث تمہیں خرید

سکتی ہے۔“ وہ طنزیہ بولی۔

”شٹ اپ! کیا میں تمہیں بکنے والا لگتا ہوں۔“ وہ چلایا تو وہ چپ ہو گئی۔

”دکھ ہے دعا تم مجھے ایسا سمجھتی ہو۔“ وہ رنجیدہ ہو گیا تو وہ نادم ہی ہو گئی۔

”میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“

”ایسے نہیں سوچتے، خدا گواہ ہے وہ تو کبھی دولت درمیان میں لائی ہی نہیں۔“

”سوری!“

”پلیز آج یہیں سب حاسدانہ جذبے دفن کر دو۔“

”اچھا تم چلو میں آتی ہوں۔“

”ویسے بھی اب تم انکلیڈ ہو، یہ فیصلہ قبول کرو۔“ وہ جتا کر چلا گیا تو اس نے ہتھیلی سے رگڑ کر آنکھوں کی نمی

صاف کی اور اپنی ضدی طبیعت کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر الماری سے سفید گرتہ شلوار نکال کر غسل خانے

میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد چنچ کر کے باہر آئی شیشے کے سامنے کھڑے ہوتے ہی زبان پر شکوے مچل اٹھے۔

”رمان! تمہیں بھی تو خبر ہوگی کہ دریا کے پاس بیٹھے ہوں تو پانی اچھا لگتا ہے، کناروں سے جڑی مٹی سے

پوچھو روگ چاہت کا کیا ہوتا ہے، اس پانی کی چاہت میں کناروں سے اکھڑ کے اجنبی دیسوں میں جانا کتنا

مشکل ہے.....؟ تم نے انکلیڈ سمجھ لیا۔“ کتنے ہی پائیت زدہ لمحے دے قدموں گزر گئے اور شاید مزید گزر جاتے

کہ طاہرہ بیگم کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ بلا رہی تھیں۔

”دعا! دعا! جلدی آؤ، دیر ہو رہی ہے۔“

”آتی ہوں.....“ اس نے بلند آواز میں جواب دیا اور جلدی سے چپل تبدیل کر کے باہر نکل آئی۔

☆☆☆.....☆☆☆

وہ ڈرائیور کے فرنٹ ڈور کھولتے ہی بیٹھنے والے تھے کہ طلال کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ تو وہ غصے

میں کچھ سوچ کر برآمدے تک آگئے۔ جونہی گاڑی سے اتر کر وہ قریب آیا تو وہ برس پڑے۔

”شرم نہیں آتی کسی کی بیٹی پر نظر رکھتے ہو۔“

”کس کی بات کر رہے ہیں آپ.....؟“ پہلی بار شاید اس قدر غصے میں اس نے انہیں دیکھا تھا۔

”نیناں کی سہیلی کی.....“ دانت کچکچائے۔

”اوہ! تو کیا کروں، نیناں نظر ڈالنے نہیں دیتی، کسی پر تو نظر ڈالنی ہے۔“ اس نے تمسخر اڑایا تو انہیں بچھو

نے ڈنک مار دیا۔

”نیناں کا نام بھی زبان پر مت لانا۔“

”کیا بکواس کی تم نے.....؟“ ریحان اختر کا ہاتھ اس کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔ آواز سن کر فیضو اور بو باہر آ گئے۔

”ماموں! بس اب اور کچھ میں برداشت نہیں کروں گا، سچ کی کڑواہٹ نے آپ کو پاگل کر دیا ہے..... میں سب جانتا ہوں کہ مامی کیوں اپنے گھر ہیں، یہ ہاتھوں پر زخم کیسے آئے ہیں؟ ارے اس دلشاد نے صرف پانچ ہزار لے کر سب کچھ بتا دیا تھا..... آپ کی بیٹی سے کون شادی کرے گا؟ رمان کو پتا چل گیا تو نیناں پر تھوک دے گا۔“ وہ خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے گال سہلاتے ہوئے بولتا گیا..... ریحان اختر کی حالت متغیر ہو گئی، چہرہ عرق عرق ہو گیا، خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا، دیوار نہ تھا متے تو چکرا کر گر جاتے..... بوانے بڑھ کر سہارا دیا۔

”طلال! کچھ تو حیا کرو، اس ماموں نے اولاد کی طرح پالا ہے۔“ بوانے بھی خاصے غصے سے کہا۔

”بالا ہے، سمجھا تو نہیں، میں ان کی بیٹی کے لائق نہیں۔“ وہ طنزیہ بولا۔
 ”کیوں، کیوں نام لاتے ہو میری بیٹی کا.....؟“ وہ آپے سے باہر ہو گئے۔
 ”ریحان! تم اپنے کمرے میں چلو، طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ بوانے جلدی سے انہیں اندر لے جانے کی کوشش کی تو وہ زخمی شیر کے مانند غراتے ہوئے اندر چلے گئے کیونکہ سچ مچ طبیعت خاصی خراب ہو گئی تھی، ڈرائیور نے گاڑی لاک کی اور اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

یواریحان اختر کے ساتھ کمرے میں آئیں ان کی حالت فکر مندی کی حد تک خراب لگ رہی تھی..... انہوں نے ڈاکٹر کو فون کیا اور انہیں لٹا کر بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ طمانیت بھری مسکراہٹ اور ممنونیت بھری نگاہوں سے انہوں نے ان کے ماں جیسے شفیق چہرے کو دیکھا، احساسِ عداوت سے آنسو آ گئے۔

”نہیں، راجا ریحان اختر اتنا کمزور نہیں۔“ انہوں نے ان کی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

”افسوس! میں رابعہ کے گھر نہیں جاسکا، وہ بدگمان ہوگی۔“ انہیں ایک دم ہی یاد آ گیا۔

”کوئی بات نہیں، بدگمانی کی گرد چھٹ جائے گی تم ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔“

”طلال کو دیکھا، یہ دو ٹکے کا گندا خون بول رہا تھا، وسیعہ آپا نے اچھا نہیں کیا۔“ وہ ایک بار پھر کھول اٹھے۔

”اچھا بس، اب خاموش ہو جاؤ، طلال اور وسیعہ کا تعلق ہی کیا ہے؟“ انہوں نے دھیرے سے کہا مگر ریحان اختر کو زوردار جھٹکا سا لگا۔

”کیا مطلب.....؟“

”ڈاکٹر صاحب چیک کر لیں تو باتیں کریں گے۔“ وہ بڑی خوب صورتی سے ٹال کر باہر آئیں، ڈاکٹر صاحب آچکے تھے وہ انہیں ساتھ لے کر ریجان اختر کے کمرے کی طرف چل دیں۔

☆☆☆.....☆☆☆

قرآنی خوانی کے بعد کھانا کھلایا گیا..... باہر لان میں مرد حضرات کھانے میں مصروف تھے اور اندر ہال کمرے میں ٹی وی لاؤنج میں خواتین کے لیے کھانا لگایا گیا تھا..... رابعیہ نے خواتین کے درمیان سے اٹھ کر ذرا دیر کو اپنے کمرے کا رخ کیا کیونکہ نیناں کمرے میں تھیں، اسے چپ سی لگی تھی۔

210 ماہنامہ بیا کیڑہ۔ فروری 2012ء

”بھوک تو مجھے بھی نہیں ہے لیکن آپ کے ساتھ کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔“ رابعہ نے بات بٹائی۔
 ”مما! بابا.....“ ایک لمبا وقفہ آیا۔
 ”نہیں آئے.....“
 ”بدا کا فون آیا تھا.....“ نیناں نے بتایا۔
 ”اچھا.....“

”بابا کی طبیعت خراب ہے، ہائی بلڈ پریشر ہے، وہ آرہے تھے مگر.....“
 ”کوئی بات نہیں، کون سا ضروری تھا؟“ رابعہ عجیب سے لہجے میں بولیں۔
 ”صما! میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گی.....“ یکدم غیناں نے مضبوط لہجے میں کہا۔
 ”نہیں، آپ کے بابا کی طبیعت خراب ہے تو آپ کو جانا چاہیے۔“ رابعہ نے دانستہ کہا تا کہ بیٹی کا ذہن
 کچھ متقی نہ سوچے۔

”تب بھی نہیں۔“
 ”وہ خود لینے آجائیں گے پھر؟“
 ”پھر بھی نہیں۔“
 ”اچھا، دیکھا جائے گا۔“ رابعہ بولیں۔

”کیا دیکھا جائے گا؟“ عارفہ مہمانِ خواتین کو رخصت کر کے وہیں آگئیں۔
 ”نیناں بابا کے پاس جانا نہیں چاہتی۔“ رابعہ نے بتایا۔
 ”بریں بات، بڑوں کی باتیں بڑے جانیں، آپ تو ان کی لاڈلی بیٹی ہو۔“
 جس کا نام انہوں نے اپنی محبوبہ کے نام پر رکھا۔ ”نیناں طنزیہ نہں دی۔“
 ”اوہ ہوا ایسی باتیں بیٹیاں نہیں کرتیں، معاف کرو بابا کو۔“ عارفہ نے پیار سے اس کے بال ستوارے۔
 ”بڑی حالہ۔“ وہ ہنسنکی۔

”میرا بچہ بہت سمجھدار ہے۔“ عارفہ نے بہت دلا ر سے چکرا را تو وہ جزبزی ہو گئی۔
 ”راہی خالہ، راہی خالہ!“ رمان آوازیں لگاتا آ گیا۔
 ”کیا بات ہے؟“

”یہ دیکھیں، آپ سے ملنے کون آیا ہے؟“ رمان یہ کہہ کر دروازے سے ایک طرف ہو گیا تو بڑے ابا اور سبحان کمرے میں داخل ہو گئے۔۔۔۔۔ عارفہ اور رابعہ احتراما کھڑی ہو گئیں۔

”آئیں، بیٹھیں پلیز!“

”بس رابعہ بیٹی تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔“ بڑے ابا نے شفقت سے رابعہ کے سر پر ہاتھ پھیرا.....

ماہنامہ پاکیزہ۔ فروری 2012ء (211)

رمان نے نیناں کی جانب دیکھ کر دائیں آنکھ دہائی اور دونوں کمرے سے چلے گئے۔
 ”ارے بیٹھیں تو سہی! رابعہ اور عارفہ نے ایک ساتھ کہا تو وہ دونوں ٹویٹر صوفے پر بیٹھ گئے۔
 ”رابعہ بیٹی! یہ تمہارا کمال ہے کہ یہ نالائق شادی کے لیے راضی ہو گیا۔“ بڑے ابا کی خوشی دیدنی تھی البتہ سبحان صرف سنجیدہ سے تھے۔
 ”اس میں کمال کی کیا بات ہے؟“
 ”نہیں بیٹی یہ تو سب کچھ بیچ باج کر جا رہا تھا، تمہارے کہنے پر شادی کر رہا ہے، اب اکیلا جائے گا اور سب کچھ سمیٹ کر اسٹینڈی دے کر آ جائے گا۔“
 ”اچھا، یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔“ عارفہ بولیں۔
 ”ہاں! بہت مبارک ہو۔“
 ”اب آنے والے جمعے کو نکاح ہے اور ہفتے کو ولیمہ۔“ بڑے ابا نے تفصیل پیش کی۔
 ”ماشاء اللہ! اللہ مبارک کرے۔“ عارفہ نے دعا دی۔
 ”شکریہ.....“ پہلی بار سبحان بولے تو عارفہ کو ان کے لہجے پر چھائی کہ صاف نظر آئی مگر وہ یکسر نظریں چرا گئیں۔
 ”آپ سب نے آنا ہے بلکہ دو دن پہلے آنا ہے، سارا انتظام آپ لوگوں نے کرنا ہے۔“ بڑے ابا نے کہا تو عارفہ نے بخوشی اثبات میں گردن ہلا دی۔
 ”سن لیا رابعہ بیٹی.....“ وہ براہ راست بولے۔
 ”جی کوشش کروں گی مگر سبحان علیل ہیں دیکھیں کیا بنتا ہے۔“
 ”اللہ خیر کرے، ہم انہیں بھی مدعو کرنے آجائیں گے، جلدی میں کارڈ تو چھپے نہیں پھر سادہ سی تقریب ہوگی۔“
 ”سادگی اچھی چیز ہے.....“ عارفہ نے سراہا۔
 ”رابعہ! سبحان کے پاس جاؤ.....“ سبحان نے کچھ سوچ کر اچانک کہا تو رابعہ پہلو بدل کے رہ گئیں۔
 سبحان نے اصل بات سمجھ کر مشورہ دیا تھا۔
 ”ہاں بیٹا! اب تو مہمان گئے فوراً چلی جاؤ.....“ بڑے ابا نے یہ کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے..... ان کے جانے کے بعد وہ گم صم سی بستر پر دراز ہو گئیں..... زندگی نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا..... ستم گر خود ستم کا شکار ہو کر بے بس ہو گیا تھا..... بیٹی اس سے ہی متنفر ہو گئی تھی۔
 ”کاش! سبحان تم اس وقت کا پہلے سوچ لیتے..... میں اب کیا کروں؟“ بے بس سوچ سرخ کران کے کانوں تک ہی رہ گئی۔

☆☆☆.....☆☆☆

گلو سے کافی کا کہہ کر وہ کچن سے نکل رہی تھی کہ دعا آ گئی۔ اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔
 ”کچن میں کیا کر رہی تھیں؟“ دعا نے پوچھا۔
 ”کافی پینے کو دل چاہ رہا تھا.....“ نیناں نے بتایا۔
 ”تو پھر مل کر پیتے ہیں بلکہ خود بناتے ہیں۔“ دعا کو وہ سنجیدہ سی لگ رہی تھی اس کے چہرے پر بشارت

نہیں تھی اس لیے دانستہ وہ اس کے پاس آئی تھی۔
 ”ہاں! گڈ آئیڈیا، کم آن.....“ نیناں نے خوش دلی سے آفر قبول کی۔
 ”میں بہت اچھی کافی بناتی ہوں۔“ دعا نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو اس نے فوراً گلو کے ہاتھ سے کافی کا جار لے کر دعا کو تھا دیا..... اور خود اسٹول پر بیٹھ گئی۔
 ”نیناں! کیا بات ہے؟“ فریج سے دودھ کا جگ نکالتے ہوئے اس نے پوچھا۔
 ”کوئی بات نہیں، کیوں.....؟“
 ”خاموشی اور اداس ہو۔“
 ”کچھ خاص نہیں بس نامعلوم سی اداسی ہے، تم سناؤ کیسے ہیں وہ موصوف.....؟“ نیناں نے ٹالنے کی غرض سے موضوع بدل دیا۔
 ”نہیں معلوم.....“ وہ بھجھکی گئی۔ نیناں نے صاف محسوس کیا۔
 ”دعا کیا تم خوش ہو؟“
 ”شاید نہیں یا شاید ہاں.....“
 ”یہ کیا بات ہوئی؟“
 ”چھوڑو میں نے سمجھوتا کر لیا ہے ویسے دوبارہ اب تک وہ لوگ نہیں آئے، جانے آتے بھی ہیں کہ نہیں۔“
 ”انشاء اللہ ضرور آئیں گے۔“
 ”تم اداس کیوں ہو؟“ دعا کے اندر جانے کی شائبہ تھا کہ سوئی ایک ہی مقام پر اٹکی تھی۔
 ”پتا نہیں، وہ اس کو مہارت سے کافی پھینٹا دیکھ کر بولی۔
 ”رمان تو تمہیں بہت چاہتا ہے۔“ ذومحنی جملہ دعا کے لبوں سے نکل گیا۔
 ”رمان کہاں سے درمیان میں آ گیا۔“ اپنے کافی کے مک کو اٹھاتے ہوئے وہ مسکرا کر بولی۔
 ”رمان تو ہے ہی تمہاری زندگی کا حصہ، غلط کہہ رہی ہوں کیا؟“ وہ برابر آ بیٹھی۔
 ”نہیں ٹھیک کہہ رہی ہو مگر زندگی ہے کہاں؟ کیا ہو گا یہ معلوم نہیں۔“ ایک طویل سر و سانس بھاپ اڑاتے مک میں ڈوب گئی۔
 ”مطلب.....؟“
 ”بس چھوڑو، میری الجھنوں میں نہ الجھو، آج یہیں رہ جاؤ۔“ ایک دم ہی اس نے فرمائش کی۔
 ”نہیں، اماں کے گھٹنوں میں درود زیادہ ہے مشکل ہوگی۔“
 ”او کے!“
 ”نیناں! نیناں! چلو تمہیں گھر چھوڑنا ہے۔“ رمان گاڑی کی چابی گھماتا وہیں آ گیا۔
 ”کیوں؟“
 ”رابی خالہ نے اور امی نے کہا ہے۔“
 ”مگر مجھے نہیں جانا.....“ وہ بیزار سی سے بولی۔

”کم آن یار! اتنی سنگدل نہ بنو، تمہارے بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ رمان نے کہا۔

”میری وجہ سے نہیں ہے، میری ماما کی وجہ سے نہیں ہے۔“

”بی بیو پلینز!“ رمان نے آہستہ آواز میں منع کیا کیونکہ وہ یہ بات دعا کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ آخر وہ بابا سے خفا کیوں ہے۔

”مجھے اجازت دو۔“ دعا خود سمجھدار تھی جلدی سے کہہ کر باہر نکل گئی۔

”رمان پلینز! مجھے مجبور نہ کرو۔“

”نیناں یہ موقع نہیں ہے، ریحان انکل کو غلطی کا احساس ضرور ہے۔“ وہ دعا والی جگہ پر بیٹھ گیا۔

”تمہیں کیسے پتا ہے؟“

”ابھی میرے نمبر پر فون کیا ہے انہوں نے اور ریکوریسٹ کی ہے۔“

”اس میں احساس کی کیا بات ہے، میرا نام بھول کر لے گئے ہوں گے۔“

”سمجھا کرو، وہ ڈسٹرب ہیں، تمہیں مس کر رہے ہیں، میں رابی خالہ کو بھی سمجھا کر آیا ہوں۔“

”تو وہ راضی ہیں؟“

”کافی حد تک لیکن وہ صبح آئیں گی۔“

”وہ جب مرضی جائیں مگر مجھے نہیں جانا۔“ وہ تلملا کر کہتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ وہ روکتا ہی رہ گیا مگر وہ رکی نہیں۔

☆☆☆.....☆☆☆

آپا کو ہلکا سا بخار تھا، جسم میں درد اور نقابہت سی تھی اس لیے آج سارا دن وہ بستر پر رہیں۔ تاہم اکبری بیگم کو یہ بھی احساس تھا کہ جب سے وہ راجا باؤس سے ہو کر آئی ہیں بہت مضطرب ہیں، کچھ نہ کہنے کے باوجود بہت کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے بیٹے کی یاد کے زخم تازہ محسوس کر رہی تھیں شاید آنکھوں کے گوشے نم تھے۔

”آپا! کیوں گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہی ہو؟“ گرم دودھ کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے اکبری بیگم نے کہا تو انہوں نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔

”جانے کیوں مجھے اپنے حسن کی یاد شدت سے آرہی ہے۔“ وہ رندھے ہوئے گلے کے ساتھ بولیں۔

”آپ کو تو صبر آ جانا چاہیے، زمانے بہت بیت گئے ہیں۔“

”مگر جب سے وہاں سے آئے ہیں سب کچھ تازہ ہو گیا ہے۔“

”بھول جائیں، مدیحہ چپ چپ تھی، میں نے اسے بھی سمجھا دیا ہے کہ بھول جائے چند دن کی شناسائی کو۔“

”اکبری، طلال کون ہے؟“ انہوں نے یکدم بیتاب ہو کر پوچھا۔

”اس بڑھیا کے کہنے کے مطابق راجا صاحب کا نواسہ.....“ کچھ غم و غصے کے ساتھ اکبری بیگم نے

جواب دیا۔

”مگر کیسے؟ اور میرا حسن کہاں گیا؟“

”وہ کہہ تو رہی تھیں کہ انہیں کچھ معلوم نہیں۔“

”اللہ کرے کہ وہ سلامت ہو۔“ ان کے پھڑ پھڑاتے لبوں نے دعا مانگی..... اکبری بیگم ان کی ذہنی حالت جانتی تھیں جلدی سے سہارا دے کر بٹھایا اور دودھ کا گلاس ہونٹوں سے لگایا مگر انہوں نے سخت پیزاری سے پرے کر دیا۔

”رہنے دو..... کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔“

”آپا! نئے سرے سے زخم مت چھیلو، ہمیشہ صبر سے کام لیا ہے۔“ اکبری بیگم نے دودھ کا گلاس واپس میز پر رکھ دیا۔

”میرا دل کہتا ہے کہ میرا بچہ زندہ ہے، طلال ہی ہے۔“ وہ مصر تھیں۔

”لیکن یہ بھی تو سوچو کہ وہ پر اپا بچہ کیوں رکھتے؟ اتنا پڑھایا لکھایا ٹھاٹھ باٹ سے رکھا۔ بھلا کیوں رکھتے؟ پھر ویسے بھی بھائی صاحب اپنا بیٹا انہیں کیوں دے کر جاتے؟“ اکبری بیگم نے کافی تفصیل کے ساتھ تاویل پیش کی لیکن آپا کا دل کچھ ماننے کو تیار نہیں تھا۔

”شاید انہیں بھی یہی پتا ہو، بچہ وسیعہ نے اپنا کہہ کر بھیجا ہو۔“

”کیوں؟ وہ کیوں پرانی اولاد کو اپنا کہے گی، اس نے اتنی بے حسی اور خود غرضی کا مظاہرہ کیا اور آپ کو وہ اتنی عظیم لگ رہی ہے۔“

”اس میں میرا اپنا شوہر مجرم ہے اس نے مجھے دھوکا دیا، وہ وسیعہ سے اتنا بے تکلف ہوتا گیا کہ دونوں نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا اور مجھے کانوں کان خبر نہ ہوئی۔“ آپا ماضی کے کریناکہ لحاظ میں کھوسی گئیں۔

”بس آپ کی سادہ طبیعت کی وجہ سے ایسا ہوا۔“

”میرا حسن مجھے مل جائے بس۔“ وہ رو دیں۔

”خدا کرے، آپ بے فکر ہو جائیں، اللہ بہتری ضرور کرے گا۔“

”ایک بار، ایک بار پھر چلیں۔“

”وہاں..... نہیں، اچھا نہیں لگتا، زلفی نے کہا تو ہے کہ وہ ملے گا۔“ اکبری بیگم نے تسلی دی۔

”مدیحہ، مدیحہ کہاں ہے؟“ وہ یکنخت مدیحہ کو پکارنے لگیں..... اکبری بیگم نے مدیحہ کو آواز دے کر بلایا..... وہ آئی تو اس سے پوچھنے لگیں۔

”مدیحہ! تم نے بھی نیناں سے نہیں سنا کہ طلال کسی اور کا بیٹا ہے؟“

”کیا مطلب؟ وہ کیوں کہتی، ہمیشہ یہی بتایا کہ وہ اس کی پچھوکا بیٹا ہے۔“

”اور..... اور کوئی بیٹا بھی نہیں ہے۔“

”نہیں، آپا نیناں اٹھوتی ہے، طلال بھی ایک ہیں..... آپ کیوں بار بار ان کا ذکر کر رہی ہیں.....؟“

مدیحہ کے رویے میں غیر معمولی تبدیلی سی تھی وہ روکھی روکھی سی ہو گئی تھی۔

”ہاں! مدیحہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ اکبری بیگم نے بیٹی کی تائید کی۔

”اچھا بس چپ ہو جاؤ، ہاںکل چپ.....“ آپا کو ہلکا سا غصہ آ گیا... وہ کروٹ لے کر لیٹ گئیں۔

☆☆☆.....☆☆☆

انہوں نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر دیکھا۔ سنہری چمکدار سورج کی کرنیں ابتدائی حالت میں تھیں۔ لان کے دائیں طرف اور کچھ ان کے کمرے کی سامنے والی دیوار پر پڑ رہی تھیں۔ لان میں مالی پھولوں، پودوں کی خدمت میں مصروف تھا۔ ان کا دل چاہا کہ ہلکی ہلکی دھوپ میں ہلکی ہلکی سردی کا مزہ اٹھانے کے لیے باہر جائیں مگر ڈاکٹر کی ہدایت اور بوا کی تاکید کے باعث وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ ہائی بلڈ پریشر اور معمولی سے ہارٹ پر اہلیم کا ڈاکٹر نے کہا تھا۔۔۔۔۔ یہ سن کر وہ خود کو بہت تھکا تھکا اور مضطرب سا محسوس کر رہے تھے۔۔۔۔۔

نیناں کے نہ آنے کا ملال سا تھا۔۔۔۔۔ رابعہ کی بددلی کا دکھ تھا۔۔۔۔۔ طلال کی بدتہذیبی کا صدمہ تھا۔۔۔۔۔ کھڑکی سے باہر کا منظر اچھا لگ رہا تھا۔۔۔۔۔ اسی لمحے ہارن بجا تو چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔۔۔۔۔ طلال کی گاڑی اندر داخل ہوئی وہ باہر نکلا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آ گیا۔۔۔۔۔ اتنی صبح وہ کہاں سے آیا ہے، یعنی رات باہر گزاری تھی یہ سوچ کر وہ اور پریشان ہو گئے۔۔۔۔۔ پردہ برابر کر کے دھیرے دھیرے چل کر کمرے سے باہر آ گئے۔۔۔۔۔ وہ کچن کے سامنے سے گزرے تو بوا جھنجھیں۔

”جی راجا صاحب!“
 ”کہاں سے آرہے ہو؟“ وہ اس کا طنز نظر انداز کر گئے۔
 ”پہلی بار یہ بات پوچھنے کی وجہ.....؟“ وہ طنزیہ مسکرایا۔
 ”جاننا چاہتا ہوں کہ کہاں تھے، کیوں تھے.....؟“ وہ اس کے سامنے صوفے پر ٹپک گئے۔
 ”آوارہ گردی کر رہا تھا۔“
 ”جس پر شرمندہ نہیں ہو؟“

”معاف کرنا راجا صاحبؔ میں ناشتا کر کے آیا ہوں۔“
 ”یہ کیسے بول رہے ہو؟“ بوا کو اس کا لہجہ اچھا نہیں لگا۔
 ”جیسے بولنا چاہیے.....“ اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر ایش ثرے میں اسے رگڑ کر بچھا دیا۔
 ”یہی صلہ ہے راجا فیملی کی محبتوں کا.....“ ریحان اختر رنجیدہ ہو گئے۔
 ”کاش میں اپنی مرضی سے آیا ہوتا، آپ کی بہن کا قصور ہے مجھ پر احسان نہیں۔“ وہ انتہائی بدتمیزی سے بول
 ”بس کرو ظلالؔ تم حقیقت نہیں جانتے.....“ بوا کو زبان کھولنی پڑی۔

”تو بتائیے حقیقت، میں کون ہوں، آپ کے اس عزت دار گھرانے کی بیٹی کا گناہ یا کچھ اور.....؟“ وہ چلایا۔
 ”شٹ اپ جو میری بہن کے لیے ایسا کہا.....“ ریحان اختر کو شدید غصہ آ گیا۔
 ”حقیقت تو ریحان اختر بھی نہیں جانتے، جاننے کے بعد کیا ہو یہ سوچ کر اب تک میں نے زبان بند رکھی ہے۔ بڑے راجا صاحب کے حکم پر عمل کرتی تو تم کہیں اور ہوتے۔ یہ محل، یہاں کا عیش و آرام، دولت، عزت کچھ بھی تمہارے پاس نہ ہوتا مگر میری بی بی کے دل میں اتنی مستاتھی کہ انہوں نے تمہیں اس محل کا حصہ بنا دیا۔“
 بوا ایک دم جوش میں آ گئی تھیں..... طلال حیرت زدہ سا تھا اور ریحان اختر متذبذب کیفیت سے دوچار تھے۔
 ”کیا مطلب.....؟“

”اگر بھیجنا ہوتا تو اس وقت بھیجتے جب تمہارا لالچی باپ اپنی بیوی کو طلاق دے کر وسیعہ کے ساتھ شادی کر کے بھاگا تھا۔ وہ جذباتی ہو کر تمہیں بیوی سے چھین تو لایا تھا مگر پھر ساتھ لے جانے کو تیار نہیں تھا۔ شاید وسیعہ کی مرضی بھی یہی تھی۔ وہ لے کر ہی نہیں گئے، بھاگ گئے تب راجا صاحب نے یتیم خانے میں جمع کرانے کا فیصلہ سنایا لیکن بی بی صاحبہ نے بہتر مستقبل اور اچھی زندگی دینے کے لیے سمجھا بچا کر یہیں رکھ لیا کہ اس معصوم کو اچھا رہن سہن ملے۔ تمہارا نام طلال رکھا، یہ بات بی بی صاحبہ نے اپنے بیٹے ریحان اختر کو بھی بتانے سے منع کیا تھا۔۔۔۔۔ وہ دونوں حادثے کی نذر ہو گئے تھے تو پھر بھی بی بی صاحبہ نے یہی بہتر جانا۔“ بوا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔۔۔۔۔ طلال کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ وہ جھپٹ پڑا بوا کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”طلال! طلال! ہوش میں آؤ، یہ سازش ہوتی تو مجھے باخبر رکھا جاتا۔“ ریحان اختر نے اٹھ کر اس کی مضبوط گرفت سے ہوا کو آزاد کرایا۔

”طلال بیٹا! ایسا نہیں سوچو، تم طلال اختر ہو اس گھر کے ہو۔“ بوانے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہے اس نے جھٹک دیا۔

”کیسا! میری ماں زندہ ہے، یہ اب بتا رہی ہو۔“ طلال کو اور شاک لگا۔

پہلے کچھ پتا نہیں تھا..... وہ بھی بیٹے کے لیے بے تاب ہے، اسے اب تک بیٹے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔
 ”اوہ! بوا تو آپ نے انہیں کیوں نہیں بتایا، مجھے کیوں نہیں بتایا۔“ ریحان اختر سر تھام کر بیٹھ گئے۔
 ”مجھے تم سے بات کرنی تھی، مشورہ کرنا تھا مگر طلال نے آج.....“ وہ خود بے حد خفت محسوس کر رہی تھیں
 اس گھر کی مالکن کے حکم پر جو قدم اٹھایا تھا وہ انہیں مجرم قرار دے رہا تھا۔ طلال کی نگاہوں میں شدید نفرت تھی وہ
 کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا..... اس صورت حال میں ریحان اختر بے بس سے ہو گئے۔

☆☆☆.....☆☆☆

چند گھنٹے کمرے میں بند رہنے کے بعد ریحان اختر باہر نکلے تو سیدھے طلال کے کمرے میں ہی گئے.....
 کمرے میں اس کا سامان بے ترتیب سا پڑا تھا، چاروں طرف کپڑے، کتابیں، جوتے اور پرفیومز وغیرہ وہ خود
 خالی خالی نظروں سے چھت گھور رہا تھا۔
 ”طلال!“ انہوں نے پکارا۔

”جی راجا صاحب.....؟“ وہ طنز سے باز نہ آیا۔
 ”ایسے نہ کہو یار، میں آپ کا ماموں ہوں.....“ وہ شرمندہ سے ہو گئے۔
 ”پلیز! اب یہ فریب مت دیں، میں گناہ ہوں، میری ماں کہاں ملے گی صرف یہ بتادیں۔“ وہ پھر اٹھا۔
 ”ہاں کیوں نہیں، وہ بھی میری بہن ہیں اس حوالے سے آپ بھانجے ہی لگے۔“ ریحان اختر نے خامسے
 رکھ رکھاؤ کے ساتھ کہا۔

”کہنے میں اور ہونے میں فرق ہوتا ہے، میری زندگی کا نقشہ بدل گیا..... ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں میں، جی
 چاہتا ہے آگ لگا دوں ساری دنیا کو۔“ وہ غصے سے پھنکارا۔
 ”آپ کا غصہ بجا ہے لیکن اس کا تصور وار آپ کا باپ ہے جس نے بنا سوچے سمجھے اپنا گھر برباد کیا، میری
 طرح۔“ وہ دھکی سے ہو کر بولے تو طلال نے غور سے ان کو دیکھا، وہ اپنے کیے پر سچ مچ پشیمان لگ رہے تھے۔
 ”بہر کیف! مجھے یہاں سے جانا ہے۔“

”کہاں؟ کیا یہ صلہ ہے میری محبت کا؟“
 ”پلیز! مجھے اور برا انسان نہ بنائیں، جانے دیں ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“
 ”نہیں طلال! یا راتم مجھے چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہو؟“
 ”ہا..... ہا..... جیسے آپ کی بیٹی اور بیوی چلی گئیں، سچ ہے یہ گھر نہیں مقتل ہے یہاں انسانی
 احساسات کا خون کیا جاتا ہے.....“ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”سب چھوڑ جائیں مگر آپ اور بوا ہمیں نہیں چھوڑ سکتے.....“ وہ وثوق سے بولے۔
 ”آپ بوا کو ایوارڈ دیں، بڑے بڑے راز چھپا رکھے تھے انہوں نے۔“ اس نے استہزائیہ انداز اختیار کیا۔
 ”نہیں! ایک وفادار ملازم کیا ہوتا ہے یہ بوا کے کردار سے معلوم ہوا ہے، انہوں نے اپنی ساری زندگی
 اس گھر کو دے دی، تمہیں، ہمیں پال پوس کر بڑا کیا، اپنی بی بی سے کیے عہد کا پاس کیا۔ انہیں دوش نہ دو، ان کا
 صدمے سے برا حال ہے۔“ ریحان اختر بولے۔

”صاحب، صاحب جی! بوا کو کیا ہو گیا ہے وہ جائے نماز پر سے نہیں اٹھ رہیں۔“ اسی اثنا میں فیضو نے

گھبرا کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”کیا..... نماز پڑھ رہی ہوں گی.....“ ریحان اختر کچھ پریشان ہوئے اور اٹھتے ہوئے بولے۔

”وہ گری پڑی ہیں۔“ فیضو نے جواب دیا۔

”کیا، کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ بھاگے، فیضو بھی ہمراہ بھاگا۔ طلال چند لمحے کے توقف کے بعد باہر نکلا.....

تو فیضو کندھے پر پڑے رومال سے آنکھیں صاف کرتا ہوا ہے بوا کے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔

”ک، ک کیا ہوا.....؟“ طلال نے پوچھا۔

”وہ، وہ بوا گزر گئیں.....“ فیضو سسکیوں سے روتا ہوا دوسری طرف چلا گیا..... طلال کے قدم وہیں جم

گئے..... کچھ دیر بعد ریحان اختر باہر نکلے تو بہت غمگین اور رنجیدہ تھے، آنکھوں کے گوشے نم تھے۔

”راز داں کا سفر مکمل ہو گیا..... اب سب آزاد ہیں.....“ وہ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے یہ کہہ کر

اپنے کمرے میں چلے گئے..... طلال کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے؟ جائے یا ٹھہر جائے.....

جائے تو کیا کہہ کر جائے..... ٹھہرے تو کیا جواز بنائے؟ بوا کا چہرہ نظروں میں آ گیا تو بہت کچھ یاد آ گیا.....

دھیرے دھیرے قدم اٹھا کر ان کے کمرے کے دروازے تک گیا..... وہ بستر پر چادر اوڑھے پرسکون سوئی

ہوئی تھیں کچھ نہیں تھا ان کے چہرے پر ایک طمانیت تھی..... سردی خاموشی تھی..... فرض کی ادائیگی کے بعد جیسا

سکون انسان کے چہرے پر آتا ہے ویسا ہی تاثر ان کے چہرے پر موجود تھا۔

”بوا! کاش آپ مجھے آگاہ کر دیتیں، مجھے میری ماں کی گود لوٹا دیتیں۔“ اس نے اپنی دانست میں ان سے

شکوہ کیا اور وہاں سے سیدھا باہر نکل گیا۔

☆☆☆.....☆☆☆

عارفہ بچن میں ناشتا بنوا رہی تھیں۔ رابعہ وہیں چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے اخبار پڑھ رہی تھیں کہ رمان

کی گاڑی کا ہارن پوری قوت سے بجا۔

”اللہ خیر! رمان کو تو آفس میں ہونا چاہیے تھا۔“ عارفہ نے بچن میں رکھے چھوٹے سے ٹائم پیس پر نگاہ

ڈالتے ہوئے کہا۔

”کوئی ضروری کام ہوگا.....“ رابعہ نے اخبار پر نظریں جمائے جمائے کہا۔ عارفہ کے کچھ کہنے سے پہلے

رمان آندھی اور طوفان کے مانند آوازیں دیتا ہوا وہیں آ گیا۔

”امی! امی! رابی خالہ، نیناں.....“

”ارے کیا بات ہے، کیوں چلا رہے ہو؟“ عارفہ بیگم بڑبڑاتے ہوئے پلٹیں۔

”چھوڑ دیں سب کام، آپ بھی رابی خالہ فوراً اٹھیں اور نیناں مہارانی تو اب تک سو رہی ہوں گی.....“

بات کرتے کرتے وہ سیدھا نیناں کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے آئیں۔

”نیناں! نیناں! اٹھو۔“ اس کے سر ہانے چلایا تو وہ بڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔

”کیا مصیبت ہے؟“

”رمان پاگل ہو گئے ہو کیا، کیوں بچی کو پریشان کر رہے ہو؟“ عارفہ بیگم نے لتاڑا۔

”کمال ہے، میں پاگل لگ رہا ہوں۔“

”ہاں بالکل پاگل.....“ نیناں جھلا کر دوبارہ لیٹنے لگی تو وہ پھر چیخا۔

”چڑیا! بستر چھوڑ دو، اٹھو چلنا ہے۔“

”افوہ! مسئلہ کیا ہے لڑکے یہ تو بتاؤ.....؟“ رابعہ کو طیش آ گیا۔

”آپ لوگ فوراً میرے ساتھ چلیں، پریشانی اور افسوس کا وقت ہے۔“ اس نے پھرنا مکمل سی بات کی تو

عارفہ بیگم نے زوردار ہتھراس کے کندھے پر مارا۔

”ہاتھ، پاؤں پھول گئے ہیں، کیسی پھیلیاں بکھوار ہے ہوں۔“

”رانی خالہ کو اپنے گھر جانا چاہیے، اب غصے سے کام نہیں لینا چاہیے۔“ وہ بڑی دانشمندی کا ثبوت دے

رہا تھا مگر وہ تینوں کھول انھیں کیونکہ سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

”رمان! فارگا ڈسک کیا مسئلہ ہے تمہارا.....؟“ رابعہ نے چیخ کر کہا۔

”آپ کو نہیں معلوم جیسے کہ آپ کو اس وقت وہاں ہونا چاہیے تھا، اب بھی آپ کا غصہ کم نہیں ہوا..... اور

یہ نیناں اسے بھی ذرا احساس نہیں ہوا، ضد پر قائم رہی.....“ اس نے پھر بقرابطہ بننے کی کوشش کی لیکن بے سودان

تینوں پر الٹا اثر ہوا، رابعہ اور عارفہ سہم سی گئیں ایک دوسرے کو سراسیمگی کی حالت میں دیکھنے لگیں۔ نیناں

انھوں کی طرح ان تینوں کو دیکھ رہی تھی۔

”خدا نخواستہ، کوئی بری خبر تو نہیں ہے۔“ عارفہ نے پوچھا۔

”کسی کی موت کی خبر سے زیادہ بری خبر کیا ہوگی؟“ وہ جھنجھلا گیا۔

”ہیں! کیا، کیا کہہ رہے ہو؟“ رابعہ، ریحان کے خیال سے دال سی گئیں۔

”بس دیر نہ کریں میرے ساتھ چلیں۔“

”رمان! کچھ بتاؤ تو.....“ نیناں نے سر پیٹ لیا۔

”کیا آپ لوگ لاعلم ہیں؟“ اب حیرت زدہ ہونے کی اس کی باری تھی۔

”ہمیں کیا معلوم تم کیا کہہ رہے ہو.....؟“

”تو آپ کو کچھ معلوم نہیں، فوتگی کی اطلاع آپ کو نہیں ہوئی؟“

”کیا، ارے خدا خیر، کون فوت ہو گیا؟“ عارفہ کے جسم میں سے تو جیسے جان نکل گئی..... رابعہ سکتے کی سی

کیفیت میں آ گئیں..... نیناں خوفزدہ سی ہو کر ماں سے لپٹ گئی۔

”مما! بابا.....“

”کہا تھا نا کہ چلی جاؤ.....“ رابعہ نے صدمے کے ساتھ اس کے کان میں کہا۔

”اوہو اب تو دیر نہ کریں.....“ وہ آگے آگے چل دیا اور وہ تینوں پیچھے پیچھے دھڑکتے دلوں کے ساتھ۔

”ریحان! جب میں مر جاؤں تو مجھے آزاد کر دینا، میں نے بی بی سے وعدہ لیا تھا کہ سب یہاں نہیں فرض کرنے کے بعد میری مٹی میرے گاؤں بھیج دینا۔“ بوا کی آواز انہیں کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ میت کو رخصت کر کے اس خواہش کو پورا کر کے وہ پرسکون ہو گئے تھے۔

برسوں پرانا سا تھی رخصت کیا ہوا، سارے گھر میں ہوا کا عالم تھا۔ ہر شے اپنی محسنہ کا سوگ منا رہی تھی۔ نیناں کی سسکیاں بوا کے کمرے سے باہر آرہی تھیں۔ ریحان اختر لیے کل سے ہو کر خاموش بیٹھی رابعہ اور عارفہ کو دیکھنے لگے۔ رابعہ نے مطلب سمجھ کر نیناں کے پاس جانے کا ارادہ کیا مگر عارفہ نے روک دیا۔

”رو لینے دو... بہت محبت کا رشتہ رخصت ہوا ہے۔“

”مگر مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔“ ریحان اختر بولے۔

”بجائے لیکن اگر اسے روکا گیا تو زیادہ صدمہ محسوس کرے گی۔“ عارفہ بیگم نے تائید کی۔

”ابھی کچھ دیر میں رمان تدفین کرا کے آئے گا تو ہم چلے جائیں گے۔“ رابعہ نے بڑے سلیقے سے دل کی بات کہی تو وہ فوراً بولے۔

”کہاں...؟“

”اپنے گھر۔“

”اور یہ... یہ گھر... وہ کھلائے۔“

”یہ آپ کا گھر ہے، آپ کی پہلی بیوی کا گھر ہے۔“

”دراصل نیناں کے دل بہلانے کی وجہ سے کہہ رہی ہیں۔“ عارفہ بیگم نے جلدی سے مداخلت کی۔

”ابھی تک یقین نہیں آیا کہ وہ مر چکی ہے۔“ انہوں نے گویا یاد دلایا۔

”تو میں بھی مر چکی ہوں۔“ وہ بولیں۔

”میں بحث نہیں کر سکتا۔“ وہ سر تھام کر رہ گئے۔ عارفہ بیگم نے موقع کی مناسبت سے وہاں سے اٹھ کر جانا مناسب سمجھا تا کہ وہ کھل کر بات کر سکیں۔

”ریحان! بحث کی کوئی گنجائش ہے بھی نہیں۔“ وہ بڑے سرد لہجے میں بولیں۔

”رابعہ! میں مانتا ہوں کہ مجھ سے زیادتی ہوئی ہے۔ میں نے بہت دھوکا دیا ہے مگر اب میں تنہا ہوں، بوا

بھی مجھے چھوڑ گئیں۔“

”مجھے افسوس ہے بوا کے جانے کا۔ آپ کے گناہوں کی راز داں آپ کو چھوڑ گئیں، جانے والوں کو کوئی

روک نہیں سکتا، ہمیں تنہا رہنے کی عادت ہے۔“ بڑا گہرا طعن تھا ان کے طویل جملے میں۔

”وہ وفاداری کا قرض اتار کر گئی ہیں۔“ انہوں نے بوا کی وکالت کی۔

”آپ کے لیے انہوں نے قرض اتارے یا چڑھائے مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں، یہ ان کا اور آپ کا

گھناؤنا جرم ہے جو میں معاف نہیں کر سکتی۔“ وہ یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ کر جانے لگیں۔

”سچ کہتے ہیں لوگ عورت بہت ضدی ہوتی ہے۔“ وہ کچھ تلخ ہو گئے۔

”نہیں، عورت خود دار ہوتی ہے... مرد کی ضد اور جبر کے خلاف لڑتی ہے، یہ تو آپ کو بخوبی اندازہ ہو چکا ہے۔“

”نہیں، عورت خود دار ہوتی ہے... مرد کی ضد اور جبر کے خلاف لڑتی ہے، یہ تو آپ کو بخوبی اندازہ ہو چکا ہے۔“

”کس بات کا اندازہ؟“

”وہ عورت جو آپ کی ہوس کا شکار نہ ہوئی، پہلے کنوئیں میں کودی اور پھر آپ کی نظروں کے سامنے جل مری۔“ رابعہ نے زہر میں بچھے لہجے میں تیر چلائے تو وہ سلگ اٹھے۔

”وہ میری جائز بیوی تھی، میں گناہ نہیں کر رہا تھا۔“

”کسی کی مرضی کے بغیر کیے جانے والے عمل کو گناہ ہی کہتے ہیں۔ جس عورت کو پچیس تیس ہزار میں خرید کر زبردستی جائز بنانے کے لیے نکاح کا ڈھونگ رچایا جائے اسے گناہ ہی کہتے ہیں۔“ وہ یہ جملے انتہائی چبا چبا کر بولیں تو وہ لا جواب ہو گئے۔

”میں نے اس سے جنون کی حد تک عشق کیا ہے۔“

”کرتے رہیں، وہ آپ کے عشق کی نذر ہو گئی ہے۔“ وہ یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ کر نیناں اور عارفہ آیا کے پاس چلی گئیں۔ وہ طویل سرواۓ بھر کے رہ گئے۔ ذہن میں نیناں کا ماہتابی چہرہ کوئٹہ اور پھر جھلس گیا۔ کرہناک کیفیت میں انہوں نے اپنا نچلا ہونٹ چبا لیا۔

☆☆☆

چائے کی چسکی لینے کے بعد اس نے ایک دم بلال کی طرف دیکھا اور طویل خاموشی کا قتل ٹوٹا۔ ”یار! کچھ بھی ہے، تمہیں اچھی پُر آسائش زندگی راجا صاحب کے گھر میں ہی ملی ہے، یوں تم گھر کیوں چھوڑو؟“ بلال نے کہا۔

”کمال کرتے ہو... جو گھر میرا نہیں، میرے لیے یتیم خانہ ہے اسے چھوڑے بغیر گزارہ نہیں۔“ چائے کی دو چسکیاں لینے کے بعد اس نے جواب دیا۔

”کیا انہوں نے تمہیں نکل جانے کو کہا؟“ بلال نے پوچھا۔

”نہیں... لیکن رہنے کا بھی نہیں کہا، اس خزانہ نوکرائی کے بتانے کا مطلب ہی یہی تھا۔“ میٹھی چائے کی آخری چسکی کے بعد بھی اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

”اچھا ہوا وہ بتا کر مری ہے، ورنہ تمہیں کبھی پتا نہ چلتا۔“

”اونہہ، کیا بتایا... کون ہے میری ماں؟ کہاں تلاش کروں انہیں؟“

”بریکاری باتوں پر دھیان دینے سے فائدہ، یار! تم فی الحال راجا ریحان اختر کی دولت اور اکلوتی بیٹی کو نوکس میں رکھو، یہ بعد کی باتیں ہیں بلکہ راجا صاحب کو یقین دلاؤ کہ تم ان کے ساتھ مخلط ہو۔“ بلال نے خاصی عیاری کا مظاہرہ کیا۔

”اونہہ، وہ بھلا کیوں مجھے مخلط سمجھے گا جو میرا کچھ بھی نہیں اور اپنی بیٹی کے لیے کیوں وہ مجھے قبول کرے گا؟“ وہ بخئی سے ہنسا۔

”یار! تم ہوشیاری سے کام لو، گھر جاؤ ان کے تاثرات دیکھو پھر مناسب موقع دیکھ کر نیناں کی بات کرو۔“

”تم نادان ہو، ریحان اختر کو نہیں جانتے۔“

”پہلے سے ہی تمہیں پھینک دیے۔“

ماہنامہ پاکیزہ — مارچ 2012ء

”وہ بڑھیا مر چکی ہے وہاں شیرازہ ہی بکھر گیا ہے، ماں اور نیناں وہاں ہیں نہیں، وہاں سے کیا ملتا ہے؟“

”تمہارے خیال میں وہ بڑی بی کے مرنے کی خبر سن کر بھی نہیں آئی ہوں گی؟“ بلال نے پوچھا۔

”آئی ہیں... میں نے گارڈ سے فون پر پوچھا ہے مگر اب تک چلی گئی ہوں گی، ریحان اختر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”تو یار! تمہیں ان کے پاس ہونا چاہیے، ریحان اختر کو اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔“ بلال نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”میری ماں تو جاؤ ان سے ملو، سوچو کتنی دولت ہے۔ وہ مر گئے تو کون قابض ہوگا؟“ بلال کا ذہن متفی انداز میں بہت تیزی سے سوچتا تھا، اس نے طلال کو بالآخر اپنا ہم خیال بنا ہی لیا۔

”اور اگر انہوں نے لفٹ نہ کرائی تو؟“

”تو بھی تمہیں تسخیر کرنا ہے۔“

”اور میری ماں؟“

”خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ بڑھیا نے اور کچھ نہیں بتایا۔ بس صبر کر لو۔“

”نہیں یار! ماں کا تصور ہی مجھے بے قرار کر رہا ہے۔“ وہ حد درجہ بے قرار ہو کر ٹھلنے لگا۔

”مل جائے گی ماں بھی، فی الحال تم گھر جاؤ، حالات اپنے کنٹرول میں کرو، آفس کے معمولات میں پہلے کی طرح دلچسپی لو۔“

”ابھی کچھ سوچنے دو۔“ وہ ڈسٹرب سا تھا۔

”ٹھیک ہے سوچو... مگر جلد واپسی کا فیصلہ کرو۔“ بلال نے اٹھتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”وہیے میرا باپ کس قدر گھٹیا شخص تھا، مجھے گھن آ رہی ہے خود سے، یہ اس کے خون کا اثر ہے کہ میں نے ہمیشہ برے رستے پر سفر کیا۔“ وہ عجیب سی تبدیلی سے گزر رہا تھا۔ بلال کو حیرت ہوئی۔

”مطلب؟“

”یار! بس اب میں وہاں نہیں جاسکتا اور مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے، باپ کے خون کا اثر دیکھ لیا، اب ماں کے دودھ کی تاثیر دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں پلٹ کر بولا۔

”یعنی نہیں جانا۔“

”ہاں جاؤں گا، شکریہ ادا کرنے کے لیے یہ بتانے کے لیے کہ میری ماں کے دودھ کا اثر یہ ہے۔“

”چلو جیسی تمہاری مرضی۔“

”اور پھر میں اپنی ماں کو تلاش کروں گا۔“ وہ پرسکون سا ہو کر بیڈ پر لیٹ گیا۔

”اوکے، آرام کرو۔ کھانے پر ملاقات ہوگی۔“ بلال نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ طلال اس کے پاس مقیم تھا۔ پورے شہر میں سب سے زیادہ عزیز بلال ہی تھا اسی لیے وہ سیدھا اس کے پاس ہی آیا تھا۔ اس کی اضطرابی حالت دیکھ کر بلال کو خاصا تعجب ہوا تھا مگر کچھ دیر بعد اس سے اصل بات پوچھنے کی جسارت کی تھی، ورنہ اس کی جلالی فطرت کا سامنا اس وقت مناسب نہیں تھا۔ لہذا رات گزرنے کے بعد، ناشتا اس کے سامنے

ماہنامہ پاکیزہ — مارچ 2012ء

179

رکھنے کے بعد بھی خاموشی رکھی تھی، اس نے ناشتے سے انکار کر دیا تھا، صرف چائے بنائی، دھیرے دھیرے سب کچھ بتایا اور پھر خاموشی اختیار کر لی تھی... جو کچھ دیر بعد ختم ہوئی۔

☆☆☆

مہیب... سنائے میں گھر اسوگ اور اداسی کا احساس بے کل کر رہا تھا، نیناں نے بوا کے غم کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔ رابعہ اور عارفہ کی وی لاؤنج میں دھیرے دھیرے باتیں کر رہی تھیں۔ ریحان اختر کے پاس آفس کے لوگ افسوس کے لیے آئے ہوئے تھے۔ رمان بھی کچھ دیر ان کے درمیان بیٹھا اور پھر اندر آ گیا۔ فیضو نے کھانا لگانے کی اجازت مانگی تو رابعہ یولیں۔

”فیضو! کچھ کھانے کی طلب نہیں ہو رہی، بس چائے بنا دو۔“ فیضو چلا گیا۔

”رمانی خالہ! کچھ کھالیں، نیناں کو بھی کھلائیں۔“ رمان نے مداخلت کی۔

”رمان ٹھیک کہہ رہا ہے، صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“ عارفہ نے بیٹے کی تائید کی۔

”آپا! بے شک میت اس گھر سے دور پہنچا دی گئی مگر افسوس اور اداسی تو موجود ہے۔“ رابعہ نے مدھم لہجے میں کہا۔ ”وہ تو رہنا چاہیے، اتنی پرانی ملازمہ کو کس قدر سرد مہری کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ یہ کمال بھی میری چشم گناہ گار نے پہلی بار ہی دیکھا ہے۔“ رمان کے لہجے میں یاسیت، حیرت دونوں کی آمیزش تھی۔

”ملازمہ نے وفاداری کا فرض تو پورا کر دیا، ریحان اختر نے وہی کیا جو ان کا ظرف ہے۔“ رابعہ نے طنز یہ کہا۔

”چھوڑو، کیا ضرورت ہے بیکار باتوں کی۔“ نیناں کو اتادیکھ کر عارفہ بیگم نے کہا۔

”اُدھہ! مجھے بوا کی وفاداری پر افسوس ہو رہا ہے کس، کس کے لیے، کیا، کیا کرتی رہیں۔“ رابعہ نے خاصی ناگواری کا اظہار کیا۔

”اچھا چھوڑیں، اب انھیں آپ نیناں کے ساتھ کھانا کھائیں اور ہمیں اجازت دیں۔“ رمان نے دیکھ لیا تھا کہ ریحان اختر ڈرائنگ روم سے سب کو رخصت کر چکے تھے اب یقیناً انہوں نے اس طرف ہی آنا تھا۔ ”رمان! مجھے کچھ نہیں کھانا، نیناں کو کچھ کھلا دو اور ہم نے بھی ساتھ چلنا ہے۔“ رابعہ اٹھ کر اپنا پیٹڈ بیگ لینے کے لیے کمرے میں چلی گئیں۔ ریحان اختر اسی طرف آئے۔ نیناں انہیں دیکھ کر واپس بوا کے کمرے میں بند ہو گئی۔ رمان بے تاب ہوا لیکن ضبط کر گیا۔

”ریحان! انکل! اب ہمیں اجازت دیجیے۔“ وہ ان سے مخاطب ہوا۔

”رمان! آپ بھی جانا چاہتے ہو، اس ویرانے کو دیکھ کر؟“ انہوں نے رنجیدگی سے کہا۔

”وہ بس مجھے تو آپ کے حکم کے مطابق آنا ہی نہیں تھا مگر موقع غمی کا تھا۔ اب مزید رکنے کا کوئی جواز نہیں۔“ وہ بڑے رساں سے کہہ گیا۔

”گویا میرے ہونے کا جواز ہی نہیں۔“

”میرا یہ مطلب نہیں ہے، بس اب شرمندہ نہ کیجیے۔“ وہ سنجیدہ سا یہ کہہ کر ماں کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔

”عارفہ! آپا! وہ فقط اتنا ہی پکار سکے۔“

”ریحان! آپ کو آرام کی ضرورت ہے پھر بات کریں گے، آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔“ عارفہ

بیگم نے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”سب چھوڑنا چاہتے ہیں، طلال جانے کہاں گیا، بیوی، بیٹی سب مجھے چھوڑ کر جانا چاہتی ہیں۔“ وہ مددے سے پُور پُور صوفے پر گر سے گئے۔

”کون... کہتا کون کہتا ہے؟“ عارفہ بیگم ہکلائیں۔

”آپا! چلیں، دیر ہو رہی ہے۔“ رابعہ نے بہن کی طرف دیکھا اور بے رخی کا انداز اختیار کیا۔

”رابعہ! آپ رات یہیں ٹھہرو، کل رمان آجائے گا۔“ عارفہ بیگم کو ریحان اختر پر ترس آ رہا تھا۔

”کیوں، آپ کیوں ایسا کہہ رہی ہیں؟“

”رمانی خالہ! امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ رمان نے کہا۔

”نہیں ٹھیک، جس گھر میں مجھ سے بدسلوکی ہوئی، بے وفائی ہوئی مجھے وہاں کیوں رہنا ہے؟“ وہ چلائیں۔

”رابعہ! میں نے کھانا کھل آجانا۔“ عارفہ بیگم نے کچھ سختی سے کہا اور رمان کو چلنے کا اشارہ کیا۔ آنا فانا وہ دونوں باہر نکل گئے۔ رابعہ کھڑی کی کھڑی رہ گئیں کچھ دیر بعد بے بسی سے نیناں کے کمرے میں چلی گئیں۔

ریحان اختر نے فیضو کو چائے لاتا دیکھ کر کھانا لگانے کو کہا کیونکہ وہ نیناں اور رابعہ کو کھانا کھلانا چاہتے تھے۔ گوکہ یہ کام مشکل تھا مگر انہیں یقین تھا کہ وہ اس میں کامیاب ہو جائیں گے۔

☆☆☆

گھر واپس آئے بہ مشکل دس منٹ ہوئے تھے۔ دن بھر کی گرد اور پسینہ دور کرنے کے لیے وہ سیدھے اپنے کمرے کے واش روم میں گھس گیا مگر موبائل فون کی آواز واش روم میں آئی تو بادل ناخواستہ پہلے فون سننے کے ارادے سے باہر نکل آیا۔ نیناں کا نمبر تھا جلدی سے ریسیو کیا تو وہ پھٹ پڑی۔

”بے پروا، بزدل، بے حس ہوتم، ارے تم تو چوروں کی طرح بھاگ نکلے، مجھ سے ملنا تک گوارا نہ کیا، میری بوا کوئی ملازمہ نہیں تھیں، انہیں میرے بابا کے کہنے پر مٹی میں دبا کر بھاگ آئے، کیا ہو جاتا جو ایک دو گھنٹے مجھے تسلی دے دیتے۔“ وہ ذرا دیر کو سانس پھولنے کے باعث رکی تو وہ بولا۔

”بس، یا اور کچھ بھی کہنا ہے؟“

”کچھ نہیں کہنا، سب مرد ایک جیسے ہیں۔“ وہ دہاڑی۔

”جسٹ شٹ اپ! اب میری بھی سن لو۔“ وہ ضبط نہ کر سکا۔

”مجھے ساتھ کیوں نہیں لے کر گئے؟“ اس نے روتے روتے شکوہ کیا۔

”نیناں! خود سوچو، بوا کے بعد گھر میں چند روز ہی سہی تمہیں اور رمانی خالہ کو وہاں رہنا چاہیے۔ اپنے بابا کی حالت دیکھو وہ کس قدر اپ سیٹ ہیں، انہیں بیٹی کے پیار کی ضرورت ہے۔“ اس نے خاصے گل سے جواب دیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے انہیں، میں صرف اپنی ماما کی بیٹی ہوں، سن لیا تم نے۔“ وہ چیخی۔

”اچھا ٹھیک ہے، پلیز کول ڈاؤن۔“

”نہیں تم ابھی آؤ اور مجھے یہاں سے لے کر جاؤ، مجھے اور ماما کو۔“

”دیکھو، میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں، تمہارے بابا کی مرضی کے خلاف۔“

”رمان! پلیز مجھے بابا کی کوئی بات نہیں سنی، مجھے نفرت ہے اُن سے۔“
 ”اوہ یار! تم سمجھتے کی کوشش کرو ابھی وہ بیمار ہیں، بوا کی وجہ سے افسردہ ہیں... کل تک صبر کر لو۔“
 ”نہیں... نہیں... نہیں۔“ وہ چلائی۔

”نیناں... نیناں!“
 ”مت کہو مجھے نیناں، مرگئی نیناں، یہ نام میرا نہیں ہے۔“ اس کے ہاتھ ایک اور غصے کا موضوع آ گیا۔
 ”چلو ٹھیک ہے بتاؤ کس نام سے پکاروں، کیا نام ہے تمہارا؟“ وہ ستانے کے لیے ذرا سا شوخ ہو گیا۔
 ”کچھ بھی یا کچھ بھی نہیں مگر نیناں نہیں۔“ وہ بڑبڑائی۔

”او کے سوٹ ہارٹ، میں تو پھر سوئی کہوں گا۔“ وہ شوخ ہوا تو اس کے من میں ٹھنڈک سی اتر گئی۔
 ”اب آؤ، میرا دم یہاں گھٹ رہا ہے۔“ اسے پھر سے دورہ پڑ گیا۔

”ڈارلنگ! صرف ایک رات کی بات ہے، کل رابی خالہ آئیں گی تو...“
 ”بس بند کرو یہ وضاحت، میں ہی پاگل ہوں جو تم سے...“ وہ جھٹاکر کہتے کہتے رک گئی تو اس نے جھٹ
 جملہ مکمل کر دیا۔

”جو تم سے عشق کر لیا، جو تم سے نین لڑا بیٹھی۔“
 ”بکومت۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ بھیگی پلکیں دوپٹے کے پلو سے صاف کیں تو ریحان اختر کو
 اپنی پشت پر کھڑا دیکھ کر چونک اٹھی۔
 ”اتنی نفرت کرتی ہو اپنے بابا سے؟“ ان کا لہجہ مدھم تھا وہ چپ رہی۔
 ”نیناں! تم تو میری زندگی ہو۔“

”بابا پلیز! امت ایسے کہیں اور یہ نام آپ کو مبارک، ختم ہو گیا یہ نام، نیناں اب صرف تھی، ہے نہیں۔ میں ہوں۔“
 وہ شعلہ باز لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ریحان اختر کے دل پر گھونسا سا لگا۔ ندامت سے نظریں جھکا لیں۔
 ”وہ تھی... مگر تم میرے جگر کا ٹکڑا ہو، میرے دل میں تمہاری محبت بے حساب ہے۔“

”پلیز! کسی ڈرامے کی ضرورت نہیں، مجھے آزاد رہنے دیں اس قفس سے باہر، کسی کے نام کی قید سے
 باہر... وہ بھی آپ کی نیناں جس سے آپ نے اتنا عشق کیا کہ اپنی بیٹی کو محبوبہ کا نام دے دیا... آپ بھول گئے کہ
 میں نے رابعہ کی کوکھ سے جنم لیا ہے، وہ آپ کا عشق تھا یا جنون مجھے اس کا نام نہیں چاہیے... کاش میں کھریج
 کھریج کر ان کاغذات سے یہ نام مٹا دوں جہاں جہاں لکھا ہوا ہے۔“ نفرت کے سیکتے احساس سے وہ دہک
 اٹھی تھی۔ پہلی بار راجا ریحان اختر کے مقابل آ کر بات کی تھی۔ انہیں تعجب تھا۔

”یہ تم نہیں، رابعہ بول رہی ہے۔“
 ”تو غلط نہیں ہے، رابعہ کو تو آپ نے کرہناک زندگی دی ہے، آپ ضدی، خود مر اور بے حس انسان ہیں
 بابا۔“ وہ رُوبرُو آ کر بولی۔ بالکل نہ ڈری اور نہ سہی۔

”ماسوائے محبت کے رابعہ کو سب کچھ ملا ہے اس گھر سے۔“ انہوں نے اقرار بھی کیا اور اعتراف بھی۔
 ”اونہہ! اس گھر سے کسی کو کچھ نہیں مل سکتا، دادی، ماما، بوا اور نیناں سب کو اس گھر سے سزائیں ملی ہیں، صرف

سزائیں۔“ وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی۔ ریحان اختر لا جواب ہو گئے۔ واپس پلٹنے لگے تو اس نے پکارا۔
 ”بابا! میں اب بنت رابعہ ہوں صرف بنت رابعہ۔“ وہ چونکے، پیشانی پر کچھ سلوٹیں نمودار ہوئیں اور پھر
 معدوم ہو گئیں۔

”تو گویا ایک بیٹی اپنے باپ سے جینے کا حق چھین رہی ہے، اس کے باپ ہونے کا حق چھین رہی ہے؟“
 ”سوری بابا! آپ بھول رہے ہیں، نیناں آپ کی پہلی بیوی کا نام ہے۔“ اس نے طنزیہ کہا تو ریحان اختر
 مزید رک نہ سکے واپس پلٹ گئے۔

”بابا! رشتے خون کے نہیں احساس کے ہوتے ہیں اگر احساس ہو تو اجنبی بھی اپنے... اور اگر احساس نہ ہو
 تو اپنے بھی اجنبی ہو جاتے ہیں۔“ ان کے جانے کے بعد وہ ان سے مخاطب ہوئی۔

☆☆☆

ٹھیک دس بجے صبح رمان... نیناں اور رابعہ کو لینے آیا تو وہ تیار تھیں۔ جونہی گاڑی میں بیٹھیں تو رمان نے
 نیناں کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر مزہ لیتے ہوئے کہا۔

”یہ دنیا بھی بڑی عجیب ہے، جب آپ چپ رہتے ہیں تو وہ آپ کو بے وقوف سمجھتی ہے اور جب آپ
 بولتے ہیں تو ان کا شک یقین میں بدل جاتا ہے۔“

”نشٹ اپ۔“ نیناں کے پتنگے لگ گئے۔ رابعہ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ ریحان اختر کمرے کی
 کھڑکی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئیں تو رمان نے محسوس کیا۔

”یہ آپ دونوں ٹھیک نہیں کر رہیں۔ ارے غلطی ہو گئی، اس کی سزا انہوں نے پالی پھر کیوں یہ سلوک؟“ وہ
 سنجیدگی سے بولا۔

”رمان! بابا کی وکالت نہ کرو۔“

”نیناں!“

”ایکسیکو زمی! مائی نیم از بنت رابعہ۔“ وہ خاصے تحکم سے بولی۔

”وہاٹ!“ وہ چونکا۔

”جی ہاں، نیناں کی نیم پلیٹ اتار دی ہے میں نے۔“ وہ شانِ قفاخر سے بولی۔ تبھی ریحان نے ہلکا سا
 ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا۔ رابعہ کو اتر کر اندر آنا پڑا۔ وہ بنا چاپ کے کمرے میں آئیں تو وہ خوش ہو گئے۔ رابعہ نے
 ان کا اشارہ سمجھ لیا تھا۔

”شکریہ!“ وہ بولے۔

”کس بات کا؟“

”میرا اتنا کہا تو مان لیا۔“

”مطلب کی بات کریں سچے باہر انتظار کر رہے ہیں۔“

”رابعہ! چلو آؤ کائنات بانٹ لیتے ہیں، تم میری اور باقی سب تمہارا۔“ وہ یلکھت بنا کسی ہچکچاہٹ کے ان
 کا ہاتھ تھام کر کہہ گئے۔ وہ دیکھتی رہ گئیں۔

”میرے ہم سفر کسی روز تو

میرے پاس آ، میرے زور و

کسی روز سن میری گفتگو

میری چاہتوں میں بسی ہوئی

میرے آنسوؤں سے بھری ہوئی

میری شب کے لمحے شمار کر

وہ لفظ ترے جو تابیاب ہوں

وہی لفظ میرے نام کر

مجھے لے کے تو کہیں دور چل

ذرا ہاتھ میرا تھام کر!

ریحان اختر کے مضبوط ہاتھ... میں ان کا ہاتھ تھا۔ وہ بنا ہونٹ ہلائے دل کی باتیں ان کے گوش گزار کر گئیں۔ باہر سے ہارن کی آواز پر ٹھکس۔

”مجھے اب کچھ نہیں چاہیے۔ آپ کی بیٹی کو کچھ نہیں چاہیے۔ اس نے آپ کو مات دے دی ہے۔ اپنا پیدائشی نام بھی لوٹا دیا ہے۔“ ہاتھ چھڑا کر وہ بہت دھیرے سے بولیں۔

”وہ بنت رابعہ ہو کر بھی میری زندگی ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ وہ سمجھوتے کی سب منزلیں طے کر چکے تھے۔ ”مگر اسے سمجھانے میں وقت لگے گا۔“

”میں رمان کے لیے بھی راضی ہوں، طلال تو ویسے بھی جانے کہاں گیا؟“

”کہانی مت سنائیں، پلیز۔“

”رابعہ چند روز سے لو، میری بیٹی کو سمجھاؤ، میں تم دونوں کو لینے آؤں گا پلیز۔“ اس قدر بے بسی اور منت تھی ان کی آنکھوں میں، لفظوں میں... کہ وہ بنا کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ مگر اس خاموشی میں کیا تھا کہ ان کے ہاتھ چھڑا کر جانے کے باوجود وہ اپنے ہاتھ کو دیکھتے رہے۔

☆☆☆

رابعہ نے گھر کے ملازمین کو اچھی طرح صفائی ستھرائی کی ہدایت کی اور گلو کو ضروری سامان کی لسٹ دے کر باورچی خانے میں آگئیں۔ عارفہ، رمان کے ہمراہ اپنے گھر چلی گئی تھیں بقول ان کے گھر ڈسٹرب اور گندا ہو رہا ہے، رمان کو بھی شہر سے باہر ٹور پر جانا تھا۔ وہ جاتے ہوئے انہیں سنجیدگی سے ریحان کے بارے میں سوچنے کا کہہ گئی تھیں۔

”بی بی جی! سبحان صاحب آئے ہیں۔“ بیگماں نے باورچی خانے میں آکر اطلاع دی تو وہ چونکیں اور جلدی سے ڈسٹر سے ہاتھ صاف کر کے باہر آئیں۔

”ارے، میں تو بھول گئی تھی کہ آج تمہاری مہندی ہے۔“ وہ خوشی سے بولیں۔

”مہندی وہندی تو چھوڑو... مگر مجھے یہی دیکھنا تھا کہ تمہیں کچھ یاد رہتا ہے یا نہیں؟“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”تھینک یو، تھینک یو ڈیر! میں سچ سچ بھول گئی تھی مگر شاید مسائل ہی ایسے تھے۔“ وہ ایک دم بولتے بولتے کافی سنجیدہ سی ہو گئیں۔

”خیریت؟“

”یو! کا انتقال ہو گیا، ہمیں وہاں جانا پڑا۔ نیناں، ریحان سے متفر ہو گئی ہے۔ میں نے تو واپس آنا تھا مگر نیناں نے ریحان کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا، وہ بہت ڈسٹرب ہے۔“ انہوں نے بتایا۔

”اوہ! بہت افسوس ہوا... اور ریحان؟“

”ریحان بھی بیمار ہی لگ رہے تھے۔“ انہوں نے سرسری سا انداز اپنایا۔

”اور یہ بیماری یقیناً ندامت اور شرمندگی کی ہے، اب تو وہ تنہا ہو گئے ہوں گے۔“ سبحان کو ریحان سے کچھ ہمدردی سی ہوئی۔

”ہاں شاید، ان کی رازداں کے جانے کے بعد، طلال کے جانے کے بعد وہ تنہا تو ہو گئے ہیں۔“

”راہی! وہ سب سے زیادہ تمہیں اور نیناں کو مس کر رہے ہوں گے۔ طلال تو بھانجا ہے، آجائے گا۔“

”نیناں کو سمجھانا مشکل ہے سبحان! اس نے تو اپنا نام بدل لیا ہے بنت رابعہ کہلوانے لگی ہے۔“

”تو تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”میرے لیے تو یہ نام ممکن ہے۔“

”دیکھو راہی! آج وقت تمہاری مٹھی میں ہے مگر کل نیناں اور تمہیں، ریحان کی ضرورت پڑے گی۔“

”کیا ضرورت پڑے گی؟“

”نام کی، سہارے کی۔“

”دیکھا جائے گا، یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ تم کیا لو گے چائے، کافی؟“ وہ بیکسر ٹال گئیں۔

”جناب کے ہاتھ کی کافی اور تیاری پکڑو، بڑے ابا نے کہا ہے لے کر آنا۔“

”ایسا کیسے ممکن ہے، رات کو رمان آئے گا تو نیناں کو سمجھائے گا پھر چکر لگائیں گے۔“ وہ یہ کہہ کر اٹھنے ہی والی تھیں کہ گلو سامان کے ساتھ کسی کے آنے کی اطلاع بھی لیے آ گیا۔

”کون ہے؟“

”چاہ نہیں، بس آپ سے ملنے کی بات کی ہے۔“ گلو نے کہا۔

”بلاؤ۔“ وہ دوبارہ صوفے پر ٹھیک سے بیٹھ گئیں۔ گلو گیا اور چند لمحوں بعد مہمان کے ہمراہ آ گیا۔

”ذوالفقار! وہ حیرت زدہ سی بولیں۔“

”جی میم صاحبہ! ناچیز کو ذوالفقار ہی کہتے ہیں۔“ وہ اپنے نام پر زور ڈال کر سامنے آیا تو سبحان کے ہونٹوں سے بھی حیرت بھرا جملہ نکلا۔

”ذوالفقار یہاں!“

”اوہ! تو آپ کا ان سے بھی تعلق ہے، تبھی مکان بیچنے اور نہ بیچنے کا ڈراما چلایا۔“ ذوالفقار نے بڑے بے ہودہ سے انداز میں کہا۔

”کیا بک رہے ہو؟“ رابعہ جھنجھلا گئیں۔

”میم صاحبہ! میں بک نہیں رہا۔ تو آپ کے کہنے پر انہوں نے مکان نہ بیچنے کا فیصلہ کیا ہے۔“ وہ طنز سے مسکرایا۔
”مسٹر! گھر میرا ہے میں نے بیچنا ہے یا نہیں یہ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“ سبحان نے سخت غصیلے انداز میں کہا۔

”اور میرا ایڈوائس؟“

”جب چاہو آ کر لے لیتا۔“

”اوہ، سمجھ میں آیا۔ لیکن ذوالفقار میں نے مجبوری ظاہر کر دی تھی۔“ رابعہ نے سمجھا کہ وہ پیسے ہی مانگنے آیا ہے۔

”چھوڑیں بیگم سبحان! میں نے آپ کے ذریعے راجا فیملی سے حساب چکانا تھا، آپ کے ساتھ مجھے ہمدردی

ہے، میں راجا خاندان کو بتانا چاہتا تھا کہ کسی کا گھر کیسے برباد کرتے ہیں؟ لیکن آپ تو خود برباد حال ہیں۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ وہ سخت متحیر تھیں، سبحان بھی پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے۔

”کچھ جانتا چاہتا ہوں، میرا مقصد ادھر رہ گیا۔ لیکن آپ سے معافی کے ساتھ کچھ جانتا چاہتا ہوں۔“ وہ

ایک دم نرم خوانسان بن گیا۔

”کیا؟“ سبحان نے پوچھا۔

”آپ کی نند و سیمہ کا بیٹا کون ہے؟“

”طلال اختر۔“

”تو پھر وہ کہاں ہے جسے و سیمہ کی اولاد سمجھ کر پالا گیا؟“

”کیا مطلب؟“

”ہاں، میرا بچہ زو، جسے میرے پھوپھو جی لے کر و سیمہ کے ساتھ بھاگے تھے۔“ وہ اشتعال میں آ گیا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو؟“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“

”مجھے کچھ نہیں معلوم، راجا سبحان اختر نے کبھی نہیں بتایا۔ اس گھر میں ایک ہی لڑکا ہے، تلال۔“ رابعہ

نے سچ بتایا۔

”اس کا مطلب آپ کو بھی کچھ معلوم نہیں۔“

”راجا سبحان اختر سے جا کر پوچھ لو، ویسے مجھے عجیب سی بات لگ رہی ہے۔ بوا بھی چل بسیں وہ شاید

کچھ جانتی ہوں۔“

”کیا! وہ ملازمہ...؟“

”ہاں، ان کا دور روز پہلے انتقال ہو گیا ہے، وہ شاید جانتی ہوں۔“ رابعہ نے کہا۔

”بہت بری خبر ہے۔“ وہ مایوس ہو گیا۔

”دیکھو، راجا سبحان اختر سے جا کر پوچھو، ہو سکتا ہے وہ جانتے ہوں۔“ سبحان نے مشورہ دیا۔

”ہاں، مگر... خیر۔“ وہ بڑبڑایا۔

”ذوالفقار! مجھے دکھ ہے کہ اپنے انتقام کے لیے تم نے مجھے ذریعہ بنانا چاہا۔“ رابعہ کے دل میں کلبلا تے ملاں نے لفظوں کی شکل اختیار کی تو وہ شرمندہ سانس جھکا کر بولا۔

”کاش! میں نے اپنی بھولی کو لمحہ لمحہ مرتے نہ دیکھا ہوتا، مجھے معاف کرنا۔“ وہ پلٹنے کو تھا کہ نیناں وہیں آگئی۔ اسے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ مگر اس کی حیرت وہ ہنس کر دور کر کے چلا گیا۔

”مما! یہ مدیحہ کا بھائی یہاں...؟“ نیناں نے اس کے جانے کے بعد ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”یہ، یہ مدیحہ کا بھائی ہے؟“

”ہاں، مدیحہ کا بڑا اور اکلوتا بھائی۔“

”اوہ گاڈ! کیا معما ہے۔“ رابعہ چکر اسی گئیں۔

”کچھ نہیں، بس اتفاق ہے اور اتفاقات زندگی کا حصہ ہیں۔“ سبحان بولے۔

”مگر یہ یہاں، مدیحہ تو ٹھیک ہے۔“

”ہاں، آپ چھوڑو یہاں اٹکل کے پاس بیٹھو میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔“ رابعہ ٹال گئیں۔

☆☆☆

صبح سے ہی وہ کمرے میں بند تھے۔ نہ کچھ کھایا، نہ پیا۔ آفس سے جتنے لوگ ملنے آئے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔ فون سب کے سب بند کر دیے تھے۔ بخار اور کھانسی کے باوجود کوئی دوا نہیں لی۔ فیضو نے کئی بار کمرے میں آ کر کچھ کھانے کے لیے لانے کو پوچھا مگر انہوں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ وہ ملول سا واپس لوٹ جاتا لیکن مغرب کی اذان سن کر وہ بڑی جرأت سے کمرے میں آیا، سب لائٹس آن کر دیں۔ وہ جاگ رہے تھے۔ گہرے اندھیرے کے بعد ایک دم روشنی ہونے کی وجہ سے آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

”کیا کرتے ہو فیضو؟“ وہ جھلا کر بولے۔

”کچھ نہیں، آپ کو احساس دلا رہا ہوں کہ کیا وقت ہو گیا ہے۔“ فیضو نے جسارت کی۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”صاحب! کچھ کھالیں۔ دوا بھی کھائیں اور سب دوائیں کھانی ہیں۔“ فیضو نے بلڈ پریشر کی، کارڈک والی دواؤں کی طرف اشارہ کیا۔

”فیضو! کسی دوا کی ضرورت نہیں۔“

”کیوں ضرورت نہیں؟ فیضو! جاؤ کھانا لے کر آؤ۔“ دروازے کے عین وسط میں کھڑے طلال نے کہا تو جیسے سبحان اختر کی آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی۔

”طلال! وہ تکیوں کے سہارے اٹھ بیٹھے۔“

”جاؤ فیضو، کھانا لالو۔ ہم دونوں کھائیں گے۔“ طلال بڑی نرمی سے کہہ کر ان کے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ فیضو خوش ہو کر چلا گیا۔

”کہاں چلے گئے تھے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”اپنا آپ تلاش کرنے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ بالکل نرم پڑ چکے تھے۔

”آپ کو نہیں ہو سکتی کیونکہ آپ راجا ریحان اختر ہیں۔“

”اس کے باوجود تنہا اور بے بس ہوں۔“ وہ دکھ سے مسکرائے۔

”انسان کیے کا پھل ضرور کھاتا ہے۔“

”ہاں، اس کا مجھے احساس ہو گیا ہے مگر یہ سلسلہ باپ سے شروع ہوا اور میں نے، وسمہ باجی نے سزا

پائی۔ ایسا لگتا ہے کہ بہت سی کریناک چٹخیں میرا پیچھا کر رہی ہیں۔“

”ان چیخوں میں میری مظلوم ماں کی چیخ بھی شامل ہوگی۔“

”میں تمہاری ماں کا گناہ گار نہیں، اللہ جانتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا تھا، میں نے تمہاری پرورش میں کوئی

کمی نہیں چھوڑی۔“

”اسی لیے اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنے کو آپ تیار نہیں تھے۔“ اس نے دھیرے سے شکایتی انداز

اختیار کیا۔

”ہاں... کیونکہ میں نے تمہارے باپ کو اپنے بہنوئی کو کبھی معاف نہیں کیا۔ اس کی حیثیت اور کردار سے

مجھے نفرت رہی۔ اپنی بہن کی اولاد ہونے کے باعث محبت کی۔“ انہوں نے اعتراف کیا۔

”خیر آپ کا بہت شکریہ۔ آپ اچھا سلوک نہ کرتے تو میں کیا کر سکتا تھا۔“

”میرے دل میں تم اسی طرح ہو، تمہاری حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔“

”مگر میرے اندر جو طوفان آیا ہے کاش بتا سکتا۔ بوازندہ رہتیں تو ان کو سینہ چیر کر دکھاتا۔“

”غم نہ کرو، تمہاری ماں زندہ ہے۔ مجھے پتا نہیں معلوم مگر پتا چل جائے گا۔ میں انہیں عزت و احترام کے

ساتھ نہیں رکھوں گا۔“ وہ جلدی سے بولے۔

”شکریہ ماموں! لیکن میں اپنی ماں کے پاس رہوں گا۔“

”فی الحال تو رہو، ہم انہیں ڈھونڈیں گے۔“ ریحان چاہتے تھے کہ وہ انہیں چھوڑ کر کہیں نہ جائے۔

”مائی اور نیناں۔“

”وہ مجھے چھوڑ گئی ہیں، میرے گناہوں کا حساب زیادہ تھا۔“

”لیکن...“ وہ فیضو کو کھانا لالو دیکھ کر ایک دم چپ ہو گیا۔

”طلال صاحب! آپ کا کمر اکھول دیا ہے۔“ فیضو نے کہا تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

وہ رابی خالہ کو ان کے کمرے میں سلام کر کے ان کی نیناں سے متعلق شکایت سن کر سیدھا اس کے کمرے میں

آیا۔ وہ ساری دنیا سے بے خبر لان میں کھلنے والی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ بیڈ پر ڈھیر سارے کپڑے پڑے تھے۔

”نیناں!“

”ایکسیو زمی!“ اس کے نام لینے پر وہ پلٹ کر غرائی۔

”ارے، ایسے کیوں غرا رہی ہو؟“

”رمان پلیر! میرا موڈ خراب ہے۔“ اس نے احساس دلایا۔

”کیوں خراب ہے؟“

”تمہیں سب خبر ہے۔“

”مجھے فی الحال یہ خبر ہے کہ ہمیں سجان انگل کی طرف جانا ہے۔“

”مجھے کہیں نہیں جانا، میں ماما کو کہہ چکی ہوں۔“

”یار! تمہیں ماما کا خیال بھی نہیں رہا، وہ کس قدر ڈپریشن میں ہیں۔ ذرا سامان کا دل بہل جائے گا۔ ایک تم ہی ڈسٹرب نہیں ہو، ریمان انگل نے صرف تمہارے ساتھ ہی ایسا نہیں کیا ہے۔ تمہاری ماما بھی ان کے ستم جھیلتی رہی ہیں، ان کا ہی سوچو۔“ رمان نے خاصی سنجیدگی سے اسے کہا۔

”تو تم ماما کو لے جاؤ بس۔۔۔ میرا دل نہیں چاہ رہا۔“

”دل تمہارے پاس کب آیا، میں نے اسے اپنے دل کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔“ وہ شوخی سے مسکرایا۔

”بس کسی شوخی کی ضرورت نہیں۔“ وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔

”سچ ہے نا، تمہارا دل تمہارے پاس نہیں ہے۔“ وہ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”رمان پلیر!“

”نینا! اٹھو تیار ہو جاؤ دیر ہو رہی ہے اور ہاں، یہ سب لباس تمہارے ہیں۔۔۔ کون سا پہنو گی؟“ وہ بڑے شوق سے خوب صورت فینسی کپڑوں کو الٹتے پلٹتے ہوئے بولا۔

”چھوڑو انہیں۔“ اس نے جھپٹ کر پٹے۔

”یار! کیا مسئلہ ہے تمہارا؟“

”مجھے نہیں جانا۔“

”اور تمہیں جانا ہے۔“

”کس نے کہا؟“

”رمان احمق نے۔“

”اونہہ!“

”اونہہ کیا، یہ حقیقت ہے اٹھ جاؤ ورنہ میں نے اٹھا کر لے جانا ہے۔“ وہ مقابل کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”رمان! تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟“ وہ چلائی۔

”نہیں سمجھ سکتا کیونکہ تمہیں نہ ماما کا احساس ہے نہ اپنے بابا کا۔“ وہ بھی چلایا۔

”بابا کا نام نہ لو، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ اپنی دنیا میں خوش رہیں۔“

”ان کی دنیا صرف اب تم اور رابی خالہ ہو، سمجھنے کی کوشش کرو۔“ اس نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

”رمان! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ اس نے خاصی حیرت سے پوچھا۔

”بس میں چاہتا ہوں کہ تم انگل ریمان کو معاف کرو۔ ان کو معاف کرنا ضروری ہے۔“ اس نے بہت

”ہاں۔“

پیارے کہا۔

”یہ آسان نہیں ہے۔“ وہ جھٹکے سے الگ ہو گئی۔

”بہت آسان ہے، تم تیار ہو جاؤ میں تمہیں اور رابی خالہ کو چھوڑ کر سجان انگل کے پاس جاؤں گا اور انہیں

تمہارے پاس لے کر آؤں گا۔“

”بھول رہے ہو، تمہیں بابا نے کچھ کہہ رکھا ہے۔“

”وہ سب دیکھا جائے گا، محبت میں قربانی دی جاسکتی ہے مگر اس وقت خود غرض نہیں بن سکتا۔“ وہ بولا۔

”تو تم بھی بابا کے ساتھی ہو۔“

”نہیں، میں صرف اخلاقی ذمے داری نبھا رہا ہوں۔ نام کو اور نام نہیں کرتے۔“ اس نے بہت رمان

سے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

کافی سمجھانے بچھانے۔۔۔۔۔ منت سماجت اور۔۔۔۔۔ آنکھوں کے پیار بھرے اشاروں کے بعد وہ تیار ہو

کر کمرے سے باہر آئی تو رمان کی نگاہیں آسمان سے اتری پری کے نیلگوں سر اپا پر جم گئیں۔ نیلے جھلمل کرتے

لیے فرائ اور چوڑی دار پا جاسے میں، کھلے بالوں کے ساتھ بلاشبہ وہ پری ہی لگ رہی تھی۔ رمان کا دل دھڑک

اٹھا۔ جی چاہا اسے لے کے نہیں دور چلا جائے۔

”ہش! اب چلو ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“ وہ لجا سی گئی۔

”خاموش کچھ نہ کہو، کچھ نہ بولو۔ دیکھنے دو۔“ وہ شوخ نگاہوں سے دیکھتا ہوا قریب آ گیا تو وہ اچھل کر

پرے ہو گئی۔

”چلو، ورنہ میں نہیں جاؤں گی۔“

”پلیر نینا! جی بھر کے دیکھنے دو مت بولو۔“

”رمان، نینا۔“ عین اسی وقت رابعہ تیار ہو کر انہیں آوازیں دیتی وہیں آ گئیں۔

”اونہہ۔“ اس کا موڈ یگڑ سا گیا۔ نینا کے چہرے پر مسکان کھیل گئی۔

”اب خیال کرو رابی خالہ کا، چلو شاباش۔“

”رمان! چلو، بھئی دیر ہو گئی ہے۔“

”جی، جی چلیے۔“ وہ نینا کو گھورتے ہوئے ہکلا یا۔

”بی بی جی! آپ کا فون ہے۔“ وہ نکل ہی رہے تھے کہ گلو نے نینا کو مخاطب کیا۔ وہ ہٹکی اور اس طرف

چلی گئی جہاں فون رکھا تھا۔

”ہیلو!“

”ہیلو!“

”مدد!“ وہ حیرت زدہ سی بولی۔

”ہاں۔“

”خیریت میری یاد کیسے آگئی؟“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”پلیز، مجھے بتاؤ طلال...؟“

”اب تک طلال کو بھولیں نہیں۔“ اس نے مشتعل ہو کر اس کا ادھورا جملہ اچک لیا۔

”نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا، وہ دراصل...“ مدیحہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

”دیکھو، میرا طلال سے اور طلال کے ماموں سے کوئی واسطہ نہیں۔“ وہ کچھ نا سمجھ کر بولی۔

”نینا، پلیز۔“

”پلیز! میرا نام بنت رابعہ ہے۔“

”دیکھو، مجھے معلوم کرنا ہے کہ طلال کون ہے؟“

”واہ! یہ پوچھنا ابھی باقی ہے۔ طلال نے گھاس ڈالنی چھوڑ دی ہے کیا؟“

”شٹ آپ!“ مدیحہ کو آگ لگ گئی۔

”جسٹ شٹ آپ۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔“ مدیحہ کے لہجے میں دوبارہ نرمی آگئی۔

”مجھے کچھ نہیں سمجھنا، اوکے۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ پلٹی تو ماما کو موجود پایا۔

”مدیحہ کیوں بھلا؟“ رابعہ بڑبڑائیں۔

”اس کا محبوب ہے اور پوچھ مجھ سے رہی ہے۔“ نیناں نے برا سامنہ بنایا۔

”مدیحہ اور اس کا بھائی ایک ہی بات کر رہے ہیں کچھ تو بات ہوگی۔“ رابعہ عجب سے منہ میں پھنس گئیں۔

”کیا بات؟“ اس نے پوچھا۔

”ہمیں نہیں معلوم... لیکن کوئی نہ کوئی بات اور ہے۔“

”کوئی بات نہیں ہو سکتی یقیناً ظلال بھائی نے کوئی ایسا دھوکا دیا ہے کہ اب یہ انہیں تلاش کر رہے ہیں۔“

”ارے نہیں بات اور ہے، ایسا کرو کہ مدیحہ سے بات کرو اسے کہو کہ وہ ریحان کے پاس جا کر پوچھیں۔“

رابعہ نے سوچ کر کہا۔

”کم آن ماما! چلیں ویر ہو رہی ہے۔“ نیناں یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ وہ مجبور سی ہو گئیں... لیکن نیناں کا

موبائل فون بجنے لگا۔ نمبر دیکھ کر وہ برا سامنہ بنا کر رابعہ کو دیکھنے لگی۔

”فون اٹینڈ کر دو۔“ رابعہ سمجھ گئیں کہ مدیحہ کا ہی فون ہے۔

”یہ لیں، آپ بات کر لیں۔“ اس نے فون انہیں تھما دیا اور خود وہاں سے چلی گئی۔

”مدیحہ! بیٹا آپ لوگ راجا ریحان اختر سے مل لیں شاید آپ کے مسئلے کا حل نکل آئے۔“ انہوں نے پہلے

یہ کہہ دیا۔

”مگر آئی...“

”ریحان آج کل گھر پر ہی ہوتے ہیں، بہتر یہی ہے کہ ان سے مل لیں... ہمیں تو کچھ خبر نہیں ویسے بھی ہم

یہاں ہیں۔“ وہ مزید بولیں۔

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2012ء

”اوکے، شکریہ آئی۔“ مدیحہ نے پُر تشکر انداز میں کہا اور فون بند کر دیا۔ رابعہ دلی طور پر مطمئن ہو گئیں

ورنہ انہیں ملال رہتا۔

☆☆☆

جب سے پرانی یادیں تازہ ہوئی تھیں آپا نے بہت زیادہ اثر قبول کیا تھا بستر سے لگ گئی تھیں۔ اکبری بیگم اور

مدیحہ... رات دن ان کی دل جوئی میں مصروف تھیں مگر وہ کم صم چھت گھورتی رہتیں۔ ذوالفقار بھی، بہت الجھا الجھا سا

تھا۔ اس وقت بھی ملازمت سے آیا تو سیدھا آپا کے پاس آ گیا۔ اکبری بیگم تو فوراً اس کے لیے کھانا لینے چلی گئیں۔

”آپا! انھیں۔“

”بھائی! آپا کو کل ریحان انکل کے پاس لے جائیں۔“ مدیحہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”یہ کس نے کہا تم سے؟“ زلفی نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

”وہ، وہ نیناں کی ممانے۔“ وہ جلدی سے ہکلاتے ہوئے بولی۔

”وہ تمہیں کہاں مل گئیں؟“ زلفی کے لہجے میں کڑی تفتیش شامل ہو گئی۔ مدیحہ کے چہرے پر پسینا آ گیا،

اسی لمحے اکبری بیگم نے آ کر بات سنبھالی۔

”میں نے اسے فون پر بات کرنے کو کہا تھا۔“

”اماں! کیا ضرورت تھی؟“

”بھئی آپا کی وجہ سے ہم بہت پریشان ہیں۔“ وہ کھانے کی ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولیں۔

”وہ عورت تو خود اپنے گھر میں ہے، بے چاری مظلوم سی ہے۔ آپا کو صبر کر لینا چاہیے۔“ ہاٹ پاٹ سے

روٹی نکالتے ہوئے کچھ بے بسی سے کہا۔

”مرے ہوئے کا صبر آتا ہے، میرا بیٹا زندہ ہے۔“ آپا نے برا مناتے ہوئے جواب دیا۔ زلفی شرمندہ ہو گیا۔

”زلفی! تم کل آپا کو راجا صاحب کے پاس لے جاؤ شاید کچھ بتا چل جائے۔“ اکبری بیگم نے مشورہ دیا۔

”ٹھیک ہے، مگر اس گھر سے سوائے دکھ کے کچھ مل نہیں سکتا۔“

”مایوسی گناہ ہے، صبر کا پھل بھی تو ملتا ہے۔“ اماں نے سمجھایا۔

”ٹھیک ہے کل گیارہ بجے تک چھٹی لے کر آؤں گا“ آپ تیار رہے گا۔“

”جیتے رہو۔“ آپا نے بے ساختہ کہا۔

”زلفی! کل دعا کے گھر والوں نے بھی آنا ہے۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ گھر یہ محلہ، علاقہ ہے کسی کے آنے کا۔ فی الحال انہیں منع کر دیں جب ذرا

حالات بہتر ہوں گے تو بلا لیں گے۔“ وہ جھنجھلاہٹ کے ساتھ بولا۔

”بیٹا! وہ لڑکی والے ہیں، اچھے کھاتے پیتے گھرانے کے ہیں۔ ایسے رشتے مشکل سے ملتے ہیں، لڑکی

اتنی پیاری ہے کہ...“

”بس... بس... یہ آپ کہہ سکتی ہیں۔ انہوں نے ہماری حیثیت ابھی تک دیکھی نہیں ہے۔ آئیں گے تو

انکار ہی کریں گے بہتر ہے آپ انکار کر دیں۔“

”انکار! کیا بکواس کر رہے ہو؟“ اماں اور آچھا انھیں۔

”جی! انکار، جب حالات سنو ریں گے تو لڑکی بھی مل جائے گی۔“ وہ کھانا کھا کر ہاتھ دھونے کے لیے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

”اماں! بھائی بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں، ابھی انہیں کچھ دن بعد کا کہہ دیں۔“ مدیحہ نے زلفی کی تائید کی۔
”مگر کیا کہوں؟ وہ لوگ اتنے دن سے انتظار کر رہے ہیں، کوئی مذاق ہے کیا...؟“ اکبری بیگم بولیں۔
”انہیں نہ کہیں، ظہورہ بی بی کو سمجھا دیں وہ خود کسی طریقے سے کہہ دیں گی۔“
”کتنی بری بات ہے یہ۔“

”مجبوری ہے، ہمارا گھر بار دیکھ کر بھی تو وہ انکار کر سکتے ہیں۔“ آچھا بولیں۔

”لیکن آیا! یہ گھربار، حالات سدھارنا کوئی آسان کام نہیں۔ اللہ دین کا چراغ ہے کیا جو رگڑیں گے اور حالات سدھر جائیں گے۔“ اکبری بیگم نے کہا۔

”اور پھر کیا کریں؟“

”آپ ظہورہ بی بی کو کل صبح ہی جا کر سمجھا دیں۔“ مدیحہ نے دوبارہ سمجھانے کی کوشش کی۔ اکبری بیگم خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

رمان کچھ دیر سحان انکل کے گھر رکنے کے بعد نیناں اور رابعہ کو وہیں چھوڑ کر ریحان اختر سے ملنے چلا آیا۔
چوکیدار نے سلام کر کے خوش دلی سے گیٹ کھولا اس نے گاڑی کھڑی کی اور اندر آ گیا۔ اندر ہر طرف خاموشی تھی۔ فیضو کافی ریحان صاحب کے کمرے میں دے کر باہر آیا تو اس نے پوچھا۔

”ریحان انکل کہاں ہیں؟“

”اپنے کمرے میں، آپ وہیں چلے جائیں۔“ فیضو نے اس کے آنے پر غیر معمولی خوشی کا اظہار کیا۔ وہ مسکرا کر ریحان انکل کے کمرے کی طرف گیا۔ ہلکی سی دستک دے کر دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اس کو دیکھ کر ریحان اختر حیرت زدہ سے رہ گئے ان کی حیرت دیکھ کر طلال نے گردن گھمائی تو وہ بھی متحیر سا اٹھ کھڑا ہوا۔
رمان کو لگا کہ وہ غلط وقت پر آ گیا ہے، طلال کے ساتھ کافی پینے میں ریحان انکل مشغول تھے۔ اسے یہ بھی لگا کہ رابعہ خالہ اور نیناں کے بعد بھی وہ مطمئن ہیں۔

”آؤ، آؤ رمان! بہت خوشی ہو رہی ہے۔“ اس کی ہچکچاہٹ اور تحیر کو ریحان اختر کے تپاک نے ختم کر دیا۔
”رمان...! آؤ پیار۔“ اس نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ طلال نے تیزی سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”شکریہ۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ اور یہاں۔“ ریحان اختر نے کہا تو وہ ہولے سے مسکرا کر بولا۔

”مجھے بھی یقین نہیں آ رہا کہ آپ نیناں اور رابی خالہ کے بغیر بھی خوش ہیں۔“

”خوشی کے معنی سے ناواقف ہو گیا ہوں، وہ دونوں جس طرح خوش رہیں۔“ ریحان اختر پر جیسے حزن و

ملال کی کیفیت طاری ہو گئی۔

”اس طرح تو وہ آپ سے دور ہو جائیں گی۔“ رمان نے احساس دلایا۔

”اب آپ آگئے ہو تو ایسا نہیں ہوگا۔“ ریحان اختر نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ رمان کو خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوا۔

”رمان یار! مامی کو سمجھاؤ، نیناں کو سمجھاؤ۔“ طلال نے کافی محبت کے ساتھ کہا تو رمان کو اور زیادہ حیرت ہوئی۔
”میں سب سے شرمندہ ہوں۔ مجھے تو یہاں سے جانا ہے لیکن یہاں جنہیں ہونا چاہیے وہ آئیں، رمان! نیناں جو چاہے فیصلہ کرے۔“ طلال نے دانستہ اسے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ نیناں سے دستبردار ہو چکا ہے۔
”میں پوری کوشش کروں گا لیکن ریحان انکل کو پہل کرنی ہوگی۔“ رمان نے کہا۔

”کیا مطلب...؟“ ریحان اختر نے پوچھا۔

”انکل! آپ کی طرف سے شکایت ہوئی، خرابی ہوئی۔ آپ کو ہی سب ٹھیک کرنے کے لیے قدم اٹھانا ہو گا۔ آج سحان انکل کی مہندی ہے۔ وہاں رابی خالہ اور نیناں ہیں، آپ میرے ساتھ چلیں... منالیں روٹھے رشتوں کو۔ سحان انکل بھی آپ کی مدد کریں گے۔“

”سحان! نہیں، میں سحان کا سامنا کیسے کر سکتا ہوں۔ میں نے اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔“ وہ ایک دم انکاری ہو گئے۔

”یہ خوشی کا موقع ہے، آپ جائیں گے تو سب گلے شکوے دور ہو جائیں گے۔ سحان انکل بہت فراخ دل ہیں آپ کو محسوس بھی نہیں ہونے دیں گے۔“

”ماموں! رمان ٹھیک کہہ رہا ہے، میں بھی چلتا ہوں۔ مامی اور نیناں سے معافی مانگتی ہے پھر جانے موقع ملے نہ ملے۔“ طلال افسردہ سا ہو گیا۔

”بی باز بیویا! رمان نے ذرا اہمیت بندھائی۔

”اور اگر رابعہ نے، نیناں نے مجھے معاف نہ کیا تو...؟“ ریحان اختر پریشانی سے بولے۔

”رابعہ خالہ مان جائیں گی۔ نیناں کو آپ نے نیناں نہیں بنت رابعہ پکارنا ہے بس۔“ رمان نے سمجھایا۔

”چلیں انھیں، جلدی سے پہنچ کریں۔“ طلال نے اصرار کیا۔

”میری طبیعت بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ ہچکچائے۔

”طبیعت خرابی کے اسباب دور ہو گئے تو سمجھیں کہ بیماری گئی۔“ رمان نے ہنس کر کہا۔

”رمان بیٹا! آپ بہت گریٹ ہو۔ میں نے آپ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔“ ریحان اختر، طلال کے کمرے سے جانے کے بعد تیاری کے لیے اٹھتے ہوئے بولے۔

”وہ ایک موسم ہوتا ہے شاید جس میں نفرت کے کانٹے پیدا ہوتے ہیں۔ آپ کا کوئی قصور نہیں، جو ورثہ ملتا ہے اس کے اثرات سب پر برابر پڑتے ہیں۔“ رمان نے بڑے سلیقے سے جواب دیا اور اٹھنے میں ان کی مدد کی۔

”میں بہت برا انسان ہوں۔“ وہ پھر افسردہ ہو کر بولے۔

”نہیں، اب آپ بہت اچھے انسان ہیں۔“ رمان نے مسکرا کر ان کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ بھی مسکرا دیے۔

”رابعہ! میں اس خیال سے آیا ہوں کہ تم محبت سے نفرت کی گرد جھاڑ کر مجھے معاف کر دو گی۔“ ریحان اختر نے انہیں مخاطب کیا۔

”میں ایسا کر بھی لوں تو آپ کی بیٹی کو کون سمجھائے گا؟“ رابعہ بولیں۔

”میں اس سے معافی مانگ لوں گا، اسے منالوں گا۔“ انہیں کچھ امید نظر آئی تو جذباتی ہو گئے۔

”بہت مشکل ہے۔“

”ناممکن نہیں۔“

”اچھا، میں بات کروں گی۔“

”بس ایک بار میری بیٹی مجھے لوٹا دو، بہت رابعہ مجھے لوٹا دو۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولے تو انہیں تعجب ہوا۔

”اور نیناں؟“

”وہ تو چلی گئی۔“ انہوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

”نہیں، مظلوم کی آپہں ساتھ رہتی ہیں۔“

”میں شرمندہ ہوں، اللہ مجھے معاف کر دے۔“ وہ بہت رنجیدہ ہو گئے۔

”نیناں تو معاف کرنے نہیں آ سکتی، وہ تو چلی گئی۔“ رابعہ نے کہا تو وہ لا جواب سے رہ گئے۔

☆☆☆

رات بہت دیر سے واپسی ہوئی۔ رمان ان دونوں کو اپنی طرف لے آیا۔ نیناں کا موڈ ریحان صاحب اور

طلال کی موجودگی کی وجہ سے آف تھا۔ رابعہ، ریحان کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ نیناں کی طرف دیکھتیں تو

الجھن کا شکار ہو جاتیں۔ گھر پہنچتے ہی رمان اپنے کمرے کی طرف چلا گیا اس کا تھکن سے برا حال تھا۔ رابعہ،

عارف بیگم کے کمرے میں آ گئیں۔ نیناں نے بھی صوفے پر لیٹ کر آنکھیں موندنی چاہیں۔

”ارے نیناں! بیٹا میرے پاس آؤ، خالہ صدقے۔“ عارفہ بیگم نے پیار سے پکارا تو وہ بگڑے موڈ کے

ساتھ ان کے برابر لیٹ گئی۔

”بڑی دیر لگائی آپ لوگوں نے؟“

”بس دیر ہو گئی۔“ رابعہ نے مختصر جواب دیا۔

”کیا بات ہے تم صدم ہو اور یہ نیناں کو کیا ہوا؟“ عارفہ بیگم نے پُر تشویش انداز میں رابعہ سے پوچھا۔

”کچھ نہیں، دراصل وہاں ریحان اور طلال آ گئے تھے۔“

”اچھا! عارفہ بیگم نے خوشی بھری حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”بس اس لیے نیناں کا موڈ آف ہو گیا۔“ رابعہ نے دھیرے سے بتایا۔

”کیوں بھی، سمجھانا تھا۔“ عارفہ بیگم بولیں۔

”اچھا چھوڑیں، یہ بتائیں آپ نے کیوں جانے سے انکار کیا؟“

”ظاہرہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، دعا کیلی پریشان ہو جاتی۔“ عارفہ بیگم نے کہا۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟“

☆☆☆

مہندی کی برائے نام سی رسم کے بعد مہمان کھانا کھا رہے تھے۔ رابعہ ریحان کے کمرے میں آ گئیں۔

بڑے ابا، نیناں کو لے کر سعدیہ کے گھر شادی کا جوڑا اور مٹھائی دینے گئے تھے۔

”رابی! ویسے تم نے اچھا نہیں کیا۔ آزاد پرندے کے پر کٹوا دیے۔“ ریحان گرم گرم کافی کے بگ لیے

کمرے میں آ گئے۔

”نہیں، بہت اچھا ہوا ہے۔ بڑے ابا کو دیکھو کس قدر خوش ہیں اور پھر تمہارے پاس آپشن ہی کیا تھا؟“

اپنا ہاتھ بڑھا کر بگ لیتے ہوئے وہ بولیں۔

”ہاں، آپشن تو تم نے ریحان اختر کے انتخاب کے باعث ختم کر دیا تھا۔“

”ہم پہلے بھی اچھے دوست ہی تھے، دیکھو کتنا پائیدار تعلق ہے، ورنہ ریحان کہاں ہیں؟“ انہوں نے حد

درجہ افسردگی کے ساتھ کہا۔

”محبت ختم نہیں ہوتی، ریحان سے تمہیں آج بھی شدید محبت ہے۔“ ریحان نے کہا۔

”یتا نہیں۔“

”غصہ تھوک دو، معاف کر دو اسی محبت کے ساتھ۔“ ریحان نے انتہائی نرمی سے کہا تو وہ چپ چاپ انہیں

دیکھتی رہیں۔

”رابی خالہ! رابی خالہ!“ اسی اثنا میں رمان آوازیں دیتا ہوا وہیں آ گیا۔ اس کے ساتھ ریحان اور طلال

دونوں تھے۔ رابعہ ششدر سی کھڑی ہو گئیں۔ ریحان نے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگایا۔ عزت سے بٹھایا۔ وہ تب

بھی پچھلی پچھلی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”آپ کی آمد سے بہت خوشی ہو رہی ہے۔“ ریحان نے خاموشی توڑی۔

”ارے رابی خالہ! ادھر آ کر بیٹھیں۔“ رمان نے ہانک لگائی تو وہ ریحان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”ریحان ہم آپ سے بہت شرمندہ ہیں۔ ہمت نہیں ہو رہی تھی آنے کی۔“ ریحان بولے۔

”ارے، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، یقین کیجیے اس وقت مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ آپ نے آکر بہت

پیار دیا ہے۔“ ریحان نے کہا۔

”بہت شکریہ!“ ریحان نے کہا۔

”مامی! میں صرف آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔“ طلال نے اٹھ کر فرش پر بیٹھتے ہوئے ان کے گھٹنوں

پر سر رکھ دیا۔

”طلال! ایسا کچھ نہیں ہے، میں ناراض نہیں ہوں۔“ رابعہ نے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

”ناراض تو خالہ، ریحان انکل سے بھی نہیں ہیں۔“ رمان نے دانستہ ٹکڑا لگایا۔

”رمان!“ رابعہ نے گھورا۔

”ریحان انکل! طلال آئیں ہم باہر ذرا انتظامات دیکھتے ہیں۔“ رمان نے اور زیادہ ہوشیاری کا مظاہرہ

کیا۔ ان دونوں نے اس کا مطلب سمجھ لیا تھا ساتھ چلے گئے۔

196 ماہنامہ پاکیزہ مارچ 2012ء

”بہتر ہے، دراصل کل لڑکے کے گھر جانا ہے طاہرہ کو ٹینشن ہے۔“
 ”اس میں ٹینشن والی کیا بات ہے؟“ رابعہ بھی لائٹ آف کر کے لیٹتے ہوئے بولیں۔
 ”بس بیٹی کی ماں ہے اس لیے ڈری رہتی ہے۔“
 ”شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں؟“
 ”بہت اچھا ہو گیا، ریحان میں تبدیلی آگئی۔“

”خدا کے لیے بند کر دیں یہ ذکر۔“ ایک دم غیناں غصے سے چلائی۔ عارفہ دنگ رہ گئیں۔
 ”نیناں! بہت غلط بات ہے، باپ ہے تمہارا، سمجھنے کی کوشش کرو۔“ عارفہ بیگم نے سرزنش کی۔
 ”مجھے نہیں چاہیے ایسا باپ۔“ وہ منہ اور کانوں پر تکیہ رکھ کے بولی۔ رابعہ نے بہن کو اشارہ کیا تو وہ چپ ہو گئیں۔
 صبح تک رابعہ جاگتی رہیں، اس الجھن کو سلجھانے کا سرا تلاش کرتی رہیں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
 کر دیں بدلتے بدلتے تھک گئیں مگر کچھ بھی حل نہیں ملا۔ صورت حال اب یوں تھی کہ ایک طرف بیٹی تھی اور
 دوسری طرف شوہر، ایسا شوہر جس نے طویل عرصے بے وفائی کی اور جس سے انہوں نے محبت کی... اب بھی
 دل ان کے لیے نرم پڑ گیا تھا۔ پہلے والی محبت نہیں رہی پھر بھی ایک رشتے کا لمس اور اس کی مہک برقرار تھی۔
 زیادہ مسئلہ تو نیناں کا تھا جو سخت متفرد ہو چکی تھی۔ اسے سمجھنا مشکل تھا۔
 ”یا خدا! مجھے معاف کر دے، میری رہنمائی فرما۔ میرے لیے آسانی پیدا فرما۔ میری بیٹی کا دل نرم کر
 دے۔ اس کے دل سے میل صاف کر دے۔“ فجر کی نماز کے بعد انہوں نے رورو کر اللہ سے دعا کی۔ بے شک
 مشکلوں میں وہی مددگار ہوتا ہے۔

☆☆☆

رمان آفس جا چکا تھا۔ رابعہ نے ناشتا کرتے وقت اسے ہدایت کر دی تھی کہ آج سبحان کی برات ہے
 ہمیں پہلے سے جانا ہے۔ عارفہ بیگم جلدی جلدی دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئیں کہ طاہرہ
 پریشان، غم آلود آنکھوں کے ساتھ وہاں آ گئیں۔ دعا بھی افسردہ سی ان کے ساتھ تھی۔

”طاہرہ، کیا بات ہے؟“ عارفہ بیگم پریشان ہو گئیں۔

”وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔“ طاہرہ ہاتھ روئے لگیں۔

”ہوا کیا، ارے دعا تم ہی بتاؤ۔“ عارفہ بیگم نے دعا سے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ وہ یہ کہہ کر نیناں کے پاس چلی گئی۔

”ظہورہ بی بی کا فون آیا ہے، لڑکے والوں نے آج آنے سے منع کر دیا ہے۔“ طاہرہ بولیں۔

”کیوں، وجہ کیا بتائی؟“ رابعہ نے کہا۔

”بس انہیں کہیں جانا ہے، ان کی آپا کی طبیعت خراب ہے پھر بتائیں گے۔“ طاہرہ نے پلو سے آنکھ

صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

”تو اس میں ایسی کون سی بات ہے؟ کوئی مجبوری ہو سکتی ہے اور دعا ہماری پھول سی بیچی ہے، اس کے لیے کوئی
 رشتوں کی کمی ہے کیا؟“ عارفہ بیگم جھنجھلا گئیں، انہیں طاہرہ کی چھوٹی سی بات پر پریشان ہونے کی عادت سے چڑھی۔

”لڑکا اچھا ہے، گھر مار دیکھ لیتے تو تاریخ طے ہو جاتی۔“ طاہرہ دبک سی گئیں۔

”دیکھ لیں گے، سب ہو جائے گا۔ اس میں پریشانی کیا ہے، چلو یہ لو سبزی بناؤ۔“ عارفہ بیگم نے انہیں
 مصروف کرنے کے لیے سبزی کی ٹوکری آگے کر دی۔

”آئی ٹھیک کہہ رہی ہیں، آپ بلا وجہ ہلکان ہوئیں۔ کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔“ رابعہ نے تسلی آمیز انداز
 میں کہا تو وہ مسکرا دیں اور بہل سی گئیں۔

”رابعہ! تم کپڑے وغیرہ...“ عارفہ بیگم نے فریق سے گوشت نکالتے ہوئے کہا۔

”پہلے رمان کے ساتھ گھر جائیں گے پھر وہاں سے تیار ہو کر چلیں گے۔“ رابعہ نے بتایا۔ عین اسی لمحے
 گاڑی کے ہارن پر وہ جھنکیں۔

”ریحان کی گاڑی؟“ ان کا خیال درست تھا۔ ملازمہ نے گیٹ کھولا تو ریحان گاڑی اندر لے آئے۔
 اچانک غیر متوقع آمد پر رابعہ اور عارفہ بیگم دونوں ہی حیران ہو گئیں۔

”آداب!“ انہوں نے بڑی بشاشت کے ساتھ جھک کر کہا۔

”جیتے رہو، آؤ اندر آ جاؤ۔“ عارفہ بیگم پھولی نہیں سار ہی تھیں۔ اپنے کمرے میں لے آئیں... مگر وہاں
 نیناں اور دعا موجود تھیں۔ نیناں کی پیشانی پر ہزار سلوٹیں نمودار ہوئیں۔ اٹھ کر جانے لگی تو انہوں نے اس کا
 ہاتھ پکڑ لیا۔ دعا باہر چلی گئی۔ رابعہ، عارفہ بیگم موجود رہیں۔

”اپنے بابا کو اس طرح چھوڑ کر جاسکتی ہو؟“ انہوں نے نیناں سے پوچھا۔

”جی ہاں، ویسے آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“ وہ نئی سے بولی۔

”آپ لوگوں کو گھر لے جانے کے لیے۔“

”تو آپ ماما کو لے جائیں، میرا خیال بھی دل سے نکال دیں۔“

”رابعہ! چائیں گی تو بنت رابعہ بھی جائے گی۔“ وہ پیار سے بولے۔

”ماما! میں نہیں نہیں جاؤں گی۔“

”رابعہ! تم جاؤ ریحان میاں کے ساتھ، میں اسے سمجھاؤں گی۔“ عارفہ بیگم نے مداخلت کی۔

”میں ریحان کے ساتھ نیناں کی وجہ سے رہی اب اس نے اگر وہاں نہیں جانا تو...“ رابعہ نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے آپ دونوں خوش رہیں۔“ وہ مایوسی سے بولے۔

”ارے، یہ کیا بات ہوئی؟“ عارفہ بیگم بولیں۔

”بس عارفہ آپا میری ایک ہی خواہش ہے کہ میری بیٹی، رمان کے ساتھ ہمیشہ خوش رہے۔ آپ اسے اپنی
 بیٹی بنالیں۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولے۔

”کیوں نہیں سو لیم اللہ مگر...“ عارفہ بیگم پریشان سی کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

”بیٹا! اللہ آپ کو رمان کے ساتھ خوشگوار اور خوش حال زندگی عطا فرمائے، آمین! اور تم اس برے باپ کو
 بھول جاؤ۔“ ریحان نے بڑھ کر نیناں کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو چھلکے۔ وہ ایک
 ٹک دیکھتی رہی۔ جونہی وہ واپسی کے لیے پلٹے تو عارفہ بیگم رو دیں۔ نیناں پر بھی عجب سی کیفیت طاری ہو گئی۔

وہ دروازے سے باہر نکلے تو وہ تڑپ کر روتے ہوئے ان کے پیچھے بھاگی۔

”بابا! بابا!“ وہ رے کے اور پلٹے تو وہ ان سے لپٹ گئی۔

”جی بابا کی جان۔“ وہ اسے دیوانہ وار چومنے لگے۔

”آپ مجھے اتنی بڑی خوشی دے کر کیسے جاسکتے ہیں۔“ اس نے روتے روتے گلے کیا۔

”نیناں ٹھیک کہہ رہی ہے ریحان میاں! بیٹیاں باپ کے گھر سے رخصت ہوتی ہیں، میری امانت لے جاؤ، ہم برات لے کر آئیں گے پھر رخصت کرنا۔“ عارفہ بیگم نے آگے بڑھ کر نیناں کو گلے لگالیا اور ان سے کہا۔

”آپ کا کیا خیال ہے۔“ ریحان نے جھکتے ہوئے رابعہ سے پوچھا۔

”آپ بیٹھیں، میں سامان سمیٹ لوں۔“ رابعہ کے اس جواب میں ہی سب کچھ تھا۔ ریحان اختر نے تشکر بھری نگاہوں سے چھت کی طرف دیکھا جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ اللہ کا شکر ادا کر رہے ہیں۔

☆☆☆

فیضو کی آنکھوں میں ان کے ہنسی خوشی گھرانے پر خوشی کے آنسو آ گئے۔ وہ جھوم جھوم کر دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ طلال آنسو لے کر آیا تھا۔ نیناں نے بوا کا کمر اکھولا کچھ دیر کھڑی وہاں سوچتی رہی پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ سب کچھ ترتیب میں تھا۔ رابعہ نے اپنے بیڈروم کا جائزہ لیا، وہ خاصا بے ترتیب تھا۔ ملازمہ کو ہدایت دے کر وہ ٹی وی لاؤنج میں آ گئیں۔ ریحان اختر پھل، سبزی، گوشت کی خریداری کر کے آئے تھے۔ آرام سے آنکھیں موند کر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ہی تھے کہ چوکیدار نے انٹرکام پر مہمانوں کی آمد کی اطلاع دی۔

”کون ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی کوئی ذوالفقار صاحب ہیں اور ایک خاتون ہیں زینت۔“

”بیج دور۔“ انہوں نے اجازت دے دی۔

کچھ ہی دیر میں وہ دونوں اندر آ گئے۔ ریحان اختر نے خاتون کو فوراً پہچان لیا۔

”آپ!“

”جی میں پہلے بھی آئی تھی۔“ زینت آپا نے نقاہت بھرے انداز میں کہا۔

”بیٹھیں، جی۔۔۔“

”آپ سے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ آپ کی بہن نے جس شخص سے شادی کی تھی، وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے کر بیٹا ساتھ لے آیا تھا، وہ کہاں ہے، کون ہے؟“ ذوالفقار نے بہت نرمی سے کہا۔ رابعہ بھی وہیں آ گئیں۔

”اس کی ماں آپ ہیں۔“ ریحان نے براہ راست بیماری، کمزوری زینت آپا سے پوچھا۔

”جی، میں وہ بد نصیب ہوں۔“

”کس نے کہا؟ آپ تو بہت خوش بخت ہیں۔“ ریحان مسکرائے۔ رابعہ سمیت ان دونوں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”حیرت ہے، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ رابعہ بولیں۔

”رابعہ! مجھے خود علم نہیں تھا کہ طلال، وسیمہ باجی کا حقیقی بیٹا نہیں، یہ راز بوانے مرنے سے پہلے بتایا۔ مگر

ان کا اتنا پتا نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ طلال ڈسٹرب ہو کر گھر سے چلا گیا۔“

”کہاں، کہاں چلا گیا؟“ زینت آپا صدمے سے چلائیں۔

”حوصلہ رکھیں، اپنے بارے میں جان کر رنجیدہ ہو گیا۔ اب واپس آ چکا ہے، اسے آپ کی تلاش تھی۔ وہ

اپنی ماں سے ملنے کو بے تاب ہے۔۔۔ میں اسے بلاتا ہوں۔“ ریحان تیزی سے اٹھ کر کمرے میں گئے اسے فون کرنے کے لیے ان کی عدم موجودگی میں ذوالفقار نے رابعہ کو مخاطب کیا۔

”بیگم صاحبہ! یہ کہانی تھی، میں نے جذباتی انداز میں آپ کے ذریعے اس گھر سے بدلہ لینا چاہا۔ مجھے

معاف کر دیجیے۔ میں قطر تار نہیں ہوں۔“

”مجھے اندازہ ہے لیکن ذوالفقار اللہ صبر کا پھل دیتا ہے دیکھو ہمارا طلال ان کا بیٹا ہے۔ ہمارے سگے

بھانجے سے بڑھ کر ہے۔“

”فیضو! فیضو! کھانا لگاؤ بھئی۔“ ریحان اختر واپس آتے ہوئے فیضو سے بولے۔

”بس کچھ ہی دیر میں آرہا ہے۔“ انہوں نے بتایا۔

”آپ کا شکریہ۔“ زینت آپا کی آواز خوشی سے کپکپائی۔

”شکریہ کیسا؟ ہم تو معافی کے خواستگار ہیں، اللہ ہماری بہن کو معاف کرے، یہ بہت بڑا ظلم اس نے آپ

کے ساتھ کیا۔“ ریحان اختر شرمساری سے بولے۔

”میں نے وسیمہ کو معاف کیا۔“ زینت آپا نے کہا۔

”بے حد شکریہ۔“

”صاحب کھانا لگا دیا ہے۔“ فیضو نے آکر اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے، طلال آجائے پھر کھاتے ہیں۔“ رابعہ نے کہا۔

☆☆☆

ماں، بیٹے کے ملاپ پر سب کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ طلال ماں کے سینے سے لگا آنسو بہا رہا تھا۔

”اب ہم طلال کو لے جائیں۔“ زینت آپا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”دل پر پتھر رکھ کے کہنا پڑ رہا ہے کہ چند روز کے لیے لے جائیں پھر آپ سب کو ہمارے ساتھ رہنا ہے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ ذوالفقار نے پوچھا۔

”ذوالفقار! یہ میرے ماموں، مائی ہیں، ان کا حکم سر آنکھوں پر ہم ان کے ساتھ رہیں گے۔“ طلال نے

ریحان اختر کے بازوؤں میں ساتے ہوئے کہا۔

”دیکھیں ذوالفقار بھائی امدید کو بھالی بن کر بھی ہمارے پاس ہی آتا ہے، کیوں طلال بھائی؟“ نیناں نے موقع غنیمت جان کر شرارت کی۔ طلال ہل سا ہو گیا۔

”انشاء اللہ امیری مدید کے لیے ہمیشہ یہی دعا رہی۔“ زینت آپا نے تائید کی۔
”ٹھیک ہے آپا! طلال اور مدید اس گھر میں رہیں مگر میں اپنی ماں کے ساتھ اپنے گھر میں رہوں گا۔“
ذوالفقار نے کہا۔

”ارے آپا کی جان... یہاں صرف طلال اور مدید رہیں گے ہم تینوں ساتھ رہیں گے۔“ آپا نے افسردہ سے ذوالفقار کو گلے لگا لیا، وہ خوش ہو گیا۔

”اب چلیں ایسا نہ ہو میرے سسرال والے رشتہ دینے سے انکار کر دیں۔“ ذوالفقار نے شوخی سے کہا۔
”خدا نہ کرے، دعا تو بنی ہی تمہارے لیے ہے۔“ زینت آپا نے ہنس کر کہا۔
”دعا.. کون دعا؟“ نیناں نے کرپدا۔

”ہماری ہونے والی بہو...“ زینت آپا نے بتایا اور پھر سب حوالہ جات دے دیے۔ نیناں اور رابعہ چلا آئیں۔
”ارے، یہ کیسا اتفاق ہے، دعا کے لیے طاہرہ باجی کس قدر پریشان تھیں، یہ تو اب اپنے گھر کی بات ہے۔“ رابعہ نے زینت آپا سے کہا اور دعا سے اپنی رشتے داری کے بارے میں بتایا۔
پھر وہ لوگ ہستے مسکراتے چلے گئے۔ ریحان اختر کے ذہن سے بوجھ ہٹ گیا۔ رابعہ کی وال کلاک پر نظر پڑی تو وہ بولیں۔ رمان انہیں لینے آچکا تھا۔

”جلدی کریں ریحان، نیناں، ہم نے سحان کے گھر پہنچنا ہے۔“

”مما! میں نے بال ٹرم کرانے ہیں۔“

”مگر اب دیر ہو جائے گی۔“

”آپ مجھے پارلر چھوڑ کر جائیں، رمان سے کہیے گا مجھے لے لے گا۔“

”رمان تمہارے بابا کا ملازم نہیں ہے۔“ وہ اکڑ کر بولا۔

”بتاؤں بابا کو۔“

”بتا دو۔“

”بابا! بابا!“ وہ چلائی تو اس نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا اور کان میں بولا۔

”میں جناب کا چاہنے والا ہوں، بابا کو بیچ میں کیوں لاتی ہو؟“

”پھر مانتے کیوں نہیں ہو؟“

”مان تو گیا ہوں، ورنہ تمہارے جیسی بلی سے کون شادی کرے گا؟“ وہ سینہ تان کر بولا تو وہ مارنے کو

بڑھی۔ وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

”یہ بلی تمہارا حال کر دے گی۔“ اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ مسلسل چیختی رہی... اور وہ قہقہے لگا کر محظوظ

ہوتا رہا۔